پاکستان کی 50 سے زائد معتبر ادبی شخصیات
کے حوالے سے تنقیدی شذرات کا مخزن

نقدِ فن

شبیر ناقد

نقدِ فن، رنگِ ادب پبلی کیشنز کی فخریہ پیش کش

پاکستان کی 50 سے زائد معتبر ادبی شخصیات کے حوالے سے تنقیدی شذرات کا مخزن

نقدِ فن

(تنقیدی مضامین)

شبیر ناقِد

رنگ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت

شاعر علی شاعرؔ

0336-2085325

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ

کتاب	:	نقدِ فن (تنقیدی مضامین)
مصنف	:	شبیر ناقدؔ (0333-5066967)
اشاعت	:	جون/2014ء
کمپوزنگ	:	ظفر اکیڈمی، کراچی
ناشر	:	رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی
ای میل	:	rangeadab@Yahoo.com
تعداد	:	1000
صفحات	:	288
قیمت	:	=/500روپے

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے

رنگ ادب پبلی کیشنز

5۔کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

انتساب:

شعر و ادب کے اُن متوالوں کی نذر

جنہوں نے احساسِ سود و زیاں سے بالاتر

ہو کر ادب کی خدمت کو روح کی ریاضت جانا

maablib.org

- جسارت خیالی ترقی پسند افکار کا علمبردار 83
- جاوید احسن کا فنِ نعت گوئی 91
- جلیل حیدر کا افسانہ "منت کشِ بے رخی" ایک عمیق حسیاتی تاثر 95
- حمیدہ سحر کی افسانہ نگاری حقیقی زندگی کے تناظر میں 99
- خادم عظیم آبادی کا قرینۂ حمد و نعت 102
- دُردانہ نوشین خان کی برجستہ افسانہ نگاری 109
- ذوالفقار گاڈھی کی خارجیت آمیز شاعری 113
- رفیع الدین راز اور ناقدانہ رویے 116
- ریاض ندیم نیازی... شاعرِ بحرِ تجلیات 119
- رضی عظیم آبادی کا عارفانہ سخن 126
- راشد ترین ..... رومانی جذبات کا شاعر 131
- رضوان بابر کی شعری رنگ سامانیاں 134
- زاہد علی سید کا خیال آفرین بیان 137
- سہیل غازی پوری..... وسیع الموضوعات شاعر 141
- سعید المظفر صدیقی کی خوش فکر شاعری 148
- سعید سوہیہ..... مضمون نگاری کے تناظر میں 153
- شاعر علی شاعر..... اقلیمِ غزل کی آبرو 158
- شاکر کنڈان کی شعری ریاضت 165
- ڈاکٹر سید شبیہ الحسن..... عصری تنقید کا معتبر حوالہ 168
- شہزاد منیر..... جدتِ فکر کا شاعر 171
- شہناز پروین کا اساسی افسانوی مزاج 184
- شاداب صدیقی..... شاعرِ غم والم 188

سلیقہ

○ میزانِ فکر — ابوالبیان ظہور احمد فاتح — 7

○ تنقیدی جوئے شیر — شبیر ناقد — 10

مضامین:

⊙ آفتاب مضطر کی نازک خیالی — 13

⊙ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا نظریۂ خرد — 16

⊙ امان اللہ کاظم ایک بالیدہ فکر شاعر — 21

⊙ ڈاکٹر اختر ہاشمی رجائی امکانات کا شاعر — 28

⊙ ابوالحسن واحد رضوی کا نقدِ فن — 32

⊙ امین اُڈیرائی..... غمِ ذات کا شاعر — 36

⊙ پروفیسر اقبال ندیم حقیقی زندگی کا ترجمان افسانہ نگار — 40

⊙ ارشد محمود ارشد کا شعری عمق — 45

⊙ انوار احمد علوی کی تبسم ریز تحریریں — 47

⊙ ارم زہرا..... میرے شہر کی کہانی، ارم زہرا کی زبانی — 50

⊙ ارشد عباس ذکی ... شاعرِ زیست و الفت — 55

⊙ اظہر راجھا..... ایک معاشرتی کہانی کار — 61

⊙ باقی احمد پوری کا طرفہ اندازِ سخن — 64

⊙ بقا بلوچ نیرنگیٔ افکار کا شاعر — 71

⊙ جاوید رسول جوہر ایک زمانہ شناس شاعر — 77

⊙ شفیق الرحمٰن الہ آبادی کا فنِ تنقید		195
⊙ شاعر صدیقی کے حزنیہ شعری امکانات		200
⊙ شاہد خاکوانی... مزاحمتی رویوں کا شاعر		204
⊙ شاہین زیدی کے ناول "جدا منزلیں جدا راہیں" کا انتقادی جائزہ		207
⊙ شاہد رضوان کی افسانوی فضا اور عصری رویے		210
⊙ صابر ظفر اور صوفیانہ ادراکات		215
⊙ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون دوہا نگاری کا سنگِ میل		219
⊙ ڈاکٹر طاہرہ سرور..... ایک معتبر عصری تحقیقی حوالہ		229
⊙ ظریف احسن کی روایت پسندانہ شاعری		231
⊙ ڈاکٹر غنی عاصم کا برجستہ اسلوبِ بیاں		235
⊙ فضا اعظمی کی نظم اور فکری وسعت		241
⊙ فہیم شناس کاظمی کی دلکش منظومات		245
⊙ کاوش عمر کی ولولہ آگیں شاعری		250
⊙ گل زیب عباسی کا افسانہ اور عمومی رویے		255
⊙ ڈاکٹر مظہر حامد کے سخن کی رومانی فضا		258
⊙ ڈاکٹر محبوب عالم کا نقدِ فنِ نعت نگاری کے تناظر میں		262
⊙ نسیم سحر کے فکر مندانہ افکار		264
⊙ نوید سروش کا حسرت آمیز کلام		268
⊙ ڈاکٹر وقار مسعود کی مزاح نگاری		274
⊙ یعقوب خاور کی نادرہ کاریاں		276
○ شبیر ناقد کے سوانحی و فنی کوائف پر طائرانہ نظر	شاعر علی شاعر	281

☆☆☆☆☆

میزانِ فکر

ابوالبیان ظہور احمد فاتح

مالکِ حقیقی کی لاتعداد مخلوقات میں سے بنی نوع انسان کو ایک نمایاں درجہ حاصل ہے، دیگر کئی وجوہ کے علاوہ اس کی ایک وجہ انسان کا باشعور ہونا ہے، کیوں کہ اسے بے پناہ دماغی قوت حاصل ہے۔ جس کا ذہن حیرت انگیز طور پر کام کرتا ہے۔ مزید براں یہ آدم زاد قوتِ ناطقہ سے بھی بہرہ مند ہے۔ قدرت نے اسے جو طاقتِ گفتار بخشی ہے، وہ کسی کرشمے سے کم نہیں۔ علاوہ ازیں حضرتِ انسان علم و ہنر کی دولتِ غیر مترقبہ سے بھی نوازا گیا ہے۔ یہ تمام اوصافِ حمیدہ اس پیکرِ خاکی کو وہ شان و شوکت عطا کرتے ہیں جس کی بدولت کوئی اور مخلوق اس کے پائے کو نہیں پہنچتی۔

جہاں تک جوہرِ دانش و فن کا تعلق ہے، اس میں شعر و ادب کو ایک مقام ممتاز حاصل ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ بے شمار شعراء و ادباء منصۂ شہود پر آئے، جنھوں نے گراں قدر نگارشات بنی نوعِ انسان کے لئے چھوڑیں۔ بعض تخلیقات نے تو انھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔ شاعر و ادیب جو کچھ لکھتا ہے، اس کے پسِ پردہ کیا کیا محرکات ہوتے ہیں، اُس کے عصری پس منظر اور سوانحی واقعات سے کیا ثابت ہوتا ہے، اُس نے زبان و بیان کے تقاضے کس حد تک نبھائے، یہ سب امور محلِ نظر رکھتے ہوئے ایک ماہرِ تنقید جسے عرفِ عام میں نقاد بھی کہا جاتا ہے، اُس اہلِ فن کا بے لاگ محاکمہ کرتا ہے۔ وہ اس کے حسن و قبح کا جائزہ لیتا ہے۔ فنی باریکیوں کی احاطہ بندی کرتا ہے اور جامع استنباطات کی روشنی میں ایک نظامِ محاکات کے ذریعے دودھ کا دودھ اور

پانی کا پانی کر کے دکھاتا ہے۔ وہ ایک بھرپور تحقیقی سفر سے گزرتا ہے، جس کے نتائج اس کے بعد میں آنے والے اصحابِ تحقیق کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وجدان کی روشنی میں زیرِ نظر نگارشات کا غیر جانب دارانہ تجزیہ پیش کرتا ہے جو تشنگانِ علم و دانش کے لئے ساغرِ آبِ حیات سے کم نہیں ہوتا۔

زیرِ نظر کتاب، ''نقدِ فن''، نقادِ عصر شبیر ناقد کی ایک وقیع کاوش ہے جو اُن کے شب و روزِ حیات کی تحقیق و تدقیق کا حاصل ہے۔ ان کی فنی مہارت اور ناقدانہ صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خدا معلوم کن کن شخصیات اور ان کی کن کن تالیفات و تصنیفات کا مطالعہ کر کے حاصلِ مطالعہ پوری امانت و دیانت کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ اُن کا بُنر کثیر الجہات ہے۔ کیوں کہ وہ بنیادی طور پر خود شاعر و ادیب بھی ہیں۔ لہٰذا فنی لطائف کو حسن و خوبی سمجھتے ہیں۔ وہ ایک روکھے پھیکے نقاد نہیں بلکہ ان کی تنقید بھی فی نفسہٖ ایک نگارش کا درجہ رکھتی ہے جس میں دل چسپی کے بہت سے سامان مضمر ہیں۔ وہ ظالمانہ آپریشن کے قائل نہیں ہیں بلکہ محرمانہ طرزِ فکر رکھنے والے انسان ہیں۔ وہ تخلیقات کا سرسری جائزہ نہیں لیتے بلکہ ان میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔ وہ شاعر و ادیب سے اجنبیت کا انداز نہیں برتتے بلکہ اُس کے راز دار بن کر بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ حالات و واقعات سے طائرانہ نہیں گزر جاتے بلکہ ایک فاضل محقق کی طرح ایک ایک جزو کو نہایت باریک بینی سے پرکھتے اور جانچتے ہیں۔ ان کا جائزہ مبنی بر حقائق اور مخزنِ سوادات ہوتا ہے۔ ان کا قلم قاتل کا خنجر نہیں بلکہ چارہ گر کا نشتر ہے۔ وہ بہت عمدہ محاکات قائم کرتے ہیں اور ان کے محاکمات ایک مضبوط بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ قدرت نے انھیں تیز قوتِ مشاہدہ اور بھرپور حسیات سے نوازا ہے۔ تنقید کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد بڑے متوازن انداز میں قدیم و جدید سے تعلق نبھایا ہے۔ وہ جہاں معقول انداز میں روایات کا ساتھ نبھاتے ہیں..... وہاں مناسب رنگ میں انحرافات کے بھی قائل ہیں، جنھیں جدت تو کہا جا سکتا ہے مگر کسی طرح بدعت نہیں گردانا جا سکتا۔

شبیر ناقد کی ''نقدِ فن''، ایک ایسا ادبی اثاثہ ہے جسے گنجِ شائگان قرار دیا جا سکتا ہے۔ کتابِ ھذا میں محققانہ شذرے بھی ہیں۔ بھرپور مکمل تجزیے بھی ہیں۔ دل کش تنقید بھی ہے۔

تالیفِ قلب کے متعدد پہلو بھی ہیں۔ یہ جوان جن کی بیشتر زندگی عسکری خدمات میں بسر ہوئی ہے، حیران کن طور پر ادبی خدمات کے لئے بھی وقت پس انداز کرتے رہے ہیں۔ دن بھر کی خدمات کے تھکے ہارے لوگ جب نیند کی آغوش میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں تو ان اوقات میں بھی شبیر ناقدؔ قلم کی شمعیں روشن کرنے کے لیے نگارِ ادب کی آرائش گیسو میں مصروف و منہمک نظر آتے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے یہ ثابت کر کے دکھادیا ہے کہ ایک انسان بیک وقت صاحب سیف بھی ہوسکتا ہے اور اہلِ قلم بھی۔

ہماری دعا ہے کہ رب العزت شبیر ناقدؔ کو مزید علمی و ادبی نیز تنقیدی و تحقیقی کارناموں کی توفیق عطا فرمائے آمین

☆☆☆☆☆

تنقیدی جوئے شیر

عصرِ حاضر میں جہاں اچھا شعر تخلیق ہو رہا ہے وہاں بے جان' بے روح اور سپاٹ قسم کی شاعری کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں بلکہ مؤخر الذکر شعرا و شاعرات کا تناسب اوّل الذکر سے کچھ زیادہ ہی ہے نوبت بہ ایں جا رسید کہ دو سو صفحات کا شعری مجموعہ ملاحظہ کریں تو اس میں سے پانچ اشعار ایسے ہوں گے جو شرفِ انتخاب پائیں گے ان پانچ اشعار میں بھی تین اشعار محض رواداری کا نتیجہ ہوں گے بقیہ دو شعری بھی مسندِ انتخاب پر براجمان ہوتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کریں گے عصری تنقیدی روش میں مردوں کو اس لئے فروغ میسر ہے کہ انہیں بھرپور انداز میں سراہا جاتا ہے کیونکہ حقیقی تنقید جسے یاران جہاں منفی تنقید سے موسوم کرتے ہیں کی تاب لانے کا کسی میں یارا نہیں ہے عصری تنقید ایک بانجھ شجر کی مثیل بن گئی ہے جس پر کوئی ثمر نہیں لگتا بلکہ صرف ایک جملے کے گرد طواف کر رہی ہے کہ مَن ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر ناقدانِ شعر کلاسیکی تخلیقی و تنقیدی اور تحقیقی ورثے سے محروم ہیں لسانِ اردو کی تین بڑی اشتراکی زبانوں ہندی' فارسی اور عربی سے ان کا دامن تہی ہے لسانی اور فنی ادراکات سے عاری ہیں موزونیت کے علم جسے علم العروض کا نام دیا جاتا ہے سے نا آشنا ہیں علمِ بدیع جسے علمِ بیان سے بھی معنون کیا جاتا ہے سے نابلد ہیں جنہوں نے زندگی میں کوئی شعر موزوں نہیں کیا وہ تخلیقِ شعر کے نقد و نظر کے حوالے سے فیصلے صادر فرما رہے ہیں یہ معاملات حضرات و خواتین دونوں کے ہاں پائے جاتے ہیں لیکن خواتین جن میں فطری فکری و فنی بالیدگی کی نسبت قدرے کم ہے ان کے ہاں یہ معاملہ زیادہ گھمبیر نوعیت کا ہے شاعرات کے کلام کی تحقیق و تنقید کے دوران ہمیں اکثر یہ محسوس ہوا کہ فکری و فنی بلوغت ان سے

گریزاں ہے اور اس سلسلے میں خاطر خواہ رسائی حاصل کرنے کی سعی مشکور نہیں کی گئی کیونکہ اس امر کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی ان کے مجموعوں کے نام عمومی اور سطحی فکر کے حامل ہوتے ہیں جن میں کسی نوع کا رفعت امیز تاثر معدوم ہوتا ہے اور کلام میں معائب سخن کا وفور نظر آتا ہے متروکات کے استعمال کو عار نہیں سمجھا جاتا تنافر حرفی چاہے وہ جلی نوعیت کا ہو یا خفی حیثیت کا شعر کی زینت بنادیا جاتا ہے ضائع بدائع' رموز و قائع' تشبیہات و ترکیبات خال خال اور محاورات و استعارات عید کے چاند کی طرح نظر آتے ہیں جن آمور گاران سخن سے وہ مشاورتِ شعر کرتی ہیں وہ غزل میں تو جیسے تیسے کر کے عروضی ارکان پورے کر دیتے ہیں لیکن آزاد نظم میں عروضی ارکان کی تعددی مغائرت پائی جاتی ہے کسی سطر میں دو رکن ہوتے ہیں تو کسی میں پانچ ارکان ہوتے ہیں تو کسی میں ڈیڑھ رکن ہوتا ہے فنی چابکدستی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اس لئے ان کی آزاد نظم یا تو نیم آزاد ہو جاتی ہے یعنی کہیں کہیں لاشعوری یا شعوری طور پر عروضی تلازمات کا اہتمام ہوتا ہے جب کہ کہیں عروضی ارکان یکسر مفقود ہو جاتے ہیں یوں وہ نیم آزاد یا نظم منثور بن جاتی ہے شاعرات و شعرا کے شعری مجموعوں میں یہ بھی اکثر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ادبی حوالے سے مشہور و معروف شخصیات سے مقدمہ جات' تنقیدی شذرات یا تاثرات لکھوائے جاتے ہیں جو بے بنیاد تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں حالانکہ جس کتاب شعر کے حوالے سے وہ رقمطراز ہوتے ہیں اسی میں بہت سے اشعار ساقط الوزن اور خارج از بحر ہوتے ہیں ان کے کھوکھلے تعریف و توصیف کے پل جہاں ممدوحان کے خلاف تاثر پیدا کرتے ہیں وہاں متعلقہ ناقدانِ فن کی فنی بساط کا بھی مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں شعری معیار کے حوالے سے کلاسیکی مفروضہ یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کی ہر غزل سے دو یا تین عمدہ اشعار برآمد ہوں تو وہ اچھا شاعر ہے جبکہ آج کل معاملہ بالکل برعکس ہے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی شاعر یا شاعرہ کے شعری مجموعہ سے دو یا تیں اچھے اشعار نکل آئیں تو وہ لائق تحسین ہے شاعرات کے ساتھ یہ سلوک ناروا بھی ہوتا ہے کہ احباب غیر حقیقی داد و تحسین کے ڈونگرے محض اس لئے برساتے ہیں کہ موصوفہ ناراض نہ ہو جائیں کیونکہ تعلقات کے خراب ہونے کا احتمال ہوتا ہے س لئے انہیں ان کے عیوب سخن باور نہیں کرائے جاتے جس کے باعث

وہ بے معنی احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتی ہیں اکثر احباب شعر جن میں حضرات و خواتین شامل ہیں میں لایعنی ادبی برتری کا زعم پروان چڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ ان کا یہ رویہ میرو غالب کے تعلیاتی افکار کی حدود قیود کو بھی پھلانگنے لگتا ہے نہ فن پر دسترس ہوتی ہے نہ فکری بالیدگی اس کے باوجود اپنے حوالے سے حقیقی رائے قائم کرنے سے قاصر ہوتے ہیں حالانکہ داخلی طور پر ہر سخنور کو اپنے فکری و فنی ادراکات کا شعور ہوتا ہے لیکن خارجی طور پر اس امر کا اعتراف نہیں کیا جاتا حالانکہ اس امر کی اشد ضرورت ہے یوں غیر جانبداری کی فضا میں شاعری کو پنپنے کا موقع میسر نہیں آتا جملہ اہلِ ادب اور اربابِ نقد و نظر سے مؤدبانہ التماس ہے کہ خدارا کچھ ادب پر بھی ترس کھائیں اور اپنے حالِ زار پر بھی رحم کریں یوں شعری اور تنقیدی فضا کو مکدر کرنے کی سعیِ نامشکور سے گریز کریں ہمارے تنقیدی معروضات خالصتاً فنِ شعر اور نقدِ فنِ شعر کے ضابطوں کی پاسداری کے ضمن میں تھے امید ہے کہ قارئین بھی انھیں ایک فنی بحث پر محمول کریں گے اور اربابِ نقد و شعر بھی انھیں اپنی دل آزاری کا سامان خیال نہیں کریں گے۔

شبیر ناقد

(تونسہ شریف)

فون نمبر:۔ 0333-5066967

26/اپریل 2014ء دوپہر دو بجے

☆☆☆☆☆

آفتاب مضطر کی نازک خیالی

اگر عصرِ حاضر کے شعری سرمائے کو فکری وفنی اعتبار سے دیکھا جائے تو شعروسخن کا عمیق ادراک رکھنے والے ایک دلدوز کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک جیسے خیالات کی جگالی کی جارہی ہے اور چربہ سازی کا عمل جاری ہے یکسانیت نے مہیب صورت اختیار کرلی ہے جس میں تازہ کاری' نادرہ کاری اور نازک خیالی مفقود ہے یوں لگتا ہے جیسے شعرا اور شاعرات کے ہاں کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا اور تخیلات کی صوتیں خشک ہوگئی ہیں مشتے از خروارے کے مصداق معدودے چند سخن وروں کے ہاں جدت وندرت' شعری لطافتیں اور نزاکتیں پائی جاتی ہیں انہیں اربابِ شعر میں ایک نام آفتاب مضطر کا بھی ہے ان کا شعری مجموعہ' قبول ورد کے فیصلے ''مطبوعہ فروری 2009ء ہمارے زیرِ نظر ہے جس کے ربع اوّل کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ کرتے ہیں واضح رہے قبل ازیں'' سورج کے اس پار'' سے موسوم شعری مجموعہ 1997ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا جس میں ہائیکو مع جاپانی تراجم''ازشیکی یوکی اتاکا'' شامل ہیں۔

ان کے ہاں نادرالنظیر تراکیب وفور کے ساتھ پائی جاتی ہیں شعری اظہار کی جملہ نزاکتوں کو ملحوظِ خاطر رکھے ہوئے ہیں زبان وبیان کی مقتضیات کا بھرپور اہتمام ملتا ہے افکار کی قرینہ کاری ان کی فنی کرشمہ کاری کی برہانِ قاطع ہے اس سلسلے میں ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے۔

یہ ہم جو دیپ جلاتے ہیں روز پلکوں پر
یہ انتظار مجسم کے استعارے ہیں

خدائے سخن میر تقی میر کی زبان دانی اور ادبی قدر ومنزلت کا اعتراف ہر عہد کے ارباب

سخن نے کیا ہے اور اس امر کو اپنے لیے باعثِ اعزاز و افتخار سمجھا ہے شاعرِ موصوف کی زبانی عظمتِ میر کے اظہار کا انداز دیکھیے ۔

کٹھن تھا کھولنا اردو کی زلف کا ہر پیچ
کھلا ضرور مگر میر کے سخن سے کھلا

ان کے تخیلات میں فکری اعتبار سے ایسی نزاکتیں پائی جاتی ہیں کہ قاری حیرت و استعجاب میں مستغرق ہو جاتا ہے ترکیبات کا حسن اسلوب کی دلکشی بڑھا رہا ہے ۔

شورشِ پیہم کی سنت
ہم نے قفس میں جاری کی

وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اس لیے ان کا سخن مقصدیت امیز اور بہت سے افادی پہلو خود میں سموئے ہوئے ہے رفعتِ تخیل کی پیوند کاری ان کے کلام کو تاثیر کی بے پناہ دولت سے ہم کنار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ان کا ایک تنہا شعر زیبِ قرطاس ہے ۔

زندگی کے بھی کچھ تقاضے ہیں
سانس لینا ہی زندگی تو نہیں

رومانوی حوالے سے ان کے ہاں لطیف احساسات اور خوشگوار جذبات پائے جاتے ہیں ان کے کلام میں ایک عمیق رومانویت رچی بسی ہے ۔

بھلانے کی انہیں اس سے زیادہ کیا کریں کوشش
انہیں جب بھولنا چاہیں تو خود کو بھول جاتے ہیں

عند البیان جابجا مشاہیرِ ادب کو انہوں نے بھرپور نوعیت کا خراجِ تحسین پیش کرنے کی جسارت کی ہے جس میں وہ انتہائی عمدگی سے کامیاب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں رومانوی حوالے سے کہیں کہیں محبوب کی جفا شعاری کو بھی انہوں نے موضوعِ سخن بنایا ہے شعری تمثیلات کی عمدگی بھی ان کے کلام کے حسن کو دو چند کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔

خوبوں سے خوب ہم نے کسبِ سخن کیا ہے
تب جا کے گفتگو میں حسن و کمال آیا

تشہیر کی ہے کیا کیا تقصیر پر ہماری
اور نیکیاں وہ ساری دریا میں ڈال آیا
دانے پہ ٹوٹ گرنا پانی پہ جاں چھڑکنا
اپنے لئے پرندہ خود لے کے جال آیا

سخن سنجی اُن کے لیے کار دشوار نہیں ہے لیکن اُن کے نزدیک اتنا سہل بھی نہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے اس متضاد اور متنوع موضوع کو انہوں نے اپنے ایک شعر میں یوں خوبصورتی سے باندھا ہے۔

شعر کہنا' شاعری کرنا' نہیں مشکل مگر
جس قدر سمجھا گیا ہے اس قدر آساں نہیں

اُن کے فکری کینوس میں بے پناہ وسعت پائی جاتی ہے اور اپنے موضوع کی وسعتوں کو دفعتاً سمیٹنے کے ہنر سے واقف ہیں شعر کے مختصر پیمانے میں فکر کا بحرِ بیکراں سمو دیتے ہیں۔

گاہ دل میں گم ہے آفاقیت
اور کبھی دل میں آفاق ہیں گم

رجائی حوالے سے ان کے سخن میں بسیط امکانات پائے جاتے ہیں ان کے ہاں حزن و ملال کی بجائے آس' امید اور امنگ کی فضا پائی جاتی ہے عصری آشوب کے شواہد ناپید ہیں بلکہ ایک اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے۔

اگرچہ روز ہی بے آس لوٹ آتا ہوں
بہ ایں ہمہ تری چوکھٹ پہ روز جاتا ہوں

مشمولہ استخراجات شاہد ہیں کہ فکری یکسانیت کے عہد سخن میں آفتاب مضطر کے ہاں متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں ان کی شاعری کثیر الجہات ہے فکری نزاکتیں جس کا امتیازی وصف ہے انہوں نے مفرد و مرکب ہر نوع کی بحور میں بڑی عمدگی سے سخن سنجی کی ہے خدائے بزرگ و برتر اُن کے فکر و فن کو دولتِ دوام سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

''ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا نظریۂ خرد

شاعری ایک بسیط کائنات ہے جو افکار و مضامین کے تنوع سے عبارت ہے اہلِ سخن ہر نوع سے طبع آزمائی کرتے ہیں اور جو شاعر زیادہ دور کی کوڑی لانے میں جتنا زیادہ کامیاب ہے اس قدر لائقِ تحسین ٹھہرتا ہے ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے وسیع و عریض کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی بے شمار مضامین اور لاتعداد عنوانات اہلِ ذوق کو دعوتِ فکر دیتے ملیں گے آج ہم جس موضوع کو زیرِ بحث لا رہے ہیں وہ ہے ان کا نظریۂ خرد در حقیقت خرد عقل کا دوسرا نام ہے اکثر شعرا کے ہاں عقل و خرد کی مذمت کی گئی ہے یا اس کا مذاق اڑایا گیا ہے یا اُسے منفی وصف کے طور پر لیا گیا ہے یا پھر متاع کم سواد گردانا گیا ہے جیسے اقبال کے یہ اشعار دلالت کرتے ہیں۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملّا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

عشق فرمودۂ قاصد پہ سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یا حسرت موہانی کا یہ شعر ۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا' جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

عہدِ جدید میں اپنے شعرا کے ہاں خرد کے حوالے پائے جاتے ہیں بعض شعرا نے تو اس کی طرف داری میں قلم اٹھایا ہے بطورِ مثال راقم الحروف کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

محبتوں کی بساط لپٹی پڑا ہے جب سے خرد سے پالا
جنوں کا ناقدؔ فسوں نہیں ہے خرد کی حاصل حمایتیں ہیں

ہے اعزاز حاصل کہ اہلِ خرد ہیں
نہیں ہے جنوں سے ہمیں کوئی نسبت

خرد نے نبھائے ہیں کردار دل کے
مگر میرا اصلی حوالہ خرد ہے

یہی اس کی خاطر ہے اک نیک نامی
سپر ڈال دی دل نے آگے خرد کے

جو ہیں اہلِ دل وہ سدا ہیں پریشاں
جو اہلِ خرد ہیں سدا شادماں ہیں

آیئے اب ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے حاصلِ مطالعہ کے طور پر خرد کے حوالے سے ایک تحقیقی شذرہ قلم بند کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ خرد کی نسبت سے ان کا نقطۂ نظر کیا ہے اس سلسلے میں ان کا مجموعۂ کلام "کچھ دیر پہلے وصل سے" ہمارے زیرِ نظر ہے شذرہ ہذا میں شامل بیشتر اشعار اسی سے لیے گئے ہیں سب سے پہلے جناب فاتحؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

وسعتِ دشت و بیاباں بھی خرد نے چھین لی
اب جنوں کے پاس کوئی مورچہ باقی نہیں

یہاں خرد کی چیرہ دستی اور قوتِ غاصبہ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جنوں کی سادگی و معصومی کہیئے یا کمزوری و غفلت کہ ایسے مقامات جو جنوں کی جاگیر سمجھے جاتے رہے جیسے دشت و بیاباں وغیرہ خرد نے غاصبانہ طور پر جنوں کو بے دخل کر دیا ہے گویا خرد سامراج کی علامت بن کے رہ گئی ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو ۔

ہم نہیں حاملِ خرد مندی
عمر دیوانہ پن میں گزری ہے

حضرتِ فاتح سخنِ ھذا میں اپنی زندگی کے حوالے سے بات کر رہے ہیں خیال رکھنا حاشا وکلا یہ نہ سمجھنا کہ ہم کوئی خرد مند انسان ہیں فراست وزیر کی ہم پر ختم ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ذات جنوں سے عبارت ہے ہم نے دیوانگی میں عمر بسر کر ڈالی ہے ہوسکتا ہے یہ پاگل پن اختیاری ہو جو اپنی پسند پر انہوں نے خود پر طاری کیا ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے یہ ان کی حیات کا کوئی کمزور پہلو ہو جس کا ذکر وہ اعترافِ حقیقت کے طور پر کر رہے ہیں صورتِ حال کچھ یوں ہے کچھ بھی ہو یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ دیوانگی شاعر کا جوہر خاص ہے گوہر ذات ہے جزو لاینفک کا درجہ رکھتا ہے۔ایک نسبتاً معتدل شعر جس میں جنون و خرد کے مابین توازن برتا گیا ہے دامنِ توجہ کھینچ رہا ہے ۔

خرد بھی مطمئن ہم سے ہے فاتح
جنوں نے بھی اماں پائی ہوئی ہے

مقطعِ ھذا میں فصاحت و بلاغت کا نشان ہے فاتح جی فرماتے ہیں کہ ہماری ہستی سے خرد کو بھی اطمینان حاصل ہے جس کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہماری ذات سے عقل کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے یا جس رنگ میں عمرِ عزیز گزر رہی ہے خرد کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے دریں حال یہ کہ جنوں بھی ہمارے حلقۂ اثر میں خود کو محفوظ و مامون سمجھتا ہے۔ یہ علامت ہے ایک

مرنجان مرنج انسان کی جو نہ دوسروں کو شکایت کا موقع دیتا ہے اور نہ خود فطرتِ دیگراں سے برسرِ پیکار ہوتا ہے جنوں و خرد کے مابین اس قدر متوازن حکمتِ عملی شاذ ہی کہیں نظر آئے گی۔

آیئے اب خرد کے حوالے سے ایک اور پُر حکمت شعر دیکھتے ہیں ۔

اے اہلِ خرد کہہ لیں کہ ہم اہلِ جنوں کہہ لیں
جو اک بوٹے سے کر کے پیار جنت ہار بیٹھا ہے

صنعتِ تلمیح کا حامل یہ شعر حضرت آدم کے واقعۂ خروج بہشت کی طرف مشیر ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوا جی کا شجرِ ممنوعہ کو تناول فرمانا کس زمرے میں آئے گا خردمندی تھی یا جنونِ شوق تھا ادب مانع ہے ہم تو کچھ عرض نہیں کر سکتے البتہ قارئین کرام کی سمجھ میں آئے تو مرقومہ پتے پر خبر فرمادیں۔

اب ایک اور سخن پارہ دعوتِ نظارہ دے رہا ہے لیجئے پڑھیئے ۔

نظر کی گرم بازاری خرد کا نمک مکا ہوگا
کوئی بہرِ تماشا چند لمحوں کو رُکا ہوگا

شاعر اپنی یا پھر محبوب کی سیرِ حیات کے حوالے سے رقمطراز ہے بازارِ جہان کی رونقیں زوروں پر ہیں عقل و دانش کی گرم بازاری ہے نگاہوں کے ذریعے معاملات طے پا رہے ہیں اہلِ جہاں اپنے اپنے کارناموں میں لگے ہوئے ہیں ایسے میں ایک انسان ذرا سی دیر کے لئے آ کر رکتا ہے اچٹتی سی نگاہ گردوپیش پر ڈالتا ہے اپنی راہ لیتا ہے ۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

معاملہ صیغۂ راز میں رہ جاتا ہے کہ طائرانہ نظر ڈالنے والا راہی حالات سے کیوں لاتعلق ہو جاتا ہے آیا یہ ہنگامے اس کی طبعِ نازک پر گراں گزرتے ہیں یا وہ بیزاری محسوس کرتے ہوئے اغراض کر لیتا ہے۔ یہاں ایک ایسا شعر ہمارے ہاتھ لگ رہا ہے جو شاعر کے نظریۂ خرد کو نسبتاً زیادہ واضح کر رہا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ۔

شہر والوں کی خردمندوں کی حالت دیکھ کر
یہ فضائے دشت یہ دیوانگی اچھی لگی

مصرعِ اوّل میں اہلِ خرد کی حالت کا تذکرہ ہے جن کا محل شہر ہے اور مصرع ثانی میں اہلِ جنوں کا حوالہ ہے جن کے مسکن دشت زار ہیں اظہار یہ فرماتے ہیں کہ اول الذکر حضرات کی کیفیت دیکھتے ہوئے مؤخر الذکر احباب کی حیات و بود و باش کے سلوک و رویہ ہمیں بھلا لگا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ اس شعر میں اہلِ جنوں اور ان کے رہن سہن کو سنجیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

آخر میں ایک اور شعر ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا ہدیۂ قارئین ہے ۔

خرد نے عقل و دل پر اس قدر قبضہ جمایا ہے
خیالوں اور خوابوں سے مجھے الجھن سی ہوتی ہے

اُن کا یہ شعر خرد کی بالا دستی اور کیفیتِ جبر و اکراہ پر دال ہے مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل و دماغ کو عقل و خرد نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے کہ اب خواب و خیال ہماری نظر میں جچتے ہی نہیں ہیں۔ مفروضوں سے ہم بیزار ہو چکے ہیں حقیقت پسندی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اب نظری حیات کی بجائے عملی زندگی اپنی نگاہ میں مندوب و مستحسن ہے یہ وہ مقام ہے جہاں پر آخرِ کار آزمودہ کار ہونے کے بعد تکمیل دانش کے موقع پر اہلِ فکر و نظر پہنچ جایا کرتے ہیں یہی ابوالبیان کا اعتبارِ کلام ہے۔

مندرجہ بالا استشہادات سے پروفیسر ظہور احمد فاتح کے نظریۂ خرد پر بخوبی روشنی پڑتی ہے اور حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ خرد کی چیرہ دستی اور جبر کے خلاف ہیں اور غلبۂ خرد کا اعتراف کرتے ہیں جس نے طرزِ فکر کو بدل کر رکھ دیا ہے لوگوں میں سائنسی اندازِ فکر پیدا کر دیا ہے یہاں تک کہ ضرورت سے بھی کچھ زیادہ حقیقت پسندی نظر آنے لگی ہے وہ جنوں، وہ سادگی، وہ بانکپن، وہ دیوانگی وہ معصومیت اور سرمستی جو جنوں کا طرۂ امتیاز ہے اب عنقا ہے ابوالبیان ظہور احمد فاتح کو اس کا استحضار ہے وہ حمایتِ مظلومان کے مصداق جنوں سے ہمدردی رکھتے ہیں تاہم جنوں کی کمزوری انہیں شاق گزرتی ہے پھر بھی یہ تسلیم ضرور کرتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ خرد نے لوگوں کو حقیقت پسند بنا دیا ہے اور ان کا وہ من موجی پن جاتا رہا جو کبھی بانکپن کے طور پر دلوں کو گدگداتا تھا۔

☆☆☆☆☆

امان اللہ کاظم ایک بالیدہ فکر شاعر

انسانی ادراکات محوِ ارتقا ہیں حکمت و دانش کا یہ سفر جب اپنے منطقی مدارج کو پہنچتا ہے تو انسان کو مقامِ اعتبار میسر آتا ہے ویسے بھی فہم و فراست اور تدبر و تفکر فطری خصائص ہیں جو کسی فرخندہ نصیب کے حصے میں آتے ہیں فن شاعری جس کی اساس فکر پر رکھی گئی ہے فن قالب کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ فکر روح ہے اس لئے فکر کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ ہے بدوں از روح قلب چہ معنی دارد جس سخنور کا فکری کینوس بسیط و عریض ہوگا اس کا کلام وقیع اور گراں قدر ہوگا ہر شاعر عمیق ریاضت کے جاں گداز عمل سے گزرنے کے بعد فکر کی وسعتوں سے ہم کنار ہوتا ہے گویا فکری بلوغت اس کی طویل المیعاد عرق ریزیوں کا ثمر ہوتا ہے جبکہ کچھ شعرا میں یہ معاملہ فطری نوعیت کا ہوتا ہے کسی بھی تخلیق کار کی تخیلی استعداد ہی اس کے مقام و مرتبے کا تعین کرتی ہے شذرہ ھذا میں ہم امان اللہ کاظم کے کلام بلاغت نظام کے حوالے سے قمطراز ہیں جن کے سخن میں فکری زاویے عمق کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور ان کا شعری ادراک قاری کو محوِ حیرت و استعجاب کر دیتا ہے ان کے اولین شعری مجموعہ "قندیلِ دل" مطبوعہ 2006ء کی منتخب غزلیات کے اشعار منتجہ ان کی بالیدہ فکری کے حوالے سے شامل شذرہ ہیں ان کی متعدد نثری و شعری تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔ قندیلِ دل (اُردو شعری مجموعہ)
2۔ پلیں ہنجھ نہ ماوے (سرائیکی شعری مجموعہ)
3۔ کِٹن پُر (سرائیکی اکھاڑ اُردو شرح پہلا حصہ)
4۔ پیکرِ جلال و جمال (ناول بحوالہ ٹیپو سلطان)
5۔ فاتح اندس (ناول بحوالہ طارق بن زیاد)

6۔ ابوسلیمان سیف اللہ (ناول بحوالہ حضرت خالد بن ولیدؓ)
7۔ بطلِ حریت (ناول بحوالہ سلطان صلاح الدین ایوبی)
8۔ منگولیا کا دجال (ناول بحوالہ چنگیز خان)
9۔ خونخوار بھیڑیا (ناول بحوالہ ہلاکو خان)
10۔ کم سن فاتح (ناول بحوالہ محمد بن قاسم)
11۔ زیوس کا بیٹا (ناول بحوالہ سکندرِ اعظم)
12۔ شرح بانگِ درا (کلامِ اقبالؒ)
13۔ شرح بالِ جبریل (کلامِ اقبالؒ)
14۔ شرح ضربِ کلیم (کلامِ اقبالؒ)
15۔ شرح ارمغانِ حجاز (کلامِ اقبالؒ)
16۔ خونناب غم (شرح دیوان حکیم مومن خان مومنؔ)
17۔ ماءالحیات (شرح دیوان خواجہ میر دردؔ)
18۔ تلخابہ شیریں (شرح دیوان ساغرؔ صدیقی)

اس سے قبل ہم ان کی شعری استشہادات سے تنقیدی استخراجات اخذ کریں ان کے سوانحی کوائف پر طائرانہ نظر ڈالنا انتہائی ناگزیر ہے ان کے اباد واجداد کا مولد و مسکن غزنی تھا' ان کے پردادا احمد شاہ ابدالی کی سپاہ سے منسلک تھے ان کے جد امجد محمود غزنوی کی فوج کا حصہ رہے اسی دور میں ہی انہوں نے ہجرت کی بستی ٹبہ امام تحصیل تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان میں سکونت اختیار کی ان کے دادا مولوی عبدالجبار مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل تھے ان کے والد عطا محمد خان ایک مذہبی مزاج کی شخصیت تھے وہ ایک سرائیکی نعت گو شاعر تھے عوامی مذہبی اجتماعات میں اپنا نعتیہ کلام ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ خوش الحان اس درجہ تھے کہ سامعین عش عش کر اٹھتے تھے اور ان پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ 1945ء میں بستی ٹبہ امام تحصیل تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان میں امان اللہ کاظم کی پیدائش ہوئی سکول کی عمر سے ہی شاعری کا آغاز کیا اولاً دامن عباسی جو میکانی تونسہ شریف سے تعلق رکھتے تھے، سے اصلاح لی۔ 1964ء گورنمنٹ ہائی اسکول وہوا سے میٹرک کیا 1965ء میں سینئر ورنی کولر ایس وی

ٹیچر کا امتحان گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بہاولپور سے پاس کیا 1968ء میں گورنمنٹ مڈل اسکول باطل تحصیل وضلع ڈیرہ غازی خان میں مدرس تعینات ہوگئے 1969ء میں ایف اے کا امتحان انٹرمیڈیٹ بورڈ حیدرآباد سندھ سے نجی طور پر دیا جس میں کامیاب قرار پائے بعدازاں ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول تکانی تحصیل تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان میں ہوگیا 1969ء تا 1974ء تک گورنمنٹ مڈل اسکول ٹبی قیصرانی تحصیل تونسہ شریف میں تعلیمی خدمات سرانجام دیں جبکہ 1975ء سے ہی آپ نے تبادلہ کی وجہ سے لیہ میں مستقل سکونت اختیار کی تادمِ تحریر لیہ میں ہی مقیم ہیں دس سال قبل ازوقت ریٹائرمنٹ لے لی دسمبر 1995ء میں کچھ عرصہ کپڑے کا کاروبار کیا جسے خرابیٔ صحت کے باعث ترک کرنا پڑا ادبی تنظیم ''بزمِ تخلیقِ نو'' جس کے سرپرست نسیم لیہ تھے، کے ہفتہ وار مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ ڈاکٹر خیال امروہوی، غافل کرنالی، ارمان عثمانی، عدیم صراطی اور امان اللہ کاظم ان مشاعروں کی روحِ رواں ہوا کرتے تھے۔ بعدازاں انہوں نے نادر سرائیکی سنگت کی بنیاد رکھی جس کے سربرآوردہ اراکین میں نادر قیصرانی واصف حسین واصف، نسیم لیہ اور امان اللہ کاظم تھے جہاں جنوبی پنجاب کے مختلف علاقوں سے اہل ذوق جوق در جوق مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے امان اللہ کاظم نے اپنی زندگی بھرپور ادبی فعالیت میں گزاری۔ اب بھی اگرچہ ضعفِ پیری نے آلیا ہے مگر پھر بھی مختلف النوع کی تصنیفی سرگرمیوں میں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔

ان کی غزل کا ایک شعر قابلِ توجہ ہے۔

جب کبھی موجِ حوادث میں تری یاد آئی
بڑھ کے ساحل کے کناروں نے مرا ساتھ دیا

وہ خدا کی قدرتِ کاملہ پر مکمل یقین رکھتے ہیں ان کی شخصیت کا اعتماد بھی اس امر کی غمازی کرتا ہے اس لئے زیست کے ہر کام میں مشیت ان کی رفیق و دمساز رہتی ہے یہ بصیرت وحکمت عرفان وآگہی کا سرچشمہ ہے تمام دنیاوی سہاروں کا بطلان ہے بقول کسے ۔

یوں تو جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

بقول راقم الحروف ۔

سہارے یہ سب عارضی سے ہیں ناقدؔ
سہارا ہے اک ان سہاروں سے آگے

غزل کا ایک شعر دیدنی ہے ۔

جب اپنے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے
تو پھر وحشت نہ ہو کیوں ہر بشر سے؟

امان اللہ کاظمؔ زبان و بیان پر دستگاہ رکھنے والے شاعر ہیں ان کے کلام میں کہیں کہیں محاورات کا استعمال بھی فنی چابکدستی سے ہوا ہے مذکورہ شعر میں بھی محاورے کو قرینہ کاری کے ساتھ برتا گیا شعر ھذا میں عمرانی کج روی اور عصری رویّوں کی بازگشت عمدگی سے سنائی دیتی ہے اس شعر میں اخلاقی اقدار کی پامالی پر اظہارِ تاسف کیا گیا ہے۔

رومانوی حوالے کا حامل شعر لائقِ التفات ہے

تجھ سے ایفائے عہد کی توقع پر
ہم نے اپنا ہی احتساب کیا

ان کے شعری کینوس میں جہاں اظہارِ معرفت کے شواہد ملتے ہیں وہاں کہیں کہیں رومان بھی ضو پاشیاں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے شعر ھذا میں وفا کی پالنا انتہائی مؤثر طریقے سے کی گئی ہے حتیٰ کہ اپنی ذات کو ہدفِ احتساب بنایا گیا خود احتسابی کا یہ بسیط عمل شاذ ہی کہیں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اس غزل کا مطلع معرفت کے تناظر میں دروِل پر دق الباب کر رہا ہے۔

جب سے اُس نے خود کو بے حجاب کیا
ذرّے ذرّے کو آفتاب کیا

شعر مذکور میں تصوف کا فلسفہ ہمہ اوست کارفرما ہے ذرے ذرے میں فطرت کے رنگ ملاحظہ کرنا بھی عرفان و آگہی کی بہترین تمثیل ہے اسی فلسفے کو خواجہ میر دردؔ نے بھی عندالبیان خوبصورت انداز میں برپایا ہے بقول خواجہ میر دردؔ ۔

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

بقول راقم الحروف ۔

زمان و زمیں میں اسے میں نے پایا
مکان و مکیں میں اسے میں نے پایا
جہاں یہ اس کا بنایا ہوا ہے
کہاں اور کہیں میں اسے میں نے پایا

کلاسیکی طرزِ فکر کے حامل غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں ۔

دنیا نے زہرِ غم کے سوا کیا دیا
آئے تو آنکھ نم تھی گئے تو چشم تر گئے
خلق و وفا کا ہائے جنازہ نکل گیا
جو پیکرِ وفا تھے نجانے کدھر گئے

غم کائنات کا اساسی جذبہ ہے فلاسفۂ دہر نے اپنے افکار میں اس پوتر جذبے کا اعتراف کیا ہے کہ حزن تمام تر حیاتِ انسانی پر محیط ہے دوسرے شعر میں خلوص و مروت کے ناپید ہونے کی بات کی گئی ہے اور اہلِ وفا کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا گیا ہے بقول راقم الحروف ۔

اے خدا کس دیس میں ہم آ گئے؟
پیار عنقا ہے جہاں نفرت فزوں

ترقی پسند فکر کا حامل ایک شعر نذرِ قارئین ہے ۔

پڑھ لو کھلی کتاب ہے چہرہ غریب کا
مفلس کی کوئی اس کے علاوہ زباں نہیں

امان اللہ کاظم کے کلام میں انسان دوستی کے بہت سے مظاہر ملتے ہیں وہ سماج کے محروم اور مفلوک الحال طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے دکھ درد کو خود بھی محسوس کرتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی یہ جانکاری باور کراتے ہیں۔

غزل کا مطلع ملاحظہ ہو

جب دکھائی آسمان نے کج روی
کام آئی کب کسی کی دوستی؟

شعرِ ھذا ایک عمیق فلسفے پر مبنی ہے جس میں ارضی و سماوی بے حسی کا ذکر کیا گیا ہے وہ مشیت سے بھی شاکی نظر آتے ہیں اور اہل جہاں سے بھی نالاں ہیں نالہ وشیون کا ایک غالب عنصر ان کے کلام میں در آیا ہے۔

عصری رویوں کے تناظر میں غزل کے دو اشعار آپ کے ذوقِ طبع کے نذر ہیں۔

نئی تہذیب نے شکل و شباہت ہی بدل ڈالی
جسے سمجھے تھے محترمہ مگر وہ محترم نکلے

ملمع ساز دنیا نے ملے چہرے پہ وہ غازے
مروت کے پیمبر بھی شہنشاہِ ستم نکلے

پہلے شعر میں نئی تہذیب کی چکا چوند کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے شاعر ممدوح مشرقیت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب کے تقدس کے علمبردار بھی ہیں نئی تہذیبی یلغار سے وہ خائف نظر آئے ہیں جس کے باعث وہ مجبورِ نوا ہو جاتے ہیں دوسرے شعر میں اہل جہاں کے دوہرے رویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور سماج کے نام نہاد فرشتہ صفت لوگوں پر کڑی طنز کی گئی ہے اور ان کی منافقت کے لبادے کو اتار پھینکا ہے اس نوعیت کا ایک اور شعر دیکھئے۔

تقدس کے گھونگھٹ میں چھپائے ہوئے چہرہ
ابلیس کو سرگرمِ عمل دیکھ رہا ہوں

یہ موضوع ان کے ہاں وفور سے پایا جاتا ہے اور ایک شعر آپ کے ذوقِ طبع کی نذر ہے۔

حقیقت میں یہ سانپ ہیں آستیں کے
خلوص و مروت ہے جن کا لبادہ

ایک اور غزل کا شعر دردِ دل پر دق الباب کر رہا ہے

کیا تھا جو روزِ الست اپنے رب سے
ضروری ہے اس عہد کا پھر اعادہ

امان اللہ کاظم ایک درویش منش انسان ہیں اس لئے صوفیانہ افکار ان کے مزاج کا حصہ ہیں عرفانِ خالق کائنات ان کے شعور اور لاشعور میں رچا بسا ہوا ہے وہ عبد اور معبود کے رشتے کو مستحکم بنیادوں پر استوار رکھنا چاہتے ہیں اس شعر میں یومِ الست کے میثاقِ اول کی یاد دہانی

کرائی گئی ہے جس میں ارواحِ انسانی نے اپنے رب کی ربوبیت کا اعتراف کیا تھا اور اس کے امر و نواہی پر عمل پیرا ہونے کی یقین دہانی بھی کرائی تھی۔ راقم الحروف نے اپنی نظم "بے تابی" میں اس موضوع کو یوں نبھایا ہے۔

کب سے بے چین ہے مضطرب ہے مری جاں، مری آتما؟
جب سے بچھڑا ہے ارواح کے عالمِ ابتدائی سے تو
لوگ لاکھوں گناہوں کے باوصف بے چین ہوتے نہیں
ایک میں ہوں کہ بے چین رکھتی ہے موہوم سی اک خطا

امان اللہ کاظم کا سخن کثیر الجہات ہے زیست کے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ رومان کی دلاویزی بھی اپنی ایک خاص تاثیر رکھتی ہے ان کی غزل کے ایک شعر میں انتظارِ یار کا منظر ملاحظہ کرتے ہیں۔

مرنے کے بعد مری آنکھیں کھلی رہیں
بس ان کے انتظار کا چسکا نہیں گیا

بقول شاعر۔

مرنے کے بعد بھی تو آنکھیں کھلی رہیں
عادت جو پڑ گئی تھی ترے انتظار کی

بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح۔

آنکھ بند ہو جائے پھر بھی روبرو رہتے ہو تم
جاگتا ہے غم تمہارا پہرے داروں کی طرح

الغرض امان اللہ کاظم کے تخیلات ان کی بالیدہ فکری اور بالغ نظری کی عکاسی کرتے ہیں ان کا اسلوب انتہائی سادہ اور رواں دواں ہے جس کے باعث قاری کو کسی نوع کی لسانی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا خالقِ ارض و سما سے استدعا ہے کہ ان کے شعری و ادبی کارناموں کو دولتِ دوام سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر اختر ہاشمی..... رجائی امکانات کا شاعر

عصرِ حاضر میں جب کہ اخلاقی اقدار اپنی بساط لپیٹ چکی ہیں باہمی خلوص و مروت کے جذبات ناپید ہو چکے ہیں خود غرضی اور نفسا نفسی بامِ عروج پر پہنچ چکی ہے جس کے باعث انسانیت منہ ڈھانپے فریاد کناں نظر آتی ہے ہر نفس محوِ فغاں ہے عصری آشوب نے مہیب صورت اختیار کر لی ہے یقیناً اس کا اثر انسانی رویوں پر بھی ہوا ہے جس کے لازمی نتیجے کے طور پر حزن و ملال اور یاسیت و قنوطیت نے روئے ارضی پر اپنے جھنڈے گاڑھ دیئے ہیں ان عصری تغیرات سے ہمارا ادب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا عمومی طور پر ادب کے تمام شعبے متاثر ہوئے اور خصوصی طور پر فنِ شعر کا نازک ہنر بھی اس کی دست برد سے نہیں بچ سکا ان اثرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے شعرا نے دامنِ شعر کو افسردگیوں' مایوسیوں اور بیزاریوں سے لبریز کر دیا جس کے باعث قارئین شعر شاعری سے اعراض برتنے پر مجبور ہو گئے شعر اور قاری کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ایسے میں اس امر کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ عوام الناس کو پھر شعر و سخن کی طرف راغب کیا جائے چنانچہ عصری مقتضیات یہ ٹھہریں کہ شاعری میں یاس و حسرت' حزن و ملال' سوز و گداز اور غم و الم کی بجائے رجا و نشاط کا پیغام دیا جائے جن شعرا نے اس عصری تقاضے کو محسوس کیا اور قابلِ اعتنا سمجھا وہ نشاط انگیز اور پُر اُمید شاعری کے جادۂ پُر بہار پر گامزن ہو گئے انہیں بالیدہ فکر اور فرخندہ نصیب احباب میں ڈاکٹر اختر ہاشمی کا اسمِ گرامی بھی لائقِ تحسین ہے جنہوں نے رجائی امکانات سے مملو شاعری کر کے قاری اور شعر کے درمیان تعلق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا ہم ان کے شعری مجموعہ ''خاموش آئینوں کی طرح'' مطبوعہ ستمبر 2012ء کے منتخب غزلیات کے اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ کرتے

ہیں۔

ان کے ہاں زندگی کرنے کا بسیط و عمیق عزم و حوصلہ ملتا ہے ان کے کلام میں آموزگاری کے امکانات بھی وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں جو قاری کو حیات کے حوالے سے بے پناہ شعور سے ہم آہنگ کرتے ہیں وہ مصائب و آلام کے پر آشوب عہد میں بھی روشنیٔ زندگی اور مردنی رکھنے کا آدرش دیتے ہیں اس تناظر میں ان کی غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دوستو خود کو روشنی رکھنا
کوئی عالم ہو زندگی رکھنا
ایک سے ایک آفتیں بھی ہیں
راہِ عرفاں میں دل جری رکھنا
راہِ ہستی میں سرخوشی کے لیے
بس محبت کی روشنی رکھنا

وہ بنی نوع انسان کی مخفی صلاحیتوں اور اس میں موجود سربستہ رازوں کی بات کرتے ہیں وہ انسان کے ہر وصف کو بے مثال اور ہر ادا کو باکمال گردانتے ہیں ان کا کلام سراپا رجائیت ہے اور ہر شعر سے امید کی کرنیں پھوٹتی نظر آرہی ہیں اسی نسبت سے ان کی غزل کا مطلع لائقِ التفات ہے ۔

آدمی وصفِ بے مثال میں ہے
ہر ادا منزلِ کمال میں ہے

ان کے فکری کینوس میں روشنیوں کے ہالے ہیں مسکراہٹوں کے حوالے ہیں دنیائے دروں میں ایک جگمگ، سرشاری اور سرخوشی کا سماں ہے ان کے تخیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ رجائی اور طربیہ تاثرات پہلو بہ پہلو چلتے ہیں گویا ان کے جذبات رجا اور طرب کے حسیں احساسات کا خوبصورت امتزاج ہیں ان کی غزل کا مطلع دیدنی ہے ۔

روشنی بن کے مسکرایا تھا
روح میں سب کی جگمگایا تھا

انہوں نے اپنے قاری کو یاس کے اندھیروں سے نکال کر آس کی روشنی میں لانے کی سعی جمیل کی ہے اور اس جدوجہد میں خاصے کامیاب بھی نظر آئے ہیں اس لئے وہ مایوس اور افسردہ احباب سے سراپا سوال نظر آتے ہیں ۔

کیوں اندھیروں میں تم بھٹکتے ہو؟
دوستو! روشنی میں آؤ نا

امام عالی مقام سے ان کی عقیدت و موانست مثالی نوعیت کی ہے کربلا ان کے نزدیک ایک آس اور امید کا مینارہ ہے اور رجا کا بھرپور استعارہ ہے اس لئے وہ قاری کو اس کی پاسداری کی تلقین کرتے ہیں ان کی رجائیت کے تمام تر چشمے محبت سے پھوٹتے ہیں اس لئے وہ محبت کے دیئے جلائے رکھنے کی تاکید کرتے ہیں ۔

کربلا اہلِ صداقت کے لئے نور ہے اک
نور یہ روح میں تم اپنی بسائے رکھنا
یاد رکھو یہ بھٹکنے سے بچا لیتی ہے
تم محبت کا دیا اپنا جلائے رکھنا

زیست کے پُر پیچ سفر میں رجا کی بھرپور دولت کے باعث انہیں راہوں سے محبت ہے اور سفر سے دوستی ہے اسی امر سے ہی ان کی زندہ دلی کا جواز ملتا ہے اسی انداز سے ہی وہ اپنی زندگی اور دنیا کا تعارف کراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔

ہے راہوں سے محبت اور سفر سے اپنی یاری ہے
یہی ہے زندگی اپنی یہی دنیا ہماری ہے

ان کی رجائیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر حال میں مطمئن اور شانت نظر آتے ہیں مشیت کا شکوہ کرنے کی بجائے ان کے ہاں ایک احساسِ سپاس گزاری ملتا ہے اس لیے وہ اپنے منعمِ حقیقی سے شاکی و نالاں ہونے کی بجائے شکر گزاری کا انداز اپنائے ہوئے ہیں جو ان کی عمیق ریاضت کی غمازی کرتا ہے وہ خداوندِ عالم کا شکر بجالاتے ہیں اور مالکِ ارض و سما کا احسانِ عظیم گردانتے ہیں کہ اس ذاتِ کبریا نے ساری مخلوق میں سے حضرتِ انسان کو خوبصورت شبیہ خلق

فرما کر اعزاز بخشا اسے عقل و دانش اور فہم و بصیرت کی دولت سے بہرہ ور فرمایا ایسی بھر پور رجائیت شاذ ہی کہیں ملے گی۔

مذکورہ تصریحات سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اختر ہاشمی کا کلام رجائیت کا ایک بحرِ بیکراں ہے۔جس میں غواصی کے بعد قاری اپنے آپ کو ہر قسم کے تفکرات سے آزاد پاتا ہے ان کی قوتِ متخیلہ نشاط ورجا کی وہ قوسِ قزح ہے۔جس میں امیدوں اور امنگوں کے تمام ترنگ پائے جاتے ہیں فکری خلفشار اور ذہنی تناؤ کے اس عہدِ پُر آشوب میں مسرت ورجا کے جذبے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں یاسیت وقنوطیت کے عہد میں ذہنی اور روحانی آسودگیوں کا اہتمام بھی کسی اعجاز مسیحائی سے کم نہیں اور حیات کے تنِ مردہ میں روح پھونکنے کے مترادف ہے صانعِ لوح وقلم سے استدعا ہے کہ انہیں خوشگوار اور بھر پور انداز میں فزوں سے فزوں تر شعر و ادب کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

☆☆☆☆☆

ابوالحسن واحدؔ رضوی کا نقدِ فن

راقم الحروف کو قدرت نے کثیر ذوقِ مطالعہ سے نوازا ہے جس کے باعث شعرائے کرام اور ادبائے عظام کی تصانیف و نگارشات سے استفادہ کیا ہے اور معتبر ارباب علم و دانش سے حتی المقدور کسبِ فیض کیا ہے اسی امر کے باعث مختلف النوع تصانیف و تخلیقات اور شخصیات نے اقلیمِ خرد پر اپنے نقوش ثبت کیے ہیں یہ امر کسی سعادت مندی سے کم نہیں ہے یہ کسی کا فیضِ نظر ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ سرور و فرحت، نشاط و تازگی جو راحت و طمانیت کسبِ علم و ادب میں ہے وہ دنیا کے کسی فرمانروا کے گنجِ سیم و زر میں نہیں ہے جو حصولِ علم کی کاوش میں قرار ہے جو اس راہ میں بھٹکنے میں سکھ سکون ہے وہ شادمانی تو راحتِ خانہ میں بھی نہیں ہے مختلف قسم کی تنقیدی کتب کا مطالعہ کیا جو مشاطگیٔ فن کا باعث بنیں جو تاثر ابوالحسن واحدؔ رضوی کی تصنیف ''نذر صابری'' مطبوعہ 2011ء نے بخشا وہ یقیناً لازوال ہے اس سے پہلے کہ ہم مذکورہ تصنیف کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھائیں یا نذر صابری کا مختصر تعارف زینتِ قرطاس کریں کتابِ ہذا کے مصنف کا اجمالی تعارف ناگزیر ہے کیونکہ کسی بھی تصنیف یا نگارش کی تفہیم کے لئے اس کے خالق کو جاننا ازحد ضروری ہوتا ہے اس لئے کوئی بھی فن پارہ یا کتاب اپنے مصنف کا پرتو ہوتا ہے دونوں میں کسی ایک کو نظر انداز کرنا غیر مناسب ہوتا ہے ابوالحسن واحدؔ رضوی کا مولد و مسکن اور سوانحی کوائف کیا ہیں اس حوالے سے کتابِ ہذا کے اوراق خالی ہیں ان کی مطبوعہ غیر مطبوعہ تصانیف و تراجم کی تعداد تین سو نو ہے ابوالحسن واحد رضوی اٹک کے معروف شاعر، ماہرِ علمِ عروض، ادیب و نقاد، محقق، ماہرِ علمِ حدیث و تفسیر و فقہ، ماہرِ لسانیات اور مشرقی علوم پر دسترس رکھنے والے نقاد ہیں ان کے تبحرِ علمی کا اندازہ ان کی کسی بھی تصنیف سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

شبیر ناقدؔ

اس سے قبل کہ ہم کتاب ھذا کے فکری وفنی امور کا تجزیہ کریں اور اس کے مصنف کے فنِ تنقید کے حوالے سے کچھ لکھیں کتاب ھذا کے ممدوح جناب نذر صابری کا مختصر تعارف بھی ازحد ضروری ہے ان کے اباء واجداد موضع سنگھ پورہ تحصیل وضلع جالندھر کے مکین تھے بعدازاں ان کے والدین نقل مکانی کر کے ملتان پہنچے وہیں ان کی پیدائش یکم نومبر 1923ء بروز جمعرات ہوئی قرآن مجید گلستانِ سعدی اور قرات وتجوید کے چند رسائل اپنے والد گرامی مولوی علی بخش سے سبقاً سبقاً پڑھے مڈل تک ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سنگھ پورہ میں حاصل کی بعد آزاں گاؤں سے جالندھر آ گئے اور بی اے آنرز ڈگری حاصل کی اردو، فارسی اور انگریزی ادب کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی تقسیم ہند کے بعد کچھ عرصہ لاہور میں مقیم رہے 3 جنوری 1948ء بروز ہفتہ اٹک آ گئے اور پنجاب پبلک لائبریری میں ملازمت اختیار کی یہیں سے ریٹائرمنٹ اختیار کی ابھی تک یہیں اقامت گزیں ہیں۔

مذکورہ کتاب میں مصنف نے اپنے ممدوح کے فکر وفن اور شخصیت کے حوالے سے انتہائی جامع انداز میں لکھا ہے فنِ تنقید میں اسلوبیات کو ایک خاص مقام حاصل ہے اسلوب کی حیثیت کسی بھی فن پارے میں ایک قالب کی سی ہوتی ہے جب قالب ہی پرکشش اور دیدہ زیب نہ ہو تو حسنِ روح چہ معنی دارد اسلوبیاتی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ابوالحسن واحد رضوی روایت و جدت کے سنگم پر کھڑے ہیں ان کا پیرائے اظہار متقدمین ومتاخرین کے طرزِ بیان کا حسین امتزاج ہے ان کے ہاں شعوری طور پر دقیقہ سنجی کا عنصر پایا جاتا ہے مگر کہیں عبارت کو بوجھل، ثقیل اور گنجلک نہیں ہونے دیتے اور یہی رنگ انشا پرداز کا کمال ہوتا ہے ان کی دقیقہ سنجی ان کے تبحرِ علمی اور طویل المیعاد ریاضتِ ادب کا باعث ہے وہ عربی وفارسی کا گہرا شعور وشغف رکھتے ہیں اگر عربی ان کی روح ہے تو فارسی ان کی جان ہے ان کے اسلوب پر فارسیت کی چھاپ ہے لسانیات کے ذوق وشوق کی بدولت ان کا اسلوب منفرد مقام رکھتا ہے عصرِ حاضر کے جدید نقاد کا دامن عربی وفارسی کے جواہرے تہی ہے اس لیے اسی میں وہ شوق و شگفتگی مفقود ہے جس کے باعث قاری کے مطالعے کے دوران انہماک پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کا اسلوب ادبی کم اور صحافتی زیادہ ہے نذر صابری کی غزل کے حوالے سے مصنف کے پیرائے بیان کا اسلوب بطور

نمونہ ہدیۂ قارئین ہے۔

''صابری کی غزل ان کے خمیر کی لطیف تعبیرات سے عبارت ہے ان کی غزل روشن اور رواں ہے لب ولہجہ میں زور، اندازِ اسلوب میں توانائی اور بیان میں بلا کی دلکشی پائی جاتی ہے الفاظ وتراکیب کی جزالت و براعت، شگفتگی ورعنائی اور معنی کی لطافت وندرت دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی چلی جاتی ہے وہی کہنہ الفاظ وتراکیب لیکن معانی ومفاہیم جدت وتازگی سے لبریز ان کی فارسی غزلیات کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے مستعمل زمینوں میں بھی ایسی مضمون آفرینیاں کی ہیں جن میں انفرادیت اور تنوع پایا جاتا ہے وہی تنوع جو ان کی تلوّن پسند طبع کا خاصہ ہے اور یہی ان کی قادرالکلامی کی برہانِ قاطع اور بیّن دلیل ہے۔''

کتاب کے بابِ اول میں مصنف نے نذر صابری کی حیات وشخصیت کے حوالے سے اجمالی انداز میں لکھا ہے باب دوم ان کی علمی وادبی خدمات کے حوالے سے ہے جس میں انہوں نے ان کی تخلیقات جن میں نظم ونثر دونوں شامل ہیں پر بڑی صراحت سے لکھا ہے ان کا تجزیاتی انداز ایسا ہے کہ فکر وفن کے خدوخال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں انہوں نے ان کی نظم و نثر کے نمونے بھی پیش کیے ہیں بعدازیں ان کی تالیفات وترتیبات پر سیر حاصل بحث کی ہے اس باب کے آخر میں چند کتب ورسائل کا تعارفی جائزہ بھی شامل کیا ہے چوتھے اور پانچویں باب میں نذر صابری بحیثیتِ شاعر کی نسبت سے ہے جس میں اولاً شعر کے مفہوم وتعریف اور اجزائے ترکیبی کے حوالے سے انتہائی مدلل انداز میں بات کی گئی ہے نذر صابری کی شاعرانہ بصیرت، غزل گوئی، نعت نگاری اور ان کی دیگر اصناف کے حوالے سے خدمات کو تفصیل سے لکھا ہے ان کی فارسی شاعری کو بھی شاملِ تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کے کلام کا عروضی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو مصنف کی علم العروض پر دسترس کی غمازی ہے صنائع بدائع کا بیان بھی انتہائی تفصیل سے ہوا ہے بابِ ششم نذر صابری کی ناقدانہ حیثیت کے حوالے سے ہے جس میں نقدیا تنقید کے لغوی و اصطلاحی معانی کے حوالے سے بات کی گئی ہے ان کے اسلوبِ تنقید کے حوالے سے تصریح ہے ان کے تنقیدی نظریات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جن میں نقد یا تنقید کی اہمیت، نظری وعملی تنقید، معیارِ تنقید اور قضیۂ لفظ ومعنی کو شامل کیا گیا ہے اور ساتھ ہی چند تنقیدی

نمونے پیش کیئے گئے ہیں ساتواں باب تحقیق سے علاقہ رکھتا ہے اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس میں مبادیاتِ تحقیق پر بحث کی گئی تحقیق کے لغوی واصطلاحی معانی، تحقیق ادبی لوازم، نذر صابری کا محققانہ شعور اور نذر صابری کے اندازِ تحقیق کے حوالے سے نمونے شامل کیئے گئے ہیں باب ہشتم نذر صابری کی ادیبانہ حیثیت کے بارے میں ہے جس میں ان کے اسلوب کے خصائص ومحاسن بیان کیئے گئے ہیں اور ان کے نثری شذرات کے نمونے بھی اس باب کا حصہ ہیں باب نہم نذر صابری کے افکار ونظریات پر مبنی ہے جس پر مصنف نے منفرد انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے باب دہم منظوم انتخابِ کلام پر مشتمل ہے۔

کتابِ ہذا کے مصادر ومراجع اور اشاریہ جس میں آیات، احادیث، رجال، اماکن اور کتب ورسائل کے عنوانات شامل ہیں ملاحظہ کرنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں مصنف نے عرق ریزی سے کام لیا ہے تحقیق وتنقید اور تخلیق کا شوق وشغف رکھنے والوں کے لئے ابوالحسن واحد رضوی کی یہ تصنیف بیش بہا خزانہ ہے اور انشا پردازی کا کمال جوہر ہے مالک ارض وسما سے دعا ہے کہ ان کی ادبی خدمات کو دوام نصب فرمائے۔آمین

☆☆☆☆☆

امین اُڈیرائی.....غمِ ذات کا شاعر

کسی بھی شاعر کی کائنات انواع واقسام کے موضوعات پر محیط ہوتی ہے اور وہ اپنے موضوعات کا مجازی خدا ہوتا ہے جس موضوع کو چاہے زیادہ نواز دے جس کو چاہے کم نوازے سخنور جس موضوع پر زیادہ طبع آزمائی کرتا ہے وہ اس کی خامہ فرسائیوں کا مستقل حوالہ بنتا ہے موضوعات کی تخلیق میں سخن گستر کے معاشی ومعاشرتی حالات اہم کردار ادا کرتے ہیں اور وہ ان کا عکاس ہوتا ہے اس کے کلام کے آئینے میں اس کی تصویر صاف وشفاف ملاحظہ کی جاسکتی ہے نامساعد اور پر آشوب حالات کے باعث اکثر وبیشتر شعراء میں حزینہ شعری طبع پائی جاتی ہے جس کا معتبر حوالہ غم ذات ہے جسے داخلی احساس کا نام بھی دے سکتے ہیں ہم نے جب امین اُڈیرائی کے شعری مجموعہ "احساس کی خوشبو" مطبوعہ 2008ء کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو ہمیں غمِ ذات اپنے پورے کروفر سے نظر آیا کرب کا یہی احساس زریں ان کے سخن کی پہچان بنا آج ہم ان کے مذکورہ شعری مجموعہ کے تناظر میں منتخب اشعار کو بطور استشہاد دلاتے ہوئے موضوع ھذا کے حوالے سے فکری وفنی تجزیہ پیش کررہے ہیں۔

مشرقی کلاسیکی شعری ادب کی یہ روایت رہی ہے کہ شعراء غربت و افلاس سے شاکی رہے ہیں یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہلِ ادب مفلسی اور تنگ دستی کا نشانہ ہر دور میں بنتے رہتے ہیں کیونکہ علم وادب اور مال و دولت ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں ان دونوں کا بہم ہونا محالات میں سے ہے اسی حوالے سے ان کا یہ شعر دیدنی ہے۔

تمام عمر گزاری ہے اک سزا کی خاطر
ہمارا جرم بھی ٹھہرا تو مفلسی ٹھہری

راقم الحروف نے اسی موضوع کو یوں برتا ہے ۔

میرا غریب ہونا میرا قصور ٹھہرا
سوز سخن کا باعث میرا شعور ٹھہرا

بقول شاعر ۔

میری غربت نے اُڑایا ہے مرے فن کا مذاق
تیری دولت نے ترے عیب چھپا رکھے ہیں

شاعر یا تخلیق کار علمی، ادبی، فکری اور فنی اعتبار سے معاشرے کے اعلیٰ طبقے کا نمائندہ ہوتا ہے قاری اس کی ذہنی اُپج تک رسائی حاصل کیئے بغیر اس کا ادراک نہیں کرسکتا اس کی اصل وجہ سخن دان کا تبحرِ علمی اور مسلسل ادبی ریاض ہوتا جس کے باعث وہ دقیقہ سنجی کا مظہر ہوتا ہے بہ ایں صورت اسے عوام سے شکوہ نارسائی رہتا ہے اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اہل دنیا مادہ پرستی کے رسیا ہوتے ہیں جس سے اہل ادب کا دور سے تعلق نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ذہنی تفاوت وقوع پذیر ہوتا ہے اور ہم آہنگی مفقود ہو جاتی ہے اور اہلِ جہاں اسے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اس فکر کی ترجمانی ان کے اس شعر میں ملاحظہ کریں۔

سمجھ سکا نہ مرے دل کی بات کوئی امینؔ
زبانِ اُردو بھی شاید کہ فارسی ٹھہری

انسان جب معاشی و معاشرتی سنگینیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے طرح طرح کے مسائل مختلف روپ دھار کر سامنے آتے ہیں کبھی مہنگائی کے روپ میں تو کبھی کساد بازاری کی حالت میں تو کبھی دہشت گردی کے انداز میں کوئی بھی کیفیت ہو جاں گداز ہوتی ہے خارجی مشکلات داخلی خدشات کو جنم دیتی ہیں اور وہ اس کیفیت کا مداوا چاہتا ہے اسی صورت کی ترجمانی ان کا یہ شعر کرتا ہے

میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا ہوں
مجھے اس خوف سے باہر نکالو

جب ہر طرف غم والم کے بادل منڈلا رہے ہوں ہر سو نفسا نفسی کا عالم ہو اور کوئی پرسان حال نہ ہو جب اخلاقی اقدار پامال ہو رہی ہوں جب انسانیت منہ ڈھانپے فریاد کناں ہو جب

ہر فرد یاس وحزن کی تصویر بنا ہوا ہو، جب احساسِ مروّت ناپید ہو جائے جب دامن ہستی تار تار ہو جائے اور کوئی رفو گر میسر نہ ہو تو پھر شاعر یوں مجبور بیاں ہو جاتا ہے اور اسے اپنی ذات طرفہ تماشہ دکھائی دیتی ہے۔

خود آپ میں گم چاک گریباں لیئے پھرتا ہوں
اس دشت میں اپنا یہ تماشا بھی نیا ہے

سانسیں جب اذیت بن جائیں اور جیون غم واندوہ کا مرقع ہو جائے مسلسل صعوبتیں معمولِ حیات کے طور پر دکھائی دیں پھر ہستی ونیستی میں فرق ناپید ہو جاتا ہے دنیا قیامت کا منظر پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جب پوری زندگی سے کرب چھلک رہا ہو پھر حزن محتاج بیاں نہیں رہتا درد کا ہر مرحلہ قیامت کے مرحلوں کا مثیل دکھائی دیتا ہے امینؔ اُداسی کے ہاں یہ کیفیت کچھ یوں جلوہ گر ہوتی ہے۔

کسے بتائیں کہ کیا کرب زندگی ہے امینؔ
ملے ہیں درد قیامت کے مرحلوں کی طرح

جب حیات کا پورا منظر نامہ ہی آشوب زدہ ہو اور ہر طرف امواجِ خوں اٹھ رہی ہوں جب ظلمت کالے بادلوں کا لبادہ اوڑھ لے اور روشنی سیماب پا نظر آئے پھر راحت کے لمحے عنقا ہو جایا کرتے ہیں زندگی زہر آلود ہونے کی بجائے خود زہر بن جاتی ہے دریں اثنا انسان کو مفر مطلوب ہوتا ہے ان خیالات کو ذرا شاعرِ موصوف کی زبانی سنتے ہیں۔

چار سو آگ لگی آؤ کہیں بھاگ چلیں
خوں کی امواج اٹھی آؤ کہیں بھاگ چلیں
ہر طرف اٹھنے لگے کالے دھوئیں کے بادل
روشنی ماند پڑی آؤ کہیں بھاگ چلیں
ایک لمحہ بھی میسر نہیں راحت کا امینؔ
زندگی زہر بنی آؤ کہیں بھاگ چلیں

زندگی جب محرومیوں سے عبارت ہو جائے تو انسان احساسِ محرومی میں مبتلا ہو جاتا ہے

ماحول کی چکا چوند اس احساس میں مزید اضافہ کر دیتی ہے تو انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میرے حصے میں اتنی تیرگی کیوں ہے جبکہ چار سو اجالا ہے اسی حوالے کا حامل شعر دیکھیں۔

روشنی تو ڈگر ڈگر میں ہے
تیرگی صرف میرے گھر میں ہے

بقول حمیرا راحت۔

کیوں گھور اندھیرا ہے مقدر میں تمھارے
بجھتے ہوئے سورج کی کرن پوچھ رہی ہے

مذکورہ تصریحات شاہد ہیں کہ امین اڈیرائی زیست کی تلخیوں اور آشوب زدگیوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں، غم و آلام کے لازوال جذبوں کے امین ہیں ان کے تخیلات میں احساس حزن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پایا جاتا ہے بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح۔

جاتا ہے ان کے پاس جو اصحاب ظرف ہوں
یہ نامراد غم بڑا مردم شناس ہے

ان کی کتھا قاری کو اپنی بپتا معلوم ہوتی ہے اور ان کی کیفیات قاری پر طاری ہو جاتی ہیں غم ذات ان کے ہاں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے ان کی فکری اپج کی بدولت قاری کے حزنیہ طبع کو مہمیز ملتی ہے ان کے اس مجموعہ کلام کے مطالعہ کے بعد ان کے بہتر شعری مستقبل کی نوید دی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر اقبال ندیم.....
حقیقی زندگی کا ترجمان افسانہ نگار

کسی بھی افسانہ نگار کی کامیابی کا راز اس امر میں مضمر ہوتا ہے کہ اس کا افسانہ حقیقی زندگی سے کتنی مشابہت رکھتا ہے آیا وہ اپنے عصر کی صحیح ترجمانی کر پاتا ہے یا اس کا طرز اظہار فکری نوعیت کا حامل ہے کیا اس کے فن میں حقیقتوں کا فروغ ہے کیا اس میں مافوق الفطرت عناصر تو نہیں پائے جاتے، کیا اس کی فکر میں ربط وضبط اور تسلسل ہے کیا اس کے کردار فطری انداز میں مکالمہ کرتے ہیں کیا کرداروں نے اپنی آنکھوں پر تصنع کے چشمے تو نہیں لگائے ہوئے کیا افسانہ کا تانا بانا فنی چابکدستی کا مظہر ہے کیا اس کے افسانے کا نقطۂ آغاز، پلاٹ اور نقطۂ اختتام میں کوئی تناقص تو نہیں ہے کیا اس میں سماج کی فلاح کا جذبہ موجزن ہے کیا وہ معاشرے کی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتا ہے کیا وہ اپنی معاشرے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے کیا وہ اپنے معاشرے کی اچھائی اور برائی کو من وعن کرتا ہے کیا عمرانی خباثت کا کوئی مداوا تجویز کرتا نظر آتا ہے ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے فن پر کتنی دسترس رکھتا ہے ہم نے جب پروفیسر اقبال ندیم کے دوسرے افسانوی مجموعہ "برگِ آوارہ" مطبوعہ 2008ء کا بنظر نمائر مطالعہ کیا تو مذکورہ خصائص بدرجہ اتم نظر آئے ہم ان کے چند افسانوں کا مختصر تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ طول بیاں قاری پر گراں نہ گزرے ان کے اس افسانوی مجموعہ میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں۔

"بدلتے موسم" ان کا پہلا افسانہ ہے افسانے کا عنوان اس کے موضوع کی مناسبت سے جچ رہا ہے یہ فطری نوعیت کا افسانہ ہے جس کے کردار اور زمرہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں افسانہ

نگار نے اپنے کرداروں کی زبان کو بھاری بھر کم نہیں بنایا اور نہ ان کی زبان دقیق ہونے دی، نہ کردار ناجائز معزز بننے کی کوشش کرتے ہیں بنیادی طور پر یہ افسانہ مضافاتی معاشرت کا آئینہ دار ہے جس میں گھریلو رہن سہن کو بلا تغیر و تبدل پیش کیا گیا ہے اس افسانے میں نام نہاد پیروں کا پول کھولا گیا ہے جو اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے لوگوں کی مرادیں پوری کرنے کا کھوکھلا اور بے بنیاد دعویٰ کرتے ہیں اور سادہ لوح لوگ ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دوسرا افسانہ ''امر پریتم'' ہے جو رومانوی افکار کا علمبردار ہے جس میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری حدِ کمال کو چھو رہی ہے وہ تسلسل اور روانی ہے جس سے پہلو بہ پہلو جاذبیت اجاگر ہوتی ہے بین السطور کہیں بھی قاری کو سرسری گزر جانے کی اجازت نہیں ملتی خیالات کا تانا بانا زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑا ہوا اور پیوست ہے اس میں حب الوطنی کے جذبات و احساسات بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں جس سے یہ جانکاری ہوتی ہے کہ افسانہ نگار کے شعور کی جڑیں اس کی اپنی دھرتی میں ہی پیوست ہیں اور اس کے افکار میں اپنی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے جو اس کی فکر کو پریشانی کی نذر نہیں ہونے دیتی کہیں کہیں مذہبی خیالات کا ورود اور اسلامی تعلیمات کے احساسات بھی رونق افروزی کرتے نظر آتے ہیں اس میں کرب کا ایک لطیف احساس بھی ہے اس افسانے میں انتھک جوش اور ولولہ بھی اولوالعزمی کا مظہر ہے شہداء سے محبت اس میں جلوہ گر ہے ازدواجی زندگی کا حسن بھی موجود ہے اس میں ہندی لفظیات کی مٹھاس بھی پائی جاتی ہے حادثات کا مذکور بھی ہے اور سنبھلنے کی سعیٔ پیہم بھی ہے مجموعی طور پر یہ افسانہ نادر النظیر افسانوں کی فہرست میں شامل ہونے کا استحقاق رکھتا ہے۔

''سفر آرزو'' چوتھا افسانہ ہے جس کا عنوان ان کے پہلے افسانوی مجموعے کے نام پر رکھا گیا ہے بنیادی طور پر اس کی فضا رومانوی ہے۔ اس میں ثقافتی پہلو بھی اجاگر کیئے گئے ہیں قرآن و حکمت کی باتیں بھی ہیں افسانہ نگار کے اندر کا شاعر بھی کہیں کہیں شعر کے ساتھ حاضر ہو کر دلچسپی کو دوبالا کر دیتا ہے عمومیت اس افسانے کا وصفِ خاص ہے۔

''بنتِ صحرا'' مجموعہ ھذا کا چھٹا افسانہ ہے جس میں مصنف کے سوانحی خاکے بھی ہیں اور اس کی دلچسپیوں کا مذکور بھی ہے دیسی بدیسی روایات کا احوال بھی ہے اور نسائی نفسیات کی جھلک

بھی شامل ہے علم ودانش کے قصے بھی ہیں عقل وشعور کی کرم فرمائیاں بھی ہیں۔

''کنفیوژن'' نواں افسانہ ہے جو روح عصر کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے حقیقت حال سے باخبر کرتا ہے حالات کی آشوب زدگیوں کا برملا اظہار بھی ہے اور اس میں سیاحت کا سواد بھی شامل ہے۔ زندگی کی حقیقی تصویریں بھی ہیں۔

پروفیسر اقبال ندیم کے اس افسانوں مجموعے کے مطالعہ کے بعد یہ راز منکشف ہوا کہ موصوف فنِ افسانہ نگاری کا گہرا درک رکھتے ہیں زبان و بیان کے حوالے سے بھی ایک قادر الکلامی پائی جاتی ہے ان کے افسانے میں آغاز تا انجام کہیں بھی دلچسپی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا وہ ایک منجھے ہوئے افسانہ گار ہیں اگر اسی تواتر سے ان کا سفر جاری وساری رہا تو ان کا افسانہ ان کو اس سے کہیں آگے لے جائے گا مجموعہ ھذا کے تمام افسانے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

ارشد محمود ارشدؔ کا شعری عمق

اقلیمِ سخن قلب وخرد کے حسیں افکار و خیالات سے عبارت ہے جذبات و احساسات میں حسن و خوبی کی پیوند کاری مختلف اسالیب سے کی جاسکتی ہے اور پیرائے اظہار کا ہر انداز خود میں احساسِ دلفریبی رکھتا ہے بشرطیکہ اسلوبیاتی ضابطوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے یہ امر لابدی ہے کہ اسلوب جس قرینے کا حامل ہو اسے اسی زاویے سے دیکھا جائے کیونکہ اگر سادہ اور سہلِ ممتنع ہو تو اس حوالے سے خصائص کو مدنظر رکھا جائے اگر دقیقہ سنجی کا وصفِ خاص رکھتا ہو تو اسے اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے جہاں تک فکری زاویوں کا تعلق ہے تو سخن گستر پاسدارِ قلب و خرد ہونا چاہیے اگر اس کا شعری میلان کسی خاص طرف واضح جھکاؤ رکھتا ہے تو وہ اچھا شاعر تو کہلائے جانے کا استحقاق رکھتا ہے لیکن اس پر اعلیٰ درجہ کے فنکار کی سجل ثبت نہیں کی جاسکتی افکار میں گیرائی و گہرائی کے لئے ناگزیر ہے کہ ارفع قوتِ متخلہ اور وجدانی صلاحیتیں حاصل ہوں تو پھر کلام شعری عمق سے ہم آغوش ہوگا شذرہ ھذا میں ہم ارشد محمود ارشدؔ کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں ان کا تعلق دبستانِ سرگودھا سے ہو جو اعلیٰ شعری و ادبی روایت کا امین بھی ہے جس نے شعر و ادب کی مہان ادبی شخصیات کو جنم دیا اور ایک ادبی دبستان کا درجہ رکھتا ہے اپنے اس مضمون میں ہم ارشد محمود ارشدؔ کے تیسرے شعری مجموعہ ''شام کی دہلیز پر'' مطبوعہ جنوری 2014ء کے ثلث اول اور دوم کی غزلیات کے منتخب اشعار ان کے شعری عمق کے حوالے سے بطور استشہاد برائے تجزیہ سپردِ قرطاس کرتے ہیں واضح رہے قبل ازیں 2007ء میں ''عجب سی بے قراری ہے'' اور پھر 2009ء میں ''کبھی میں یاد آؤں تو'' کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں ان کے آخر الطباعت مجموعۂ کلام سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا

ہے کہ ان کا فکری ارتقاء حوصلہ افزا ہے کیونکہ پہلے دو مجموعوں میں موضوعاتی اعتبار سے رومان کا رنگ فزوں تر رہا ہے جبکہ ''شام کی دہلیز پر'' میں رومان کے علاوہ حیات و کائنات کے کچھ دیگر موضوعات بھی پائے جاتے ہیں یوں ان کا فکری کینوس وسیع تر ہو گیا ہے جو حوصلہ افزا ہے

ان کی غزل کا ایک شعر لائق توجہ ہے

جلتے خوابوں کو اشکوں سے ٹھنڈا کیا
دل سے اٹھنے لگا ہے دھواں خیر ہو

شعرِ مذکور کتھارسس کا ایک عمیق حوالہ خود میں سموئے ہوئے ہے صبر و تحمل کی داستان ہے جو عندالبیان ہے محرومیوں اور حسرتوں کی بازگشت ہے جو سنائی دیتی ہے اس شعر میں ایک رجائی اور استدعائی فضا بھی کارفرما ہے زورِ بیان اور تاثیر کی فراوانی ہے اتنے بسیط فکری زاویوں کا شعر کے مختصر پیمانے میں اہتمام کرنا فکری بالیدگی کی بیّن دلیل ہے

آخر خود کو یہ سمجھانا پڑتا ہے
دل والوں کے بیچ زمانہ پڑتا ہے

مطلع ھذا حقیقت پسندی، مصلحت اندیشی اور خرد آموزی کی عمدہ تمثیل ہے جس سے شاعر کا وجدانی شعور چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ادراک کی بالادستی کا مظہر بھی ہے اگرچہ تخیل روایتی نوعیت کا ہے لیکن پیشکش کا انداز خالصتاً فطری ہے جو خود میں اثر افرینی کی خصوصیت رکھتا ہے۔

کب تک رہے گا ریشمی زلفوں کے جال میں؟
اس قید سے نجات کی گرہیں تلاش کر
ارشدؔ تو اپنی زیست کے پاتال میں اتر
اس اجنبی حیات کی گرہیں تلاش کر

غزل کے اس شعر اور مقطع میں شعوری ارتقا کا واضح عمل دکھائی دیتا ہے جو ان کی بالغ نظری کی طرف واضح اشارہ ہے جس میں ان کے تجربات و مشاہدات کی واضح جھلک محسوس کی جاسکتی ہے آموزشِ حیات کے وسیع تر پہلو موجود ہیں جن میں رخسار و عارض کی قید معدوم ہو گئی ہے جو روایت سے جدت کی طرف اٹھنے والا قابلِ تحسین قدم ہے۔

کہا میں نے چراغِ دل کو آخر بجھ ہی جانا ہے
کہا اس نے مری راہوں میں کچھ تنویر رہنے دے
کہا میں نے چلو توڑیں زمانے کی یہ زنجیریں
کہا اس نے کہ پرکھوں کی بھی کچھ توقیر رہنے دے
کہا میں نے نئی راہیں تراشیں اب محبت کی
کہا اس نے یہ بے مقصد ہے سب تعمیر رہنے دے
کہا میں نے محبت کے صحیفے دل پہ اترے ہیں
کہا اس نے تو ان آیات کی تفسیر رہنے دے

یہ تمام تر مکالماتی نوعیت کی غزل ہے جس کے دو مرکزی کردار محبّ اور محبوب ہیں محبّ قلب وجنوں کا نمائندہ ہے جبکہ محبوب خرد و جفا کا ترجمان ہے یوں اس طریقے سے جنوں اور خرد کا حسیں امتزاج قائم کیا گیا ہے اس غزل کی تمام تر چاشنی انہیں امور کی مرہونِ منت ہے شاعرِ مذکور نے دونوں کرداروں کو حسنِ خوبی سے نبھایا ہے۔

اس لئے بھر بھری مٹی سے مجھ کو پیار ہے
خاک ہوں ہو جاؤں گا اس خاک میں تحلیل میں

ارشدؔ ایک دیش بھگت شاعر ہیں بلکہ دیش بھگتی ہونے پر فاخر و نازاں بھی ہیں اس لیے ان کے افکار میں وطن کی محبت اور بو باس رچی بسی ہے دیس سے ان کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے انسانی جنم حیات و مرگ کے دو استعاروں میں مقید ہے وہ ان دونوں تلازمات کے ڈانڈے خاک سے ملاتے ہیں اور یوں خود خاکی ہونے کا جواز بھی پیش کر جاتے ہیں

ایسا دریا ہوں جو کہ ہے سوکھا ہوا
آ کے ملتی ہے جس سے ندی مختصر

اس شعر میں تشبیہات کی قرینہ کاری دیدنی ہے جس میں محرومیوں اور حسرتوں کی بپتا بیان کی گئی ہے اس میں رومان کا لطیف حوالہ بھی پنہاں ہے۔

معرفت و مجاز کے حوالے کے حامل دو اشعار آپ کے ذوقِ طبع کی نذر ہیں۔

اسے کیوں در بدر ڈھونڈتا ہوں
بسی ہے جبکہ اس کی ذات مجھ میں
جو میری سوچ کا محور ہے ارشدؔ
دکھائی دے بسا اوقات مجھ میں

ان دو اشعار میں صنعتِ ایہام کا فطری التزام کارفرما ہے جنہیں معرفت و مجاز دونوں حوالوں پر منضبط کیا جاسکتا ہے عرفان و آگہی اور ادراکِ ذات کے خصائص نمایاں ہیں۔

اے شبِ تاریک تُو اُتر رہی ہے کس لئے ؟
ایک جگنو ہی بہت ہے روشنی کے واسطے

ان کے فکری کینوس میں صرف حزن و ملال، ہجر و وصال اور یاسیت ہی نہیں بلکہ عمیق رجائی امکانات بھی موجود ہیں جن کی جھلک اس شعر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس کارزارِ عشق میں اترو تو سوچنا
اس راہِ پر خطر میں ہزاروں کے سر گئے
ہاتھ میں آئینہ تھا مرے اور کچھ نہ تھا
ارشدؔ تمام شہر کے کیوں لوگ ڈر گئے

وہ معاملات اور ابنائے زمانہ کو انتقادی زاویوں سے دیکھنے کے قائل ہیں اس لئے ان کے ہاں ایک غیر جانبداری کا عنصر بھی کارفرما ہے ان کے فکری زاویے وسیع ہیں کیونکہ وہ حقیقت پسندانہ طرزِ فکر رکھتے ہیں۔

مشمولہ استشہادات و استخراجات سے یہ بھرپور غمازی ہوتی ہے کہ ارشد محمود ارشدؔ کی فکر و فن پر گرفت ایک ارتقائی انداز میں مضبوط ہو رہی ہے انہوں نے مختلف النوع بحور میں احسن طریقے سے مشاطگیٔ سخن کی ہے ہر قسم کے قوافی اور ردیفوں کو بخوبی برتا ہے جو ایک اعتماد کی فضا کی عکاس ہے ان کے فکری زاویے شعری عمق سے ہم آغوش ہیں مستقبل میں ان سے کچھ مزید نئے امکانات کی امید کی جاسکتی ہے اگر ان کی ریاضتِ سخن فرطِ تسلسل سے جاری رہی تو ان کا ریاضِ شعر ان کو اس سے کہیں آگے لے جائے گا۔

☆☆☆☆☆

انوار احمد علوی کی تبسم ریز تحریریں

عمومی مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ سنجیدہ ادب کی بجائے طنز و مزاح اور ظرافت زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوئی ہے۔ مقصدیت اور افادی پہلو بکثرت پائے جاتے ہیں ادب برائے ادب کے زمرے میں یہ طرزِ اظہار مفید اور متداول ہوتا ہے اس سے نہ صرف مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں بلکہ اس میں تفریح طبع کا ساماں بھی موجود ہوتا ہے اس طریقہ سے تہذیب و تمدن اور معاشرت و ثقافت کے خدوخال صحیح معنوں میں اجاگر کئے جاسکتے ہیں طنز و مزاح ایک مخصوص طبع کی متقاضی ہے جو ہر کہ ومہ کے بس کا روگ نہیں۔ ایک مزاح نگار حیات و کائنات کو مخصوص زاویوں سے دیکھتا ہے جس سے کئی طرح کے انکشافات ہوتے ہیں اس کے سوچنے کا رنگ ڈھنگ منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے اسلوب سادہ و شستہ اور مثالی نوعیت کا ہوتا ہے آج کے عصری آشوب میں بسورتے چہروں پر خوشگواری لانا' حزن و ملال میں جکڑے ہوئے لوگوں کو قہقہوں سے ہمکنار کرنا اور تلخ و سنجیدہ زیست میں تبسم سامانی کرنا کسی کار مسیحائی سے کم نہیں جو تفریح طبع بھی ہے تنقیدی انداز بھی ہے اور حقیقی مقاصد کا حصول بھی ہے شذرہ ھذا میں ہم انوار احمد علوی کی طنز و مزاح اور ظرافت نگاری کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کی نگارشات نے ایک بار پھر پطرس بخاری کی یادوں کو مہمیز دی ہے جن کی طنز و مزاح' ظرافت نگاری اور بذلہ سنجی لائق تحسین و ستائش ہے جن کے مزاحیہ شخصی خاکوں اور تجزیوں کا مجموعہ ''نامعلوم افراد'' مطبوعہ جولائی 2013ء ہمارے زیرِ نظر ہے جس میں کل اٹھارہ خاکے شامل ہیں قبل ازیں ان کی چار کتب ''جملہ حقوق غیر محفوظ (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)''، ''مس گائیڈ (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)''، ''سود کے تعاقب میں (ظریفانہ اسلوب میں مستقل کتاب)''

شبیر ناقد

اور "غالب کا دستر خواں (پیرو ڈی خطوط غالب)" منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ان کی اوّل الذکر کتاب کے سُدس اوّل کو جس میں تین مزاحیہ خاکے شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔ مذکورہ کتاب کا نام بھی سیاق وسباق کی روشنی میں خوب جچ رہا ہے جو ان کی طنز و مزاح اور ظرافت کا غماز ہے۔

کتابِ ھذا کا اوّلین خاکہ "اور اب ہماری امی" سے موسوم ہے جس کے دقتِ نظر سے مطالعہ کے بعد قاری داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے بیان بھرپور اور دل آویز ہے تمثیلات کی دلکشی اپنی بہار دکھاتی نظر آتی ہے جس سے مصنف مذکور کی بالیدہ فکری اور ذہانت و فطانت عیاں ہوتی ہے اور حقیقی زندگی کا عمیق و بسیط شعور جلوہ نما نظر آتا ہے تہذیب و تمدن اور معاشرت و ثقافت سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس میں گھر گرہستی کے ادراکات بھی لائقِ اعتنا ہیں ان کے پیرائیہ اظہار کی دلفریبی اولین اقتباس میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

"اور اب ہماری امی جن کی شخصیت میں آپ کو یقیناً اپنی امی کی صورت نظر آئے گی کیونکہ ہماری عمر کے لوگوں کی مائیں کم و بیش ایسی ہی ہوا کرتی ہیں سرکار کے کماؤ محکموں میں ایماندار لوگوں کے لیے چھوٹے شہر موزوں سمجھے جاتے ہیں ہمارے والد صاحب بھی ایسے ہی محکمے کے دیانت دار ملازم ہونے کی وجہ سے ساری زندگی ایمانداری کا خمیازہ بھگتتے رہے اور زیادہ تر چھوٹے شہروں میں تعینات کیے گئے ورنہ ہم جیسے لوگ ایماندار اس لئے کہلاتے ہیں کہ خیانت کرنے کے مواقع میسر نہیں آتے جس طرح محمود غزنوی ہندوستان پر تیس سال میں سترہ حملوں کے بعد کامیاب ہوا اس طرح وہ تیس سال سترہ تبادلوں کے بعد ریٹائر ہوئے اس ناانصافی کے خلاف امی نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ بار بار رخصت ہوتی رہیں ہوسکتا ہے نکاح کے بعد رخصتی میں کوئی رسم رہ گئی ہو جس کا ازالہ قدرت نے یوں فرما دیا اگر وہ خفا ہو جاتیں اور روز روز نئی جگہ جانے سے انکار کر دیتیں تو عین ممکن تھا کہ والد صاحب کے قدم لڑکھڑا جاتے مگر وہ ڈٹی رہیں اور حوصلہ نہ ہارا اگر ان کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنے میکے میں جا بیٹھتی۔

نامہ بر ان کی میں غلام نہیں
جا کے کہہ دے، قمر نہیں جاتی

وہ اپنے سماج کے معائب و محاسن پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں اس لئے ان کے ہاں بھرپور نوعیت کے تنقیدی رویے ملتے ہیں طنز و مزاح اور ظرافت کی چاشنی ان کے سوا ہے عمرانی نقطۂ نگاہ سے ان کی نگارشات کا مطالعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

مذکورہ کتاب کا دوسرا خاکہ "باتیں حفصہ کی" ہے جس میں مصنف کے تین بچوں عمیر، سارہ اور حفصہ کی خاکہ نگاری کی گئی ہے جس میں تینوں بچوں کے عادات و معمولات و خیالات کا طنز و مزاح کے انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے ان کی طرفہ طباع کو اشکار کرنے کی سعی جمیل کی گئی ہے جس میں قاری کے لئے دلچسپی کے شواہد ہیں اس خاکہ سے اقتباس ملاحظہ کریں جس سے مصنف کی سنجیدگی اور مزاح کی جھلک ملتی ہے اور انداز کلانگس نوعیت کا ہے۔

"ایک بار سارہ نے ہم سے فرمائش کر ڈالی ہم نے کہا' ہم غریب ہیں" تمہاری یہ خواہش کہاں پوری کر سکتے ہیں" وہ بجھ سی گئی ہمیں سخت ملال ہوا اور اسے بہلانے کی غرض سے شام کو سیر و تفریح کا پروگرام بنایا اہلیہ نے سارہ سے تیار ہونے کو کہا تو انتہائی معصومیت سے بولی" آپ لوگ چلے جائیں مجھے غریبوں کے ساتھ گھومنے نہیں جانا"

بہر حال یہ بھرپور خاکہ ہے جو بچوں کے لئے خصوصی دلچسپی کا حامل ہے جس میں بچوں کی معصومانہ شرارتیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

تیسرا خاکہ "یاجوج ماجوج" جو نام کے اعتبار سے منفرد ہے جو زیست کی طرفہ تصویروں کو منعکس کرتا ہے جس میں طنز و مزاح اور ظرافت کے انداز میں زندگی کے مختلف شعبہ جات کی تلخیوں کی عکاسی کی گئی ہے جس میں تنقید کا ایک بھرپور انداز پایا جاتا ہے۔

الغرض انوار احمد علوی کی یہ کتاب ایک دلچسپ سوغات کا درجہ رکھتی ہے جس کے مطالعہ سے قاری حیات کے بسیط ادراکات سے ہم کنار ہوتا ہے جس میں اصلاح معاشرت کے زبردست امکانات پر کشش پیرائیہ اظہار میں ملتے ہیں اس نوع کی کتب کے مطالعہ سے کتاب دوستی کو تقویت ملتی ہے۔

☆☆☆☆☆

میرے شہر کی کہانی.....ارم زہرا کی زبانی

بعض شخصیات عمیق حسیات کی حامل ہوتی ہیں جنہیں مجسم اور مجرد احساس کہنا چاہیے غور و خوض اور تفکر و تدبر کے عوامل ان کے شخصی خصائص کا حصہ ہوتے ہیں وہ ایک چلتے پھرتے مائیکروفون کی مانند ہوتی ہیں وہ زیست کے ہر جزو کا بغور مطالعہ و مشاہدہ اور تجزیہ کرتی ہیں اس لیے ان کا مطالعاتی اور تجزیاتی انداز جزئیاتی نوعیت کا ہوتا ہے جس سے کلی استخراجات بخوبی حاصل کیے جاسکتے ہیں شذرہ ھذا میں ہمارا موضوع بحث ارم زہرا کی کہانیوں کا مجموعہ "میرے شہر کی کہانی" مطبوعہ جنوری 2014ء ہے جس کی طباعت کا اہتمام "رنگ ادب پبلی کیشن کراچی" نے دیدہ زیب سرورق اور عمدہ درامدی نوعیت کے کاغذ کے ساتھ کیا ہے اگر کتاب ھٰذا کو رنگِ ادب پبلی کیشن کی شاہکار مطبوعات میں شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کتاب مذکور خود میں دلچسپی کے متعدد مظاہر سموئے ہوئے ہیں جو کل انتالیس کہانیوں پر مبنی ہے جس کے چار سو چونسٹھ صفحات ہیں اور یہ ادبی سوغات سات سو ٹمن میں دستیاب ہے دراصل کتاب ھٰذا اُن کی اُن کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ "سچی کہانیاں" ڈائجسٹ میں تواتر سے شائع ہوتی رہی ہیں ارم زہرا کا تعلق چونکہ کراچی سے ہے ان کہانیوں میں بھی شہر قائد کی آشوب زدگی اور اس میں ہونے والی دہشت گردی کو موضوع بیان بنایا گیا ہے ان سے جڑے ہوئے واقعات کو سچی کہانیوں کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے یہ تمام تر بیانیہ طرز کی کہانیاں ہیں جن میں انہوں نے اپنی ذات کو بھی کہانیوں کا حصہ بنائے رکھا گویا یہ ان کے مشاہدات کا بے تکلفانہ اظہار ہے مذکورہ کتاب کے حوالے سے محمد ایوب صابر، منزہ سہام اور ناصر رضا کی آراء ثبت ہیں تاثرات نگاروں میں شاعر علی شاعر، حمیدہ سحر اور راقم الحروف شامل ہیں۔

محمد ایوب صابر کتاب ھٰذا کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

''میرے شہر کی کہانی'' پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے انہوں نے خود کسی کربناک راستے سے اپنا سفر طئے کیا ہے جہاں ہر قدم پر پاؤں کانٹوں سے الجھتے ہوں وہاں جہد مسلسل سے چلتے رہنا ایک کارنامے سے کم نہیں انہوں نے ہر کہانی کو تحریر کرتے ہوئے کتنی دفعہ اپنی پلکوں کی منڈیر نشو پیر سے خشک کی ہوگی۔ کتاب مذکور کے حوالے سے معروف شاعر و نقاد اور مدیر و ناشر شاعر علی شاعر رقمطراز ہیں۔

''ارم زہرا کی نظر معاشرے میں رونما ہونے والے ان واقعات پر ہے جن پر توجہ نہ دی گئی تو وہ اس معاشرے کی تباہی کا باعث بھی بن سکتے ہیں اور کسی قوم وملت کے زوال کا سبب بھی ان کی کہانیوں میں نہ صرف سفاکی و درندگی پر مبنی واقعات کا بیان ہے بلکہ ان کے مسائل کا حل بھی پوشیدہ ہے اس قسم کے فن اور عمیق نظری کا شمار ارم زہرا کی انفرادیت میں ہوتا ہے اور یہ انفرادیت ارم زہرا کو ان کی ہم عصر خواتین سے ممتاز و منفرد کرتی ہے۔''

ان کی کہانیوں کے اس مجموعہ کے سُدس اول کا انتقادی جائزہ زیب قرطاس ہے جس میں چھ کہانیاں شامل ہیں۔

''رسموں کے غلام'' ان کی اولین کہانی ہے بقیہ تمام کہانیوں کی طرح اس کا آغاز بھی معمولاتِ حیات سے ہوتا ہے اس کہانی میں جمیلہ اور اکبر شاہ دو مرکزی کردار ہیں جمیلہ جدید طرز حیات کی نمائندہ لڑکی ہے جس میں روشن خیالی اور جدت پسندی وفور سے پائی جاتی ہے اس کے مقابلے میں اگرچہ اکبر شاہ کا تعلق مضافاتی اور قبائلی معاشرت سے ہے جو قدامت پرستی کا حوالہ گردانی جاتی ہے لیکن شہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باعث وہ بھی جدت پسند خیالات کا حامل ہے یوں ان کی ایک ذہنی ہم آہنگی بن جاتی ہے اگرچہ اس کہانی کے شروع میں اخبار کی ایک خبر کی بدولت دہشت گردی کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے جو کہانی میں تھوڑی دیر تک چلتی ہے اس کے بعد کہانی میں رومان کی حاشیہ آرائی شروع ہو جاتی ہے جمیلہ اور اکبر شاہ کے کردار رومانوی نوعیت کے ہیں جن کے باعث رومانویت کی چاشنی پائی جاتی ہے کہانی کا اسلوب، زبان و بیان فطری، برجستہ اور بے تکلفانہ نوعیت کا ہے جس کے باعث بناوٹ اور تصنع کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں ان کی اسلوبیاتی رعنائی کے استشہاد کے طور پر ایک اقتباس نذر قارئین ہے۔

''اکبر شاہ وہ پہلا لڑکا تھا جس نے جمیلہ کے در دل پر دستک دی تھی اور جیسے وہ بھی بے دھیانی میں کھول بیٹھی تھی ورنہ تو وہ لڑکوں سے دور بھاگتی تھی کالج میں کتنے ہی لڑکے اس کی دوستی کے خواہاں تھے مگر وہ خامشی سے نظریں جھکائے اپنا راستہ ناپتی ''نو لفٹ'' کا سگنل دیتی نکل جایا کرتی لیکن جب سے اکبر شاہ جمیلہ کی کلاس میں آیا تھا اس کے لئے جمیلہ کے دل میں نرمی کا گوشہ اپنے آپ جگہ بناتا چلا گیا تھا شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اکبر شاہ لیٹ ایڈمیشن تھا اب تک اس کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی اس لئے اس نے کلاس کی سب سے لائق فائق لڑکی جمیلہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو وہ انکار نہیں کر سکی اور پڑھائی کے سلسلے میں اس کی مدد کرنے لگی نوٹس کے ساتھ جذبات و احساسات اور نظروں کا تبادلہ بھی شروع ہو گیا تب جمیلہ کو احساس ہوا کہ متاثر ہونے کا یہ احساس دو طرفہ ہے اور یوں ان کی دوستی کی کونپل یونیورسٹی کے زیر سایہ نمو پانے لگی۔''

جمیلہ اپنے نظریات و خیالات کی بدولت قبائلی رسم و رواج کو ہدف تنقید بناتی رہتی ہے جسے اکبر شاہ خاموشی سادھے سنتا رہتا ہے خوشگوار اور رومانی اثرات کے تحت ان کی دوستی محو سفر رہتی ہے کہ اچانک کہانی ایک نیا رخ بدلتی ہے ایک عذرا نامی لڑکی جس نے پسند کی شادی کی تھی اور جمیلہ حسن اتفاق سے اس کی ہم شکل تھی عذرا کے مغالطے میں اس کا چچا سجاد غیرت کے نام پر جمیلہ کا قتل کرا دیتا ہے اور یوں اپنی قبائلی غیرت کی آگ ٹھنڈی کرنے کا سامان کرتا ہے یوں اکبر شاہ کے خوابوں اور امنگوں کا محل دھڑام سے گر جاتا ہے یوں کہانی کا اختتام حزینہ اور المیہ انداز میں ہوتا ہے کہانی کا نام اس کے موضوع کی مناسبت سے خوب جچ رہا ہے مجموعی طور پر فطری نوعیت کی کہانی ہے جو بہترین کہانیوں کی فہرست میں شامل کئے جانے کا استحقاق رکھتی ہے۔

''آخر قصور کیا تھا؟'' مجموعہ ھذا کی دوسری کہانی ہے اس کا عنوان بھی ایک مکمل کہانی کا درجہ رکھتا ہے جس میں کلثوم نامی خاتون کی بپتا بیان کی گئی ہے جس کی یکے بعد دیگرے تین شادیاں ہوئی ہیں اور تینوں مرد سفاک اور ظالم ثابت ہوتے ہیں بالآخر انجام اس کی بھیانک موت پر ہوتا ہے اس کہانی میں مردوں کے ظلم و ستم ان کی سفاکیت اور ظلم و بربریت کو بھرپور طریقے سے بیان کیا گیا ہے جس سے مرد حضرات کی لو بھی طبیعت اور خود غرضی کی برملا عکاسی ہوتی ہے۔

''چہرہ بنا سوال'' یہ اس کتاب کی تیسری کہانی ہے جس کا آغاز ایک سڑک حادثے سے ہوتا ہے فرح اور فیصل اس کہانی کے کردار ہیں فرح ایک نرس ہے جس کا کام اور مقصد دکھی انسانیت کی خدمت کرنا ہے فیصل جب ٹریفک حادثے میں زخمی ہونے والے مریض کو اسپتال لاتا ہے تو اس کی ملاقات فرح سے ہوتی ہے جب فرح کو معلوم ہوتا ہے کہ فیصل زخمی شخص کو محض انسانی ہمدردی کے تحت لایا ہے اور اس کی زخمی ہونے والے فرد سے کوئی جان پہچان نہیں ہے تو فرح کے دل میں فیصل کے لئے مخلصانہ رویہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی یوں ان کی دوستی کا آغاز ہوتا ہے بعد ازاں ان کی شادی ہو جاتی ہے فیصل اپنے ہی گھر میں دہشت گردی کا نشانہ بن جاتا ہے یوں فرح سراپا سوال بن جاتی ہے وہ اپنے ننھے بیٹے کے ساتھ زندگی گزارتی ہے جو فیصل کی نشانی ہے یوں اسے سماج کی کج روی کا سامنا کرنا پڑتا ہے دہشت گردی کے تناظر میں لکھی جانے والی یہ کہانی خود میں ترقی پسند افکار کے شواہد بھی رکھتی ہے جو فیصل اور فرح کے روپ میں مشاہدہ کیئے جاسکتے ہیں۔

''دکھ دریا کے پار'' کتاب ھٰذا کی چوتھی کہانی ہے جس کا نام اس کے موضوع کی ترجمانی کرتا ہے اس کا آغاز پُر آشوب اور دہشت زدہ انداز میں ہوتا ہے جو اس کہانی کی روح رواں ہے جس سے عصری حالات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے کہ انسان کے اندر غیر محفوظ ہونے کا احساس قوی تر ہوتا جارہا ہے جس کے باعث سوچ کے زاویوں میں مہیب نوعیت کی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی ہے کلاسیکی اور پر امن عہد کا فرد کچھ اس انداز میں سوچتا ہے جس سے ایک عافیت کا اظہار ہوتا ہے کوئی خوف اور کوئی واہمہ دامن گیر نہیں ہوتا انسان کھلے آسمان کے نیچے اپنی من مرضی کی زندگی بتاتا ہے کہیں آنے جانے یا کسی کے آنے جانے کے سلسلے میں کسی قسم کا جو کھم روا نہیں ہوتا خوشیوں اور امنگوں کی فضا میں جیون سانس لیتا ہے بقول شاعر

آ جائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا

لیکن عصر حاضر میں عدم تحفظ کا احساس اتنا پروان چڑھ گیا ہے کہ انسان اب دروازہ کھولنے کی بجائے بند کرنے کی تاکید پر مجبور و مصر ہے بقول راقم الحروف

غیر محفوظ اپنا جیون ہے
در کو اپنے کھلا نہیں رکھتے

اس کہانی میں عاشر' اس کی ماں اور اس کی بہن عدم تحفظ اور خوف وحراس کی تصویر بنے ہوئے ہیں یہ کہانی شہر کراچی کی بدامنی کا صحیح منظر نامہ پیش کرتی ہے کہانی کے آخر میں حب الوطنی اور ہمت وحوصلے کے جذبات واحساسات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے ترقی پسند افکار بھی ضو پاشیاں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

''کہانی کی تلاش'' پانچویں کہانی ہے جس میں مصنفہ کی حساسیت واضح طور پر مشاہدہ کی جاسکتی ہے اس میں مختلف کہانیوں کے مختصر لفظی خاکے پیش کئے گئے ہیں یوں بہت سی کہانیوں کو اجمالی انداز میں متعارف کرایا گیا ہے جس سے ان کی انسان دوستی کی عکاسی ہوتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتی ہیں اور دردمند جذبات کی امین ہیں۔ پاسدار خلوص ومروت ہیں جس سے ان کی دوررس نگاہی کی جھلک ملتی ہے۔

''خواہشوں کا بھنور'' یہ چھٹی کہانی ہے کہانی لفظ کا نام بھی اس کے موضوع کی طرف واضح اشارہ ہے جس کا آغاز خوشگوار رجائی اور طربیہ انداز میں ہوتا ہے کہانی کا پلاٹ عمدگی کا مظہر ہے جس میں کلاسیکی اور جدید نوعیت کے کردار سامنے لائے گئے ہیں حیدر شاہ غازی کے مزار پر ہونے والی دہشت گردی کے نتیجے میں حیدر بم دھماکے میں شہید ہو جاتا ہے اس کی بیوی' بچہ اور ماں افسوس وحیرت کی تصویر بنے بے یارومددگار رہ جاتے ہیں۔

مشمولہ استخراجات سے یہ یقین بخوبی ہو جاتا ہے کہ ارم زہرا نے اپنی کہانیوں میں شہر قائد کی بدامنی کو واضح اور نمایاں طور پر پیش کیا ہے ان کی کہانیاں ان کی تخلیقیت کی پیداوار نہیں بلکہ حقیقی نوعیت کی ہیں یوں ان کی کتاب ''میرے شہر کی کہانی'' ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ہے جب بھی کراچی کے پرآشوب عہد کی تاریخ لکھی جائے گی تو ارم زہرا اور اس کی یہ کتاب ایک معتبر حیثیت اور حوالے کی حامل ہوگی وہ کہانی کے فن پر دستگاہ رکھنے والی کہانی نویس ہیں ان کی کہانیوں کے پلاٹ فطری اور فنی چابکدستی کے شاہکار ہیں ان کا اسلوب قاری کے ذہنی معیار سے ہم آہنگ ہے اس لئے قاری کہیں بھی اجنبیت کی فضا محسوس نہیں کرتا اگر کہانی افسانے اور ناول کے میدان میں ان کی ریاضت فرط تسلسل سے جاری وساری رہی تو ازمنۂ فردا میں افسانوی ادب میں نمایاں مقام ومرتبہ پانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

☆☆☆☆☆

ارشد عباس ذکی شاعرِ زیست و اُلفت

زندگی اور محبت کائنات کے کلیدی تلازمے ہیں جو جہاں کی روح رواں ہیں جن کی بدولت نبضِ حیات تپش آمادہ ہے یہ دونوں عناصر مختلف کیفیات سے عبارت ہوا کرتے ہیں محبت زندگی کی اساس ہے اور زندگی محبت امیز ہے اس لئے ان دونوں کی نفسیات میں گہرا ربط وضبط ہے ان دونوں کے رویئے اور معاملات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں حزن وملال حیرت واستعجاب، یاس وحسرت، نشاط وطرب اور عیش وعشرت یہ سارے جذبات واحساسات یہ مجملہ روپ سب حیات ومحبت سے مربوط ہیں جیون اور چاہت دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے راہِ حیات پر گامزن ہیں قبل ازیں راقم الحروف نے اپنے ایک شذرے میں رقم کیا تھا ''کائنات کا سرنامہ موضوع پریم ہے باقی سب موضوعات اس کے امدادی اور ذیلی عنوانات ہیں'' زندگی کے تمام شعبے محبت سے عبارت ہیں اور زندگی محبت سے ہم آغوش ہوئے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی شاعر جو ایک پیکرِ احساس اور پاسدارِ شعور ہوتا ہے مذکورہ امور کی آگہی سے مالا مال ہوتا ہے اور دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ سخنور اپنی فکر کی راہیں کیسے متعین کرتا ہے فکر کے فرسودہ راستوں کو جادۂ منزل بناتا ہے یا اپنی بصیرت اور قوتِ متخیلہ کی بدولت اپنے لیئے نئی راہیں متعین کرتا ہے اپنے افکار کو مثبت خیالات کے قالب میں ڈھالتا ہے انھی اصحاب تگ وتاز میں ایک نام ارشد عباس ذکی کا بھی ہے جس نے انتہائی قلیل عرصے میں اپنے آدرش میں بے پناہ ابلاغیت پیدا کی ہے اس کے ہاں زندگی ومحبت ہمہ گیر اور پہلو دار ہے اس کے جزبے نرول اور ندرت امیز ہیں اور اسلوب جاذبیت کی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے وہ دھیمے لہجے میں بات کرتا ہے جو دل کے تاروں کو چھو کر اور چھیڑ کر گزر جاتی ہے فکر وفن کی بالیدگی اس کا طرۂ امتیاز

شبیر ناوند

ہے ریاضِ سخن اس کی طاقتِ پرواز ہے اچھا فنکار ہونا اتنی عظمت کی دلیل نہیں ہوتا جتنی اچھی شخصیت ہونا باعثِ افتخار ہے وہ خلوص اور مروت کے حسیں احساسات سے مرصع ہیں اس کے کلام کے مطالعہ سے قلب وخرد پر خوشگوار اثرات نقش ہوتے ہیں تو اس سے ملاقات کا احوال تو کوئی ملاقاتی ہی بتا سکتا ہے شذرہ ھذا میں آج ہم اس کے مجموعہ کلام ''زندگی سے ملتے ہیں'' مطبوعہ مئی 2012ء کے منتخب کلام کا فکری وفنی تجزیہ پیش کرتے ہیں، واضح رہے کہ بعد ازیں مئی 2013ء میں ارشد عباس ذکی کا سلام کا انتخاب بعنوان ''میر انیس سے سرتاج سعید تک'' بھی اگست 2013ء میں منصۂ شہود پر آیا ملتان میں مقیم ہے اسٹیٹ لائف انشورنس میں خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ پبلی کیشن کا کام بھی کرتا ہے ادب کے فروغ اور ترویج میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ''سخن سرائے پبلی کیشن'' کے تحت بہت سی مطبوعات منظر عام پر لائی جا چکی ہیں۔

انسان دوستی شعرا کا فرضِ منصبی رہا ہے احترامِ آدمیت کسی سخن گستر کی پہچان ہوا کرتا ہے دوستوں کے لئے دستِ دعا دراز کرنا دوستی کے تقاضوں کا حصہ ہے لیکن دشمنوں کے لئے لبوں پہ حرفِ دعا رکھنا اسوۂ حسنہ کی دلیل ہے اس کے اس شعر میں اسی احساسِ زریں کی جلوہ سامانی دیکھتے ہیں۔

دوست آباد رہیں اور عدو شاد رہیں
ہاتھ زخموں کو لگاتے ہیں دعا کرتے ہیں

جہاں کے ناروا رویوں پر برہمی ایک فطری امر ہے اور انسان سراپا سوال بن جاتا ہے جب اسے کوئی جواب بجھائی نہیں دیتا تو پھر وہ مجبور بیاں ہو جاتا ہے اور اہلِ جہاں سے سبب دریافت کرتا ہے زندگی میں ہر طرح کے دکھ کا مداوا ممکن ہوتا ہے اور ہر زخم کی چارہ گری کے لئے مرہم ہوتا ہے لیکن زخمِ دوستی ہر قسم کے مداوا سے مبّرا و بے نیاز ہوتا ہے جو لازوال اور دائمی ہوتا ہے انہیں خیالات کی ترجمانی انتہائی سادہ و شستہ اسلوب میں بطور نمونہ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کسی پہ نہیں ہیں بوجھ مگر
لوگ کیوں بے رخی سے ملتے ہیں؟
ان کا مرہم نہیں زمانے میں
زخم جو دوستی سے ملتے ہیں

زندگی میں رجائی جذبے اور رویئے آبِ حیات کے مصداق ہوا کرتے ہیں جو کارزارِ حیات میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ زیست کی رعنائی اور جلوہ آرائی امید افزا امکانات پر منتج ہے عصرِ حاضر کا نوجوان فنکار یاست و قنوطیت کی ظلمت میں ڈوبا ہوا ہے اور اسے اپنی منزل کا دور دراز تک کوئی نشاں نظر نہیں آتا اور وہ اسی ذہنی تناؤ اور ڈپرشن کے دور میں نا آسودگیوں کو فروغ دے رہا ہے اس کے افکار نا اُمیدی کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں اس کا فن مجبوری اور معذوری کا پلندہ بن گیا ہے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے نئے سرے سے رجائیت کی آبیاری کی جائے تا کہ گلشنِ حیات میں رنگا رنگی، ہریالی آئے اور گلوں میں آس و امید کی چہکار آئے ارشد عباس ذکی کے افکار بھی اس امر کے آئینہ دار ہیں انہوں نے امید اور امکان کا حسین امتزاج قائم کیا ہے اور عمومیت کے پیرائے میں اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

اس کے قدموں میں یہی سوچ کے دل پھینک دیا
خوبصورت ہے وفادار بھی ہوسکتا ہے
اتنی جلدی نہ کرو ترکِ تعلق میں ذکی
بے وفا کل کو وفادار بھی ہوسکتا ہے

سماج میں دوہرے رویئے اور معیار پائے جاتے ہیں جہاں شرافت کے لبادے میں دہشت پنہاں ہے اور انسانیت منہ ڈھانپے بین کرتی دکھائی دیتی ہے مسیحاؤں نے جلادوں کا روپ دھار لیا ہے چارہ گر ستم گر بن گئے ہیں اچھائی نے اپنی پہچان کھودی اور برائی نے اپنی راجدھانی قائم کرلی۔ سخنور جو دردمند جذبوں کا امین ہوتا ہے اس ناروا سماجی رویئے کے بھید سے پردہ اٹھاتا ہے اس تناظر میں موصوف کی غزل کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے۔

جو بہاتا ہے سرِ عام غریبوں کا لہو
وہ یہاں صاحبِ توقیر بھی ہو سکتا ہے

جب ظلم و ستم معمول بن جائے جب جبر دستور کی حیثیت اختیار کرلے پھر جور و جفا کوئی طرفہ امر نہیں رہتا اور حیاتِ انسانی اسے قبول کرنے پر امادہ ہوجاتی ہے اس قسم کی آموزش ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔

سنگ باری سے پریشاں نہ ہو میرے حبیب
یہ تو اس شہر کا دستور بھی ہو سکتا ہے

گردشِ دوراں کے کئی روپ ہیں امتدادِ زمانہ کی بدولت زندگی شکست و ریخت کا شکار ہے تعمیری و تخریبی قوتیں مصروفِ کار ہیں۔ یہ سب کائنات تقدیر کے ہاتھ میں ہے کس نے کس حیثیت میں رہنا ہے اور کس نے کس مقام پر پہنچنا ہے خوف اور امید کے سائے ساتھ ساتھ چلتے ہیں کبھی خوف طاقتور ہو جاتا ہے اور کبھی امید غالب آجاتی ہے اسی خوف اور امید سے انسان کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے دنیا جائے مکافاتِ عمل ہے انسانی اعمال بھی مقام و مرتبے کو متعین کرتے ہیں اسکا اسی نوع کا شعر زینتِ قرطاس کرتے ہیں۔

کیا خبر کون ہو اب گردشِ دوراں کا شکار؟
حاکمِ شہر بھی ، مزدور بھی ہو سکتا ہے

جب شعوری اور لاشعوری طاقتیں یقین کی معیت میں عشق کے تابع ہو جاتی ہیں تو پھر عشق ایک لازوال طاقت بن کر سامنے آتا ہے اسی امر کا شعور ایک مثالی آگہی کا آئینہ دار اور علمبردار ہوتا ہے جس سے ایک مثبت طرزِ عمل وجود میں آتا ہے جسے کسی سخن دان کے فرخندہ نصیب ہونے کا عکاس کہا جاسکتا ہے۔ شاعرِ موصوف کا اسی نوع کا شعر نذرِ قارئین ہے۔

میں ابھی تک اسی یقین میں ہوں
عشق کر دے گا لازوال مجھے

عالمِ ہجراں حزن و ملال کی پر آشوب کیفیات سے عبارت ہوتا ہے جہاں عمومی طور پر امید کی رمق دور دور تک بعید از قیاس ہوتی ہے رجا کی شمیں روشن رکھنا، وصل کے خواب دیکھنا زندگی سے محبت کی دلیل ہے حیات و الفت کا یہ امتزاج انتہائی پر کشش اور روح افزا ہے اسی تناظر میں شاعر ممدوح کے تخیل کی کرشمہ کاری دیکھئے۔

وہ ایک شخص جو اپنا بنا کے بھول گیا
کبھی ملا تو اسے زندگی بنالیں گے

دوست و دشمن کی شناخت ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے دیدہ ور اور صاحبِ بصیرت شخص ہی اس معرکے میں کامیاب و کامران ٹھہرتا ہے یہ منزل اس کی ژرف نگاہی کا ثبوت بنتی ہے اور اس

کے ادراکات کے روشن امکانات کی بیّن دلیل ہوتے ہیں اس کیفیت کا غماز شعر دراتفات پہ دستک دے رہا ہے۔

پرکھا اسے تو وہ بھی مرے دشمنوں میں تھا
جس کا شمار مرے دوستوں میں تھا

زندگی کے اصل جلوے اور حقیقی نقاب کشائی مضافات میں ہی مشاہدے میں آتی ہے شہروں کی بھیڑ بھاڑ میں صنعتی شور شرابے میں حیاتِ انسانی ایک میکانی عمل بن کر رہ جاتی ہے جس میں اس کی تمام رعنائیاں اور جلوہ آرائیاں معدوم ہو جاتی ہیں انسان فطری طور پر، پُر امن اور پُر سکون زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے جو شہری زندگی میں عنقا اور محال ہے مضافات سے اس کے گہرے شغف کی عکاسی کچھ یوں ہوتی ہے۔

شہروں میں زندگی کی خبر ہے نہ چین ہے
جینے کا جو سکون تھا وہ بستیوں میں تھا

ارشد عباسی ذکی کے ہاں جہاں حمد و نعت کا قرینہ ہے وہاں سلام کا بھی سلیقہ ہے غزل کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھر پور قسم کی آزاد نظمیں بھی کہی ہیں سادگی تسلسل جزئیات نگاری اور محاکات نگاری جن کے خصائص ہیں ان کی نظمیں رومانویت اور جمالیات کا حسیں مرقع ہیں رومانوی افکار کی حامل اس کی نظم "محبت" کا نصف اول آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے زیبِ قرطاس کرتے ہیں۔

مرے دل میں محبت ہے
مری ہر سوچ پاکیزہ خیالوں سے سنورتی ہے
مرے وجدان میں تم ہو
مری آنکھوں میں جتنے خواب ہیں
وہ سب تمہارے ہیں
مرے ہر ذکر میں تم ہو
تمہیں تو علم ہے میری دعاؤں میں صداؤں میں

تمھارا نام رہتا ہے
مگر میں اک مسافر ہوں
سفر میرا مقدر ہے
مگر میں ہر سفر میں تیری یادیں ساتھ رکھتا ہوں
مسافر کے لیے زادِ سفر بھی تو ضروری ہے
مجھے اب لوگ کہتے ہیں
بڑی مدت ہوئی میں نے نہیں دیکھا تمہیں جاناں
مگر میں نے تو دیکھا ہے تمہیں پل پل
زمانہ یہ سمجھتا ہے کہ اب ہم مل نہیں سکتے
مگر ہم روز ملتے ہیں

اس کے علاوہ بھی ان کی بھرپور طرزِ فکر کی حامل نظمیں ہیں جو انتخاب کا استحقاق رکھتی ہیں مگر طولِ بیاں کا خوف دامن گیر ہے اسی لیے اسی پر ہی اکتفا موقوف ہے۔

ارشد عباس ذکی کی غزلیات میں زندگی کا حوالہ محبت سے قوی تر ہے جبکہ نظمیات میں رومان کے تندرست و توانا حوالے پائے جاتے ہیں مگر کہیں کہیں غزلیات و نظمیات میں یہ دونوں حوالے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں وہ دھیمے لہجے میں گہری رمز کی بات کر جاتے ہیں ان کا اسلوب سادگی کے رنگ کا حامل ہے انہوں نے سادہ نگاری کی روایت کو تقویت بخشی ہے۔ ان کے ہاں لاشعوری اور شعوری طور پہ دقیقہ سنجی سے گریز کی کیفیت پائی جاتی ہے وہ ابلاغ پر زور دیتے ہیں اس لئے ان کا کلام ابلاغیت سے معمور ہے وہ اپنے آپ کو فلسفیانہ موشگافیوں اور لسانی گورکھ دھندوں سے دور رکھتے ہیں اگر عروضی اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے مختلف بحور میں سخن گستری کی ہے زحافات کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے مذکورہ تصریحات کے علی الرغم ارشد عباس ذکی کے بہتر ادبی مستقبل کی نوید دی جا سکتی ہے بشرطیکہ پورے خلوص اور لگن کے ساتھ ریاضِ سخن جاری و ساری رہے۔

☆☆☆☆☆

اظہر رانجھا.....ایک معاشرتی کہانی نویس

کہانی انسان کی فطری اور نفسیاتی ضرورت ہے کیونکہ ہر انسان اپنے بڑوں سے کہانیاں سن کر اپنے بچپن کی حسیں لمحات بتاتا ہے کہانی ایک صنفِ ادب ہے جو ہر عہد میں تر و تازہ رہی ہے اور یہ یوں ہی سدا بہار رہے گی کسی بھی کہانی کی کامیابی اس امر میں ہے کہ وہ عصری تقاضے کس حد تک پورے کرتی ہے اور روحِ عصر سے کتنی مشابہت رکھتی ہے کس قدر اپنے معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے کہانی کے ابتدائی دور میں موضوعاتی اعتبار سے مافوق الفطرت کہانیاں لکھی گئیں جن کا بنیادی مقصد انسان کی تفریحِ طبع تھا مرور ایام کے ساتھ ساتھ انسانی افکار اور مقتضیات میں انقلابی تغیر رونما ہوا انسانی اقدار میں مغائرت کے باعث عصری رویّوں اور رجحانات میں بھی تغیر اتی عوامل اشکار ہوئے پھر کہانی کار کی توجہ تفریحِ طبع سے کچھ کم ہو کر تعلیم و تربیت اور پند و موعظت کی طرف زیادہ ہو گئی اس لیئے جدید کہانی میں تفریحِ طبع کی بجائے تعلیم و تربیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے چنانچہ وہی کہانی نویس مقبول و معروف ٹھہرے جو اپنی معاشرت سے جڑے رہے آج ہمارا موضوعِ بیان اظہر انجھا کثیف معاشرتی کہانی نویس ہے جنہوں نے اپنی کہانی کی تخلیق کے لئے اپنے اردگرد سے موضوعات و کردار لیئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی فطری نوعیت کی نظر آتی ہے ان کی کہانی ہماری معاشرت کی خوبصورت ترجمان ہے جس میں زندگی اپنے تمام تر محاسن و مصائب کے ساتھ سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور یہ کسی کہانی نویس کا کمالِ فن ہوا کرتا ہے شذرہ ھذا میں ہم ان کی کہانیوں کے مجموعہ ''قیدِ حیات'' مطبوعہ 2008ء کے حوالے سے رقمطراز ہیں کل دو درجن کہانیاں شامل ہیں ہم ان کی چار منتخب کہانیوں کو جو مجموعی طور پر اس کتاب کا ایک سُدس بنتا ہے شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔

شبیر ناقد

کتابِ ھذا کی پہلی کہانی "پیر بابا" ہے کہانی کا آغاز انتہائی بھرپور انداز میں ہوتا ہے جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ کہانی کی فکری کی اڑان آسمان کی وسعتوں سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہے جس میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری عمق کے ساتھ پائی جاتی ہے اسلوب کی جاذبیت حدِ کمال کو چھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے استشہاد کے طور پر مذکورہ کہانی کا اولین اقتباس ملاحظہ کریں جس میں متذکرہ بالا تمام خصائص بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

"آفتاب کی پہلی کرن فضائے بسیط پر پھیل کر دنیا کو نویدِ صبح کا پیغام دے رہی تھی مشرق کے پردے سے نکلتا ہوا سورج سفر کا آغاز کر رہا تھا پھولوں اور پھلوں سے ڈھکے ہوئے اونچے درخت اور ان کے درمیان مقبرے کا دودھیا گنبد بہت سندر دکھائی دے رہا تھا مختصری آبادی کے اس گاؤں کے شمال مشرق میں واقع مزار پر لوگوں کا بندھاتا تانتا عجیب سماں پیش کر رہا تھا ٹھیک دو دن بعد اس علاقے کی تمام رونقیں اس مزار پر سمٹ آئیں گی۔"

مذکورہ کہانی روایتی پیر پرستی کے گرد گھومتی ہے جس میں ہماری ان پڑھ معاشرت کی زبردست عکاسی کی گئی ہے مذہبی اور ثقافتی حوالے سے عمدہ تمثیلات ملتی ہیں اس کہانی میں پیر بابا کی زبانی روایتی پیر پرستی کی مذمت کی گئی ہے عصری حوالے سے اس کی حقیقت اشکار کی گئی ہے پیر بابا کی زبانی مذہبی افکار کی جھلک بھی ملتی ہے جو سراپا تصنع ہے موقع بہ موقع ارشادات نبوی اور اسلامی تعلیمات ضوفشانیاں کر رہے ہیں یہ ایک روایتی طرز کی کہانی ہے جیسے بیانیہ انداز میں رقم کیا گیا ہے جسے بہ الفاظ دیگر کی بجائے مصنف کی زبانی ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے معاشرتی اور ثقافتی حوالے سے یہ کہانی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

"ادھوری دوستی" اس کتاب کی دوسری کہانی ہے جو روایتی اور اور رومانوی طرز کی حامل ہے جس میں محبت کے حوالے سے مصنف کے معروضات بھی شامل ہیں زیست کے نشیب و فراز کا بیان زیشان ہے غلط فہمی کا کردار کلیدی نوعیت کا حامل ہے شمع نامی حسیں دوشیزہ کا کردار خصوصی اہمیت رکھتا ہے جو کئی رومانوی داستانوں کو جنم دیتا ہے خود غرضی اور مطلب پرستی کا استعارہ ہے جس سے زیست کی آموزگاری کا درس ملتا ہے۔

"غلط فہمی" اس مجموعے کی تیسری کہانی ہے جس کی بنیاد ایک غلط فہمی پر استوار کی گئی ہے

جس میں ایک ٹریفک حادثے کا مذکور ہے جس میں کہانی نویس سڑک پر زخمی حالت میں پڑے ہوئے عصری رویّوں کو ہدفِ تنقید بناتا ہے اس کہانی میں ایک سسپنس اور تجسس کی فضا پائی جاتی ہے جب کسی مسیحا نفس خاتون کے ذریعے اسے ہسپتال پہنچایا جاتا ہے تو اس کے ہاں امیدوں اور تمناؤں کا ایک نیا جہاں آباد ہو جاتا ہے وہ اسے محسن کے ساتھ ساتھ ایک محبوبہ کے روپ میں دیکھتا ہے حالانکہ وہ اسے اپنے بھائی کا ہم شکل سمجھتے ہوئے ہسپتال میں لے آئی تھی جو ایک ٹریفک حادثے کے نتیجے میں جاں بحق ہو گیا تھا جب اسے معاملے کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس کے رویے پر بہت افسوس کرتی ہے اس کہانی میں مردوں کی ایک فطری اور روایتی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے جس میں سبق آموزی کا گہرا تاثر موجود ہے۔

''شک کا زیور'' کتاب کی ترتیب کے اعتبار سے چھٹی کہانی ہے جو عمومی معاشرتی نوعیت کی ہے جس میں مردوں کی روایتی سوچ کی غمازی ملتی ہے جس سے ایک مرد کی شکی ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے جو اپنی بیگم کے پوتر جذبات کو تشکیک آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے حقیقت معلوم ہونے پر کفِ افسوس ملتا ہے۔

''تمام تر کہانیاں فنی اعتبار سے بیانیہ طرز کی ہیں۔ مصنف نے بہ الفاظ دیگر لکھنے کی بجائے اپنی ذات کو کہانی میں شامل رکھا ہے بہر حال اس کتاب میں نوک پلک سنوارنے کی ابھی کچھ گنجائش باقی ہے مذکورہ استخراجی تصریحات سے اس امر کو تقویت ملتی ہے کہ اظہر رانجھا کی کہانی کا فن فکری پختگی کا آئینہ دار ہے اگر ان کا تسلسل سے سفر جاری و ساری رہا تو ان کے ہاں بالیدہ فکری کے مزید آثار نمایاں ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

باقی احمد پوری کا طرفہ اندازِ سخن

طرفگیٔ سخن سے مراد کلام کا فکری اعتبار سے عمومی ڈگر سے ہٹ کر ہونا یعنی سخنور کے تخیلات کا غیر روایتی نوعیت کا حامل ہونا ہے جب شاعر کا اندازِ فکر غیر معمولی ہوگا تو اس کے بیان میں طرفگی کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے جس کے لازمی نتیجے کے طور پر جدت و ندرت کے مظاہر آشکار ہوتے ہیں بہت ہی کم شعرا کے ہاں ایسے شواہد پائے جاتے ہیں ایسے اصحاب فکر و نظر میں باقی احمد پوری کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے جنہوں نے اپنے شعری اظہار کے لئے عمومی افکار کو جادۂ منزل نہیں بنایا بلکہ فکر کی نئی راہیں تلاش کی ہیں ان کا تعلق سید خانوادے سے ہے اصل نام سید مقبول حسین بخاری ہے لیکن دنیائے ادب میں باقی احمد پوری کے نام سے مقبول و معروف ہیں 21 مارچ 1950ء کو احمد پور لمہ میں سید عبدالقادر بخاری کے گھر چشم کھولی ان کے والد گرامی سید عبدالقادر بخاری ایک درویش منش انسان تھے باقی احمد پوری کی شخصیت سازی میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا باقی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اردو کیا علاوہ ازیں میکینیکل کے شعبے میں ڈپلومہ آف ایسوایٹ انجینئر بھی ہیں ادبی حوالے سے ان کا تعلق حضرت علامہ ماہر القادری کے حلقۂ تلمذ سے ہے جن کا شمار پاک و ہند کے ممتاز و منفرد نعت گو شعرا میں ہوتا ہے موصوف دشتِ سخن کا ایک بسیط سفر طے کر چکے ہیں ان کے تادمِ تحریر دس شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر اربابِ نقد و نظر اور قارئین شعر و سخن سے خراجِ تحسین کی دولت سمیٹ چکے ہیں باعثِ طمانیت امر یہ بھی ہے کہ فارسی میں بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں ان کا فارسی کلام بھی ان کے اردو شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے اسلوبیاتی اعتبار سے ان کے ہاں فارسی لفظیات کا چلن بھی کہیں کہیں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا

ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اپنے کلام کو فارسیت امیز بنانے کی کوشش نہیں کی اس لئے ان کے کلام پر فارسیت کی چھاپ نہیں ہے ان کے مجموعہ ہائے کلام کے نام حسب ذیل ہیں۔

1۔ باقیات
2۔ نقشِ باقی
3۔ صدر شکِ غزالاں
4۔ اب شام نہیں ڈھلتی
5۔ محبت ہمسفر میری
6۔ غزل تم ہو
7۔ اداسی کم نہیں ہوتی
8۔ اگر آنکھیں چھلک جائیں
9۔ روانی
10۔ ہمارا کیا ہے؟

اول الذکر تین مجموعوں کا انتخاب ''اب دل ہی نہیں لگتا'' سے موسوم منظرِ عام پر آ چکا ہے، علاوہ ازیں متعدد کتب بھی مرتب کر چکے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

1۔ دھوپ کے شاعر
2۔ غزل نامہ
3۔ بین الاقوامی اردو شاعری
4۔ غزل آشنائی
5۔ غزل آفرینی
6۔ غزل فہمی
7۔ ہمارے شاعر (حصہ اول و دوم)
8۔ جدید غزلیں

ان کے مجموعہ ہائے کلام اور مرتب کردہ کتب کو اگر دیکھا جائے تو وہ ایک طویل ادبی

مسافت طے کر چکے ہیں تنقیدی اکائی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے آخر الطباعت شعری مجموعہ ''ہمارا کیا ہے؟'' مطبوعہ ستمبر 2011ء کے نصف اول کی غزلیات کے منتخب اشعار برائے استشہادات شامل تجزیہ کرتے ہیں کتاب ھذا سراپا غزل ہے جس میں تمام تر غزلیات شامل ہیں جس سے حضرت باقی کی غزل سے موانست کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک غزل کا مطلع قابلِ غور ہے

اپنا الگ جہان بناتا ہے کوئی کوئی
دھرتی کو آسمان بناتا ہے کوئی کوئی

جناب باقی کے تخیلاتی کینوس میں کلاسیکیت رچی بسی ہوئی ہے اس لیے وہ تاریخ پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور وہ مشاہیر کو منفرد انداز میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جسے وہ اپنے قاری کے لئے ذریعۂ آموزش بناتے ہیں مطلع بالا میں بھی انہوں نے اپنی دھرتی کے تابندہ کواکب کو بھرپور طریقے سے داد و تحسین سے نوازا ہے ان کی پیش کش کا انداز غیر عمومی نوعیت کا ہے'' ہے کوئی کوئی'' کی ردیف بھی اسلوبی رعنائی پیدا کر رہی ہے۔

غزل کا ایک شعر آپ کے ذوقِ طبع کی نذر ہے

ہزاروں لوگ ملتے ہیں جنہیں میں بھول جاتا ہوں
مگر تجھ سے تعلق غائبانہ یاد رہتا ہے

شعرِ ھذا میں صنعتِ ایہام کا فطری التزام ہے اس کو معرفت و مجاز ہر حوالے پر منضبط کیا جاسکتا ہے جس کے باعث سخن میں طرفگی کا عنصر در آیا ہے ایک گہرے فلسفے کی بات کو انہوں نے انتہائی آسانی سے بیان کر دیا ہے جس سے ان کی تخیلاتی دستگاہ کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک طرزِ فکر کا حامل مطلع دیدنی ہے

شام ہوتی ہے تو ہم گھر سے نکل جاتے ہیں
اور کچھ دیر کو غم گھر سے نکل جاتے ہیں

مذکورہ شعر سے ان کی منفرد شعری اپج اشکار ہو رہی ہے شام کو محض اس لئے گھر سے نکلنا

کہ کچھ دیر کے لئے غم گھر سے نکل جائیں گے ایک ندرت امیز امر ہے اسلوب انتہائی سادہ و شستہ اور سہلِ ممتنع کے رنگ کا حامل ہے مصرعوں کے دروبست میں ایک فطری قرینہ کاری کارفرما ہے جو ہر قسم کے تصنع سے مبرا و ماورا ہے انہوں نے عند البیان سادہ نگاری کی روایت کو تقویت بخشی ہے۔

انسان دوستی کے حوالے کا حامل شعر طالب التفات ہے

اپنے لوگوں پہ ہی بس ہاتھ اُٹھے ہیں اپنے
ہم تو آپس میں ہوئے دست و گریباں جاناں

ان کے کلام میں انسان دوستی کے مظاہر وفور سے ملتے ہیں جابجا ترقی پسند افکار ضوفشانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس شعر میں بھی روحِ عصر کی ترجمانی عمدگی کے پیرائے میں ہوئی ہے اور مکارمِ اخلاق کا آدرش اس شعر کی روحِ رواں ہے عمرانی نقطۂ نگاہ سے بھی ان کے سخن کا مطالعہ خصوصی اہمیت رکھتا ہے یہ شعر حالاتِ حاضرہ کا خوبصورت منظر نامہ پیش کرتا ہے جس میں عصری روئیوں کا کرب بھی ہے اور آشوبِ زیست کی بپتا بھی شدومد سے موجود ہے۔

ان کی ناقدانہ فکر سے عبارت غزل کا مطلع نذرِ قارئین ہے

نظامِ دہر میں جو خامیاں ہیں
زمیں زادوں کی سب ناکامیاں ہیں

وہ حیات و کائنات کو انتقادی زاویوں سے دیکھنے کے قائل ہیں جو ایک سچے اور کھرے تخلیق کار کی پہچان بھی ہے مصائب ارضی کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنا اور ان کا حل تلاش کرنا قلمکار کا فریضۂ منصب ہے یہ شعر بھی اس سلسلے کی کڑی ہے جس میں بتایا جارہا ہے کہ انسان کے بہت سے مسائل اس کے اپنے ہی پیدا کردہ ہیں جو اس کی ناکامی کی دلیل ہیں اتنا عمیق تنقیدی اندازِ فکر شاذ ہی کہیں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

غزل کا ایک شعر دامنِ دل کھینچتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تو نے جو راہ دکھائی تھی وہ معدوم ہوئی
تیرے رستے سے ترے لوگ ہٹے جاتے ہیں

شاعرِ مذکور کا اعجازِ فن یہ ہے کہ وہ فطری انداز میں عارفانہ شواہد چھوڑ جاتے ہیں اس شعر میں بھی مشیت سے ایک مکالمے کی فضا پائی جاتی ہے بنی نوعِ انسان کی بے راہروی کا حوالہ ہے شعر کی فضا عرفان و آگہی سے مربوط ہے اور ابنائے آدم کو راہِ گم گشتہ کی بازیافت کرائی گئی ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ کریں

خرد کو بھی جنوں سے آشنا کیا
لیا ہے کام دل کا بھی دماغ سے

عام طور پر خرد اور جنوں الگ الگ مکتب فکر سمجھے جاتے ہیں لیکن حضرتِ باقی نے ان دو مکاتیب کا حسین امتزاج قائم کیا ہے لیکن جنوں کی بالادستی کو بھی برقرار رہنے دیا ہے۔

بقول راقم الحروف

خرد نے نبھائے ہیں کردار دل کے

خرد کا جنوں یا دل کے تابع ہو جانا بھی خرد کی ہزیمت کا ایک روپ اور کمزور ترین درجہ ہے خرد کے ساتھ یہ سلوکِ ناروا متقدمین و متوسطین اور متاخرین کے ہاں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اس لئے شعرا کو جنوں پیشہ بھی کہا جاتا ہے۔

خالص شعری مزاج کا ایک شعر زیبِ قرطاس ہے

وہ شاعرانِ خوش نوا نہیں رہے
یہاں تو صرف چیختے ہیں زاغ سے

یہ شعر اپنے اندر ایک تنقیدی طرزِ فکر رکھتا ہے اور عصری شاعری کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے کیونکہ جنابِ باقی جب موجودہ شاعری اور قدما کے سخن کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو محوِ تاسف ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں وہ معیار نظر نہیں آتا جو متقدمین کا خاصا رہا ہے عصرِ حاضر کے سخن پر یہ تلخ مگر حق بجانب تنقیدی رویہ ہے جس کا اعتراف اربابِ نقد و فن بھی کرتے ہیں۔

غزل کے دو اشعار شاملِ شذرہ ہیں۔

تنگ آئے ہوئے لوگ یہ کہتے ہیں خدا سے
پھر نوح کا طوفان کسی طوفان میں آوے

جتنے بھی ستم گر ہیں انہیں پیس کے رکھ دے
یوں گردش گردوں کبھی گردان میں آوے

شعر اول میں آشوب ہستی کی روداد ہے اور زندگی سے بھرپور بیزاری کا اظہار ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ جب انسان حالات کی چیرہ دستیوں سے تنگ آجاتا ہے تو پھر اس کی حیات سے انسیت کم ہو جاتی ہے پھر وہ شہنازِ مرگ سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے شعر ثانی میں ایک جارحانہ اور انقلابی فکر کارفرما ہے شاعر ممدوح ظلم اور ظالم کو صفحۂ ہستی پر تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں جو انسان کا ایک فطری جذبہ بھی ہے وہ ہر قسم کے جبر و جور کی بیخ کنی چاہتے ہیں۔

ہمیں یہ خوف دامن گیر ہے کہ کہیں طوالتِ شذرہ قاری کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے اس لئے چند اشعار بدونِ تبصرہ ہدیۂ قارئین ہیں ۔

یہاں تو لوگ فقیروں کو لوٹ لیتے ہیں
ہمارے شہر میں سادہ نہ تو دکھائی دے

ہم بھی ہیں میرؔ کے قبیلے سے
غم سے ہر شعر میں اثر ایا

گردشوں میں حیات گزری ہے
گھر میں رہتے ہوئے نہ گھر آیا

چھوڑ دے اس کو آوارہ کہیں
دل کی دربانی سے حاصل کچھ نہیں

دل یہاں ملتے ہیں دشواری کے ساتھ
یعنی آسانی سے حاصل کچھ نہیں

قاری کی چاشنی جس میں نہ ہو
اس غزل خوانی سے حاصل کچھ نہیں

مشمولہ تصریحات سے یہ امر حدِ تیقن کو پہنچتا ہے کہ باقی احمد پوری فکر وفن پر دسترس رکھنے والے شاعرِ طرفہ نوا ہیں جن کی سخن سنجی میں جدت و ندرت کی حاشیہ آرائی ہے انہوں نے ہر طرح کی بحور و قوافی اور ردیفوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا ہے عروضی محاسن کی پاسداری بدستور قائم رکھی امید واثق ہے کہ باقی احمد پوری کا کلام ہر عہد کے قاری کو اپنی طرف راغب کرتا رہے گا اور یوں اس عندلیب خوش نوا کی آواز سنائی دیتی رہے گی ان کے اس شعر کے ساتھ ہی اجازت کے خواستگار ہیں

مرے سخن کا فیض ہے نگر نگر
چراغ سو جلے ہیں اس چراغ سے

☆☆☆☆☆

بقا بلوچ نیرنگیٔ افکار کا شاعر

اقلیمِ سخن اپنے جلو میں ہر عہد کا شعری مزاج رکھتا ہے کسی سخنور کے فکر و فن کے معیار کو جانچنے، قدر و منزلت اور مقام و مرتبے کو متعین کرنے کے لئے یہ امر لابدی ہے کہ اس کا انتقادی مطالعہ اس تناظر میں کیا جائے کہ اس نے اپنے تخیلی کینوس پر اپنے دور کے رنگ اور خال و خد اجاگر کرنے کی کتنی حد تک کوشش کی ہے اور وہ اس سلسلے میں کہاں تک کامیاب ہوا اگر اس حوالے سے اس کی کاوشیں کارگر ہوں گی تو اس کے اس عمل کو سعی مشکور پر محمول کیا جائے گا اس لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ روح عصر کے نئے زاویے صفحۂ قرطاس پر منعکس کر پایا ہے یا نہیں اگر التزام فطری اور برجستہ پیرائیہ اسلوب میں کرنے پر قادر ہے جس میں زورِ بیان کے ساتھ ساتھ اثر افرینی کے خصائص پائے جاتے ہیں تو یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے عصر کو بہتر انداز میں متاثر کر پائے گا اور دنیائے شعر میں منفرد مقام پائے گا۔

پاکستان میں اعلیٰ درجے کا شعری ادب تخلیق کیا جارہا ہے مختلف علاقوں میں فروغ سخن کے حوالے سے قابلِ قدر مساعی کی جارہی ہیں اخبارات و جرائد اس سلسلے میں کلیدی کردار ادا کررہے ہیں نئی نئی کتب منظر عام پر آرہی ہیں جدید معاونات میں نیٹ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے اب آپ سنگل کلک سے بہت سے فنی شاہ پارے ملاحظہ کرسکتے ہیں شاعری کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں پاکستانی شعر و ادب کو اگر صوبائی لحاظ سے دیکھا جائے تو پنجاب اور سندھ کا کردار مثالی رہا ہے مگر اس سلسلے میں خیبر پختونخواہ اور بلوچستان جو سنگلاخ پہاڑی سلسلوں اور سرسبز وادیوں سے عبارت ہے جہاں مست توکلی، دیورگ رند، جواں سال بگٹی اور عطا شاد جیسی عظیم ادبی شخصیات نے جنم لیا آج بھی انہی شاندار ادبی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس

نے ہر عہد میں شعر و سخن کے سوتوں کو اپنی آغوش میں پروان چڑھایا آج کا شعری ادب بھی اس حسین روایت کا علمبردار ہے عصرِ حاضر میں اٹھنے والی جدید آوازوں میں ایک آواز بقا بلوچ کی بھی ہے جس نے اپنے برجستہ اندازِ فکر اور ندرتِ اظہار کی بدولت اپنے معاصرین میں ایک نمایاں مقام پایا ہے فکری و فنی اعتبار سے ایک غیر معمولی اہمیت حاصل کی ہے ان کی پیدائش 3 فروری 1978ء میں ڈیرہ بگٹی میں ہوئی ان کے آباؤ اجداد کا مولد و مسکن بھی ڈیرہ بگٹی ہی ہے ان کے والد اللہ بخش (مرحوم) زمینداری کے پیشہ سے وابستہ تھے اور ایک دین دار آدمی تھے جن کی وفات 2005ء میں ہوئی سایۂ پدری سے محروم ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ ابتدائی تعلیمی مدارج ڈیرہ بگٹی میں ہی طے کیے انٹر کالج ڈیرہ بگٹی سے ایف سی کیا اور گریجویشن گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے کی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا 2003ء تا 2006ء پی سی بی کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن پر خدمات سر انجام دیں 2003ء میں ان کا اولین شعری مجموعہ ''صحرا ہماری آنکھ میں'' منصۂ شہود پر آیا جس میں ان کے حوالے سے بلوچستان کی معتبر ادبی شخصیات کی آرا ثبت ہیں علاوہ ازیں ملک کے طول و عرض سے چھپنے والے متعدد شعری انتخابات میں شمولیت کا اعزاز بھی رکھتے ہیں بلوچستان سے چھپنے والے مجموعہ ہائے کلام پر تحقیقی نوعیت کا کام بھی کر رہے ہیں 2004ء تا 2005ء میں کوئٹہ سے چھپنے والے روزنامہ ''انتخاب'' کے ادبی ایڈیشن کے انچارج بھی رہے علاوہ ازیں 2005ء میں ہی روزنامہ ''اعتماد'' میں بحیثیت کالم نگار اور انچارج ادبی ایڈیشن کے طور پر بھی کام کیا جون 2006ء میں سوئی گیس فیلڈ میں بطور انجینئر ملازمت کا آغاز کیا تادمِ تحریر ڈپٹی انجینئر کے عہدے پر فائز ہیں۔ بقا بلوچ کے سوانحی کوائف کی جھلک سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک بھرپور نوعیت کی زندگی گزاری بظاہر انجینئرنگ اور شعر و ادب کی بلحاظِ مزاج کوئی مطابقت نہیں ہے لیکن انہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کسی بھی شعبہ سے وابستہ ہو وہ زبان و ادب کی خدمت کر سکتا ہے بشرطیکہ دُھن اور جذبہ جواں ہو تو سب کچھ ممکنات کا حصہ ہے اس شذرے میں ہم ان کے مذکورہ شعری مجموعہ کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار شاملِ شذرہ کرتے ہیں تنقیدی استخراجات کی بدولت اس امر کو اشکار کرنے کی سعیِ بلیغ کریں گے کہ وہ

اپنے سخن کی وساطت سے اپنی عصری نیرنگیوں کو کسی حد تک احاطۂ تحریر میں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نئے امکانات کے حوالے کے حامل ان کی غزل کے دو اشعار لائقِ التفات ہیں۔

کئی سماں ہیں اگر دیکھنے کی خواہش ہو
کئی جہاں ہیں اگر کوئی ڈھونڈنا چاہے
نیا سفر ہے، نئے خواب ہیں، نئی پرواز
وہ ہم سے آن ملے جو اُفق نیا چاہے

بقاؔ بلوچ کی تخیلاتی جولانی نئے امکانات کی متلاشی رہتی ہے ان کا ذہنی کینوس غور و خوض، فکر و تدبر اور فہم و فراست سے عبارت ہے ان کی مہم جو طبیعت نئی منزلوں کا سراغ لگانا چاہتی ہے اس لئے ان کے ہاں ایک بسیط موضوعات کی شمع فروزاں رہتی ہے جس کی روشنی کے ہالے قاری کو اپنے سحر میں محصور کر لیتے ہیں پھر وہ نئی دنیاؤں کے خواب دیکھنے لگ جاتا ہے پھر رجا کی وسیع و عمیق فضا میں کھو جاتا ہے ان کے فکری کینوس میں نئے سفر، نئے خواب اور نئے افق کی روداد ملتی ہے جس میں جدت و ندرت کے شواہد ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

غزل کا ایک شعر اور مقطع نذرِ قارئین ہے ۔

میں آنسوؤں کا سفینہ کہاں اُتاروں گا؟
جو آنکھ کا بھی کنارا نہیں رہا مرے پاس
وگرنہ اور مرے پاس کیا نہیں ہے بقاؔ؟
بس ایک درد کا دھارا نہیں رہا مرے پاس

ان کے افکار میں حیرت و استعجاب کی کیفیات بھی دیدنی ہیں غم کی آنچ شدید نوعیت کی ہے جس کا اظہار دلگداز انداز میں ہوا ہے ان کا کلام کلبۂ کلفت نہیں ہے بلکہ کہیں کہیں حزن و الم کے معدوم ہونے کی استشہادات بھی ملتی ہیں شعرِ اول حزنیہ اور استعجابیہ شعری طبع کا غماز ہے جبکہ شعرِ دوم رنج و الم سے ماورا ہے ایسے متنوع موضوعات ان کی تلوّن مزاجی کا حصہ ہیں جس سے ان کا شعری کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

غمِ ذات کے تناظر میں ان کی غزل کے دو اشعار دیدنی ہیں۔

اشک بوئے تو میرے آنگن میں
روز باہر سے آ گرے پتھر
جب بھی تعبیر ڈھونڈنے نکلے
خواب پلکوں پہ ہو گئے پتھر

ان کے سخن میں کربِ ذات کے نقوش شوخ، تیکھے اور نمایاں ہیں جن میں ان کے احساسات کی شکنیں ہیں محرومیوں کی پرچھائیاں ہیں حسرتوں کی داستان ہے دکھ درد کے حوالے ہیں جو انہوں نے اپنے فکر و فن میں پالے ہیں جو درونِ ذات کا منظر پیش کرتے ہیں اسلوبیاتی ندرت نے اثر آفرینی اور شیرینی کو فزوں تر کر دیا ہے۔

حزنیہ تاثر سے مربوط ان کی ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر زیبِ قرطاس ہے

خواہشوں میں کھو گیا میرا بدن
ریزہ ریزہ ہو گیا میرا بدن
تھا کبھی گلشن مگر اب دیکھیے
ایک تنکا ہو گیا میرا بدن

خواہشیں ایک تجسیم سے عاری حوالہ ہیں جن میں بدن کا کھو جانا طرفگیٔ سخن کی عکاسی ہے پیرائیہ اظہار کی نادرہ کاری کی دلیل ہے شعرِ ثانی میں ذات کا مکمل ارتقائی سفر موجود ہے عروج سے زوال تک تمام کتھا مذکور ہے ان کا لہجہ بلند بانگ اور پر تاثیر ہے جو قاری پر اثر انداز ہو کر ہی رہتا ہے اور غیر ارادی طور پر متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے اور یہی ان کے طرزِ اظہار کا کمال ہے۔ دو جنوں امیز اشعار ملاحظہ ہوں

جب سے اترا ہے نظر میں اک سمندر کا جنوں
میرے اندر بولتا ہے میرے اندر کا جنوں
ہر گھڑی بے تاب رکھتا ہے مرے وجدان کو
ایک جنگل ایک صحرا ایک پتھر کا جنوں

مذکورہ بالا اشعار داخلی اظہار کی خوبصورت تمثیلات ہیں ان کی داخلیت بھی اپنے اندر اک سامان دلفریبی رکھتی ہے ان کا وجدانِ شعر خود میں کئی منفرد تلازمات رکھتا ہے دوسرے شعر میں جنوں کی ردیف کے ساتھ جنگل' صحرا اور پتھر کے تلازمات لانا جزئیات نگاری کی عمدہ تمثیل ہے۔ غزل کے دو اشعار شاملِ شذرہ ہیں۔

زندگی سے زندگی روٹھی رہی
آدمی سے آدمی برہم رہا
رہ گئی ہیں اب وہاں پرچھائیاں
اک زمانے میں جہاں آدم رہا

اگر کسی بھی عہد کے شعری مزاج کو پرکھنا ہو تو اس دور کے عصری رویّوں کو ملاحظہ کرنا ہوگا جس سے اس عہد کے فکری خدوخال مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں مذکورہ بالا اشعار جہاں عصری رویّوں کے تناظر میں ہیں وہاں ایک تنقیدی حوالہ بھی رکھتے ہیں۔

انسان دوستی اور وفا پرستی کے حوالے کا شعر دیکھیں

بقاؔ جب تک یہ سانسیں ہیں
وفا کا نور پھیلاؤ

عندالبیان بقاؔ بلوچ ترقی پسند افکار کی ضیاپاشی بھی کرتے ہیں انسانیت کا درس بلیغ دیتے ہیں وہ ایک سچے اور کھرے تخلیق کار کی طرح ایک مثالی دنیا کا وجود چاہتے ہیں جہاں کسی نوع کے آزار کا عمل دخل نہ ہو جہاں وفا' مروت اور خلوص کو پنپنے کے مواقع میسر آئیں ایک اور شعر دیکھیے۔

خوشنما تصویر تھی یہ زندگی
لوگ اس کو بدنما کرتے گئے

عصری کج روی کی بازگشت شعر ھذا میں سنائی دیتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر موصوف ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور زندگی کو خالص اور حقیقی انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں کھوٹ' تصنع اور ہر قسم کی چیرہ دستی کے وجود کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں۔

اشوب عصر کے حوالے سے ایک شعر نقل ہے

ہر کوچے میں ارمانوں کا خون ہوا ہے
شہر کے جتنے رستے ہیں سب خونی ہیں

عصری آشوب ان کے فکری کینوس کا ایک نمایاں موضوع ہے جو اپنے اندر اپنے عہد کی تمام تر ظلمتیں سموئے ہوئے ہے بقا کا سخن عمیق حسیات سے عبارت ہے جو تاثیر کی دولت سے مالا مال ہے۔

ان کی غزل کے مطلع اور قطع میں ان کے ریاضِ شعر کے حوالے سے تنقیدی شعور ملاحظہ کرتے ہیں۔

مجھے شعر ایسا گوارا نہیں ہے
جو دستِ ہنر نے سنوارا نہیں ہے
بقا شعر کہنا تو آیا ہے تجھ کو
یہ لفظوں کو تو نے سنوارا نہیں ہے

شاعر مذکور فنی ریاضت کے حوالے سے بھرپور عرق ریزی کے قائل ہیں جس سے ان کی فنِ شعر سے محبت کی عکاسی ہوتی ہے زبان و بیان کے تقاضوں کو بھی وہ بخوبی نبھانے کے قائل ہیں۔

بقا بلوچ کے فکری و فنی گوشوں کی سیر حاصل سیر کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ فکر و فن پر دستگاہ رکھتے ہیں ان کے کلام میں عروضی محاسن کی پاسداری ملتی ہے انہوں نے مختلف بحور کو اظہار شعر کے لئے بخوبی برتا ہے لیکن بحر متدارک مثمن مقبوض مقصور ان کی مرغوب ترین بحر ہے جسے ماہرینِ عروض بحر میر کا نام بھی دیتے ہیں جس کا وزن فعلن فعلن فعلن فعلن فعل یا مفعولاتن مفعولات ہے۔ ان کی اس کتاب میں اس بحر کے حوالے سے کافی کلام موجود ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ بقا بلوچ بلوچستان کے وہ جوان فکر شاعر ہیں جن کی سخن سنجی طرفہ بیانی اور نیرنگئی فکر کی عمدہ مثال ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کا شعور شعر مستقبل میں مزید نکھر کر سامنے آئے گا۔

☆☆☆☆☆

جاوید رسول جوہر اشرفی.....

ایک زمانہ شناس شاعر

خالقِ ارض وسما کا اُس فردِ فرید پر بے پایاں لطف وکرم ہے جسے عقل وبصیرت فہم وفراست' دانش وحکمت حیات وکائنات کے اسرار ورموز اور عمیق عصری ادراکات سے بہرہ ور فرمایا انسانی فکر کے یہی اوصافِ بالیدہ اسے اپنے عہد میں ممتاز ممیز کرتے ہیں جس سے اس کی منفرد پہچان منصۂ شہود پر آئی ہے یہی فکری خصائص دنیائے شعروادب میں کسی شاعر یا ادیب کی شناخت بنتے ہیں اقلیم شعروسخن میں جو سخن ور اپنی خامہ فرسائیوں کی بدولت اپنے عہد کی حقیقی تصویریں پیش کرتا ہے اس کے افکار میں اس کی معاشرت بھرپور انداز میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو اس کے ادبی دوام کی ضمانت دی جاسکتی ہے کیوں کہ وہ ادب برائے زندگی کے نظریے سے سرشار ہوتا ہے۔ جن شعراء نے اپنے کلام میں بھرپور عصری ادراکات کی غمازی کی انہوں نے اپنے آپ کو شعری تاریخ میں امر کرلیا۔ انہیں زمانہ شناس سخن وران میں ایک جواں فکر نام جاوید رسول جوہر کا بھی ہے جن کا شعری اظہار بسیط عصری حسیات کا حامل ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کی سخن سنجی کا جائزہ مذکور موضوع کے تناظر میں لیں گے اس سے قبل کہ ہم ان کی غزلیات کے منتخب اشعار زیرِ تجزیہ لائیں ان کا اجمالی سوانحی تعارف ناگزیر ہے کیوں کہ قاری کے لیے شخصیت اور فن دونوں کی تفہیم ضروری ہے شخصیت سے واقفیت کے بغیر قاری کے لیے آشنائے ہنر کا مرحلہ دشوار ہوتا ہے ان کے آباواجداد کا مولد ومسکن ہندوستان کے مردم خیز خطہ صوبہ بہار کا شہر مظفر پور تھا ان کے والد گرامی محمد غلام رسول ہجرت کرکے مشرقی پاکستان آگئے تھے اور

یہیں 25 دسمبر 1967ء کو جاوید رسول جوہر پیدا ہوئے۔ ابھی جوہر صرف سات برس کے تھے کہ فروری 1974ء کو ان کے والد گرامی اپنے اہل و عیال کے ساتھ دوسری ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی آ گئے۔ ان کے والد نے ان کا نام جاوید رسول جوہر رکھا اور ادبی دنیا میں اسی نام سے مقبول ہوئے آپ کے اساتذہ میں مرحوم عبدالستار فائق قاسمی مرحوم روشن علی عشرت اور کاوش عمر رہے ہیں۔ کاوش عمر جو بنگلہ دیش کے قیام سے قبل گیسوئے شعر و سخن سنوارنے میں مصروف و منہمک رہے کراچی آنے کے بعد ان کی شعری سرگرمیوں نے کچھ سکوت اختیار کیا مائل بہ گوشہ نشینی اور درویشی ہو گئے۔ بہر حال ان کے شاگرد ان کا یہ ادبی فریضہ ہے کہ وہ اپنے محسن و مربی کی تخلیقات کو زیور طباعت سے آراستہ کریں اپنے آموزگار ادب کے حوالے سے جاوید رسول جوہر اشرفی کچھ یوں رقمطراز ہیں۔ ذرا ان کے خراج تحسین کے انداز کو ان کی مثنوی بعنوان "کاوش عمر" کے دو اشعار ملاحظہ کریں۔

اس کی تابِ فکر سے حیرت زدہ چشمِ فلک
اس کے روشن ذکر سے مدھم ستاروں کی چمک
اس کی خاموشی میں پوشیدہ سمندر کا وقار
شاہراہِ علم و حکمت کا یگانہ شہسوار

جاوید رسول جوہر اشرفی کے تا حال چار شعری مجموعے "رنگ و آہنگ" مطبوعہ 1995ء "دار و رسن" مطبوعہ 2006ء (دونوں مجموعے غزلیات و نظمیات و قطعات پر مشتمل ہیں) "گنبدِ خضریٰ" مطبوعہ 2009ء (مبنی بر نعتیہ کلام) اور "صحائفِ اشرفی" مطبوعہ 2011ء (حمد نعت منقبت اور عارفانہ کلام اس کے مشمولات کا حصہ ہیں) منصہ شہود پر آ چکے ہیں مذکورہ مجموعوں کے نام بھی ان کی فکری انفرادیت کے غماز ہیں۔ وہ ایک نجی ادارے میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ معروف مؤقر ادبی جریدہ "عالمی رنگِ ادب" کی مجلس ادارت سے بھی منسلک ہیں اور "رنگ ادب پبلی کیشن" کے خاص رفقائے کار میں شامل ہیں نظم و نثر کے دونوں شعبوں میں گلشنِ شعر و ادب کی آبیاری انتہائی عرق ریزی سے کر رہے ہیں اب ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ کے نصف آخر کے منتخب اشعار شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔

عہدِ موجود میں حضرتِ انسان اپنے فطری اوصاف سے بہت دور ہوتا جارہا ہے موانست جو انسانیت کا وصفِ خاص ہے عصرِ حاضر کے انسان میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔ مکارمِ اخلاق اور اعلیٰ سماجی اقدار کی پاس داری نہیں رہی اس لیے خلوص و مروّت نے اپنی بساط لپیٹ لی ہے اور انسانیت بین کرتی ہوئی محوِ فغاں نظر آتی ہے۔ یہ وہ تلخ تاریخی حقائق ہیں جو حیات و کائنات کی عکاسی کرتے ہیں جو سخن وراس نوع کے افکار کا پاس دار ہے وہ زمانہ شناسی کے ہنر سے بہرہ ور ہے۔ اسی نسبت سے شاعرِ مذکور کی غزل کا ایک شعر دیدنی ہے ۔

اس دور میں انسان کی پہچان ہے مشکل
کس روپ میں پوشیدہ ستمگر نہیں ہوتے

عصری آشوب کی عکاسی بھی زمانہ شناسی کا ایک بھرپور اظہار ہے جو تخلیق کار اس طرزِ اظہار کا حامل ہے وہ نباضِ حیات بھی ہے اور رموز دانِ کائنات بھی ہے زیست کی آشوب زدگیوں کا تذکرہ درحقیقت انسانیت اور انسان دوستی کا ایک بالواسطہ طور پر درسِ بلیغ ہے دراصل آج ہمیں قحط الرجال کا سامنا ہے کیوں کہ احکاماتِ خداوندی، فرموداتِ نبوی اور تعلیماتِ اسلاف کو فراموش کر چکے ہیں حمیت و جسارت ناپید ہو چکی ہے اور ہم ایک کمزور کردار کے آئینہ دار ہیں اسی حوالے سے جاوید رسول جوہر اشرفی کی غزل کا مطلع اور ایک شعر طالبِ التفات ہے ۔

آرہی ہے یہ صدا اب ہر در و دیوار سے
گردنیں اپنی بچاؤ وقت کی تلوار سے
اس سے کیا رکھے کوئی حرفِ انا الحق کی اُمید
آج کا منصور تو لرزاں ہے خوف دار سے

انسانی رویّوں کا پیشگی شعور بھی دور اندیشی کی عمدہ تمثیل ہے جو اس نوعیت کی آگہی سے لیس ہے وہ زمانہ شناس اور رمز داں کہلانے کا حقیقی معنوں میں مستحق ہے کج روی اور جفا شعاری انسانی فطرت کا خاصہ رہی ہے اسی تناظر میں جوہر جی کی غزل کا یہ شعر قابلِ غور ہے ۔

مری آستیں میں برسوں جو پلے ہیں دودھ پی کر
وہی چاہتے ہیں ڈسنا مجھے کیا پتا نہیں ہے

سماجی چیرہ دستیوں کے احساس کو باور کرانا بھی زمانہ شناسی کی عمدہ دلیل ہے اور بالواسطہ طور پر ایک مقصد اصلاح بھی ہے جس سے انسان کو حالات میں سدھار لانے کی تحریک بھی ملتی ہے ملکی حالات کو شعری اظہار کے سانچے میں ڈھال کر درسِ انسانیت دینا بھی عصری ادراکات کا مظہر ہے سماج کے دوہرے رویّوں کو ہدفِ تنقید بنانا بھی ایک سخن ور کا فرضِ منصبی ہے کیوں کہ تخلیق کار اپنی معاشرت کا غیر جانبدار نقاد ہوتا ہے اس کے ہاں معائب ومحاسن کا مذکور ملتا ہے محاسن کا اظہار ان کی مدحت کے زمرے میں ہوتا ہے تاکہ انہیں فروغ میسر آسکے جبکہ معائب کا بیان مذمت کے ضمن میں ہوتا ہے تاکہ ان کی حوصلہ شکنی کرکے ان کا تدارک کرکے مداوا تلاش کیا جاسکے۔ انہیں افکار سے مزین جوہر صاحب کی غزل کے تین اشعار زیبِ قرطاس ہیں۔

کب خوئے بربریت تبدیل ہو رہی ہے
انسانیت کی اب بھی تذلیل ہو رہی ہے
اب بھی وطن میں ہر سو لاشوں کے سلسلے ہیں
بارود کی مسلسل ترسیل ہو رہی ہے
رہزن لباسِ نو میں رہبر بنے ہوئے ہیں
مذموم خواہشوں کی تکمیل ہو رہی ہے

عموماً جوں کہ حالات نامساعد رہتے ہیں جن کا اظہار بین السطور عصری تنقیدی رویّوں کی صورت میں ہوتا ہے اگر سماج میں نظامِ عدل کی حالت دگرگوں ہو جائے اور وہ فعال نہ ہو تو پھر ظلم و بربریت اور سفاکیت کو فروغ میسر آتا ہے ایسے تخیلات سخن ور کے عصری ادراکات کا مظہر ہوتے ہیں جو اس کی زمانہ شناسی کی بین دلیل قرار پاتے ہیں اسی احساس کا حامل شاعر ممدوح کی غزل کا یہ شعر لائقِ توجہ ہے۔

بیڑیاں کٹتی ہیں یا کٹتا ہے قیدی کا گلا
دیکھنا ہے کاٹ کیسی خامۂ عادل میں ہے

سب سے بڑی انسانی صداقت انسان کا اپنا ذاتی محاسبہ اور غیر جانبدارانہ تنقیدی جائزہ

ہے جس سے اس کے کھرے پن کی تصدیق ہوتی ہے انسان کے عادات و خصائل بھی عمرانی رویّوں کے مثیل ہوتے ہیں اس لیے اسے اپنی معاشرت کا ترجمان گردانا جاتا ہے معاشرتی بے حسی سے اس کی ذات متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جاوید رسول جوہر اشرفی کی خود تنقیدی کا عکاس غزل کا مطلع نذرِ قارئین ہے ۔

بے حسی میری غضب ہے نفرتوں کی لہر میں
میں بھی پتھر ہوگیا ہوں پتھروں کے شہر میں

نفسانفسی عروج پر ہے خودغرضی کا راج ہے اعلیٰ اخلاقی اقدار دم توڑ چکی ہیں محبتیں مفقود ہیں جفاشعاری کا چلن عام ہے انسان بغض و نفرت کا استعارہ بن چکا ہے ہے یہ امر اربابِ فکر و دانش کے لیے لمحۂ فکریہ بنا ہوا ہے جیسے راقم الحروف کی غزل کا ایک مطلع ہے ۔

سماج سارا سوگیا ہے بے حسی کو اوڑھ کر
سپردِ خاک ہوگیا ہے بے حسی کو اوڑھ کر

اس حوالے سے جوہر جی یوں گویا ہیں ۔

اس دور کے احباب سے کیا ہاتھ ملائیں
اخلاص کا شمہ نہ محبت کی رمق ہے

ان کے فکری کینوس میں بے پناہ وسعت پائی جاتی ہے ان کا بنیادی موضوع حیات و کائنات ہے ان کے ہاں سنسار کی بے چینی اور کرب کی عمدہ لفظی تصویریں پائی جاتی ہیں انفرادی حوالوں کی نسبت اجتماعی حوالے وفور سے ملتے ہیں اس لیے ان کے افکار ذاتی نوعیت کے نہیں بلکہ کائناتی اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ ذات کے سفر کے اختتام کے بعد کائناتی فکر کے ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے اس لیے ان کے گنجِ شعر میں سوچ کا ایک مجموعی انداز ملتا ہے عندالبیان وہ زندگی کو درپیش خطرات اور انسانی مسائل زیرِ بحث لاتے ہیں جو ان کی زمانہ شناسی کی برہانِ قاطع ہے ان کی غزل کے چار اشعار دنیائے شعر و سخن کی نذر ہیں ۔

کیا ٹھکانہ زندگی کا زندگی خطرے میں ہے
کس طرف جائے کہ ہر سو آدمی خطرے میں ہے

قتل گاہیں بن گئی ہیں شاہراہیں شہر کی
ایک دو کا تذکرہ کیا ہر کوئی خطرے میں ہے

مٹتے جاتے ہیں دلوں سے مہر و الفت کے نشان
عمر بھر کے دوستوں کی دوستی خطرے میں ہے

درس گاہیں بن گئی ہیں جہل کی آماج گاہ
دانش و علم و شعور و آگہی خطرے میں ہے

مندرجہ بالا تصریحات اس امر کی وقیع شاہد ہے کہ جاوید رسول جوہر کا سخن ان کی زمانہ شناسی کا بھرپور ترجمان ہے جس میں ان کے تلخ تجربات و مشاہدات کا عکس بھی ہے جس سے ان کی فکر میں شدت وحدت اور جدت کے مظاہر ضو پاش ہوئے ہیں ان کے کلام کا غائرانہ مطالعہ سے یہ استخراجی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد سے گہری حساسیت کے جلو میں اثر قبول کیا ہے اور اسے متاثر کرنے میں بھی کامیاب نظر آئے ہیں خدائے لم یزل سے دعا ہے کہ ان کے فکر و فن کو مزید معیارات سے ہمکنار کرے اور دولتِ دوام ودیعت فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

جسارتؔ خیالی.....ترقی پسند افکار کا علم بردار

اگر ادب کی مقصدیت اور افادی پہلوؤں کو مدنظر رکھا جائے یا ادب کو ادب برائے زندگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو ترقی پسند ادب ہی صحیح معنوں میں ادب کہلانے کا مستحق ہے عصری مقتضیات میں انقلابی تغیر رونما ہو چکا ہے گل و بلبل کے فسانے' لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد' ہیر رانجھا' سسی پنوں' صاحباں مرزا اور سمی راول کی داستانوں کا عہد بیت چکا ہے آشوب عصر کے باعث یہ امر انتہائی ناگزیر ہے کہ ادب اور ادیب کو انسانیت کی فلاح اور خدمت کے جذبے سے سرشار ہونا چاہیے شذرہ ھذا میں ہم معروف ترقی پسند شاعر جسارتؔ خیالی کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں جو مارکسی طرز فکر اور نظریہ کی نابغہ روزگار تمثیل ہیں جن کی خامہ فرسائیوں کی طویل داستاں ہے،ان کی کتاب ''لازماں سے زماں تک'' مطبوعہ 2006ء جس میں ڈاکٹر خیال امروہوی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بسیط انداز میں لکھا گیا ہے جس میں انہوں نے اپنے آموزگار ادب کو بھرپور طریقے سے خراج تحسین پیش کرنے کی سعی جمیل کی ہے ان کا اولین شعری مجموعہ شعاع فردا'' سے موسوم 2007ء میں منصۂ شہود پر آیا جس میں غزلیات و نظمیات شامل ہیں فاختہ کی فریاد' نوید' اور مزدور کی یاد' جس کی معرکتہ الآرا نظمیں ہیں''اقبال سوکڑی فن اور شخصیت'' کے نام سے ایک کتاب 2009ء میں قارئین شعروادب کو فراہم کر چکے ہیں علاوہ ازیں سہ ماہی ''نیا قدم انٹرنیشنل'' کی ادارت بھی کر رہے ہیں جو بہاڑپور لیہ سے تواتر سے چھپ رہا ہے جس کے دو خصوصی نمبر ڈاکٹر خیال امروہوی مطبوعہ 2010ء اور پروفیسر اقبال ندیم مطبوعہ 2013ء بھی منظر عام پر آچکے ہیں ان کا دوسرا شعری مجموعہ سطوتِ حرف' مطبوعہ ستمبر 2013ء ہمارے زیر نظر ہے جو غزلیات و نظمیات اور قطعات پر مشتمل ہے

شبیر ناقد

جس میں زیادہ تر غزل شامل ہے جو ہیئتی اعتبار سے اُن کے فطری و طبعی رجحان و میلان کی عکاسی کرتی ہے تاہم للکار اور یقین حوالے کی نظمیں ہیں جو دولتِ تاثیر سے مالا مال ہیں جسارت خیالی بلا امتیاز رنگ و نسل، جغرافیائی و لسانی اور مذہبی تعصبات سے ماورا ہو کر زبان و ادب کی ترویج اور فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں شذرہ ھذا میں ہم اُن کے مؤخر الذکر شعری مجموعہ کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار ناقدانہ صراحت سے پیش کرنے سے قبل مذکورہ مجموعہ کے معروف ناقدین کی آرا قلم بند کرتے ہیں۔

ملک کے مشہور شاعر و نقاد ڈاکٹر اختر ہاشمی یوں رقمطراز ہیں:

''جسارت خیالی کے کلام کے بغور مطالعہ کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے کلام میں بلند خیالی، تخیل کی پرواز، ندرتِ فکر اور خیال کی جدت پائی جاتی ہے ان کو اشعار کی بنت، نئی ردیفوں کے انتخاب، قوافی کے چناؤ، الفاظ و تراکیب کے استعمال اور خیال کو سجا کر پیش کرنے میں ایسی مہارت ہے جیسا کہ احمد فراز کو حاصل تھی اس خوبی نے جسارت خیالی کو ان کے ہم عصروں اور ہم عمروں میں ممتاز و منفرد کر دیا ہے یہ انفرادیت ہی ان کی پہچان و اسلوب ہے۔''

جاوید رسول جوہر نے موصوف کی نسبت سے یوں خیال آرائی کی ہے:

''میں جسارت خیالی کی حقیقت نگاری اور حق گوئی کو سلام پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک سچے قلم کار کی طرح اپنی ذات کے خول میں مقید انا پرستوں کو منفی رجحانات سے نکال کر زندگی کے سچے اظہار کا راستہ دکھایا ہے جس کی ہمارے عہد کو اشد ضرورت تھی آسان اور سہل زبان میں ہلکے پھلکے الفاظ سے بڑا کام لینا جسارت خیالی کا خاصہ ہے ان کے اشعار کا ابلاغ عام فہم اور آسان ہے جو اپنے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔''

معروف شاعر، نقاد، افسانہ نگار، ناول نگار، مرتب اور صحافی شاعر علی شاعر نے شاعرِ مذکور کی سخن سنجی پر کچھ یوں خامہ فرسائی کی ہے:

''ان کی غزل اپنے اندر خیالات کی رعنائی' فکر کی گہرائی' خیال کی ندرت' مفہوم و آگہی' تخیل کی بلند پروازی اور جذبات کی جدت کے ساتھ ساتھ چاہتوں کی شدت لیئے ہوئے ہے انسان بہت جلد فنا ہو جاتا ہے مگر اس کی تخلیقات زندہ رہتی ہیں مجھے بھی یقین ہے کہ جسارت خیالی کی شعری تخلیقات ان کے بعد بھی زندہ رہیں گی اور ان کے آدرش کی روشنی سے عالمِ شعر و ادب تادیر منور رہے گا۔''

ہر صاحب بصیرت انسان اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قائل ہے کیونکہ اسی امر میں دنیا و عقبیٰ کی کامیابی کا راز مضمر ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ کل بنی نوع انسان کے لئے مشعلِ راہ ہے کیونکہ ابنِ آدم کی تخلیق کچھ اعلیٰ و ارفع مقاصد سے منسوب ہے لہو و لعب اور رنگینیوں میں زندگی کرنا مقصدِ حیات نہیں ہے جسارت خیالی زیست کی مقصدیت کے قائل ہیں اور اسے متاعِ ہستی گردانتے ہیں مشعلِ راہ سمجھتے ہیں جسے فروزاں رکھنے کو وظیفۂ حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی نسبت سے اُن کی ایک غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں ۔

سرفرازی اب اسی میں ہے تری
سیرتِ ختمِ رسل کی نقل کر
ذات کی تخلیق کا مقصد سمجھ
عمر ساری یوں نہ رنگیں شغل کر

وہ دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں دردمند جذبوں کے امین ہیں اس حوالے سے ان کی حسیات بسیط و عمیق ہیں وہ مفلوک الحال طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں عام آدمی کے مصائب و آلام کی ترجمانی کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں سماج کے پسے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے انسانوں سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں عصری مقتضیات سے خوب واقف ہیں یہی آدرش اُن کے کلام میں جا بجا ملتا ہے جیسے راقم الحروف اپنی ایک نظم ''نوائے وقت'' میں یوں گویا ہیں ۔

وقت کی آواز سن
وقت کا کچھ ساتھ دے
بے کسوں کے ساتھ رہ

اور بے کسوں کا ساتھ دے

عصری آشوب کی نمایاں جھلک اُن کے ہاں مشاہدہ کی جاسکتی ہے وہ اپنے عہد کی ناہمواریوں کو شعری پیرہن عطا کرتے ہیں کھوکھلی تہذیب کے کھوکھلے دعوؤں کا بطلان کرتے ہیں اُن کی ایک غزل کے ذیل کے شعر میں یہی بازگشت موجود ہے ۔

تجھے کیا علم ہو بچوں کا کیسے پیٹ پالا ہے
غریب شہر نے اپنا تو گردہ بیچ ڈالا ہے

ایسی عمیق حسیات کی تمثیل شاذ ہی کہیں مشاہدہ کی جاسکے گی وہ ایک حُب الوطن انسان ہیں دھرتی کی محبت اُن کے ضمیر میں رچی بسی ہوئی ہے اس لئے وہ پر آشوب حالات میں شاکی اور نالاں نظر آتے ہیں جو ایک کھرے اور سچے قلم کار کی دلیل ہے دہشت گردی کی اٹھنے والی لہر انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے پھر وہ سراپا سوال بن جاتے ایک حساس انسان کی مانند وہ اسباب ومحرکات جاننا چاہتے ہیں جس کے باعث خوابوں اور امنگوں کا خون ہوا ہے جس نے پورے چمن کو جلا کر راکھ کردیا ہے وہ اپنے سماج اور قیادت کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں فرشتہ صفت نام نہاد راہبروں کے خلاف سراپا احتجاج ہیں ان کے یہی فکری اطوار ان کی ایک غزل کے تین اشعار میں مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں ۔

یہ کس نے چُرالی مہک پھر گلوں کی؟
کہ مغموم سارے چمن کی فضا ہے
یہ کس نے ہوا دی کہ شُعلے اٹھے ہیں
شجر ہی نہیں ہر نشیمن جلا ہے
یہ کس نے اسے باغباں ہے بنایا؟
کہ ظالم تو غنچے مسل ہی رہا ہے

جسارت خیالی ایک مردِ قلندر ہیں اور خدائے بزرگ و برتر کی ذات پر پختہ یقین رکھتے ہیں یہی یقین ان کا ایک بھرپور رجائی حوالہ ہے ان کے ہاں صرف غم و یاس اور حزن وملال کی چتا نہیں ہے بلکہ کہیں کہیں رجائیت بھی اپنی بہار دکھاتی نظر آتی ہے ہر اچھائی کو قدرتِ الٰہیہ

سے منسوب کرتے ہیں ایسا عمیق رجائی انداز شاذ ہی کہیں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ان کے سخن میں سماج کے اعلیٰ طبقے کی چیرہ دستی اور کج روی کا مذکور ہے جو انہوں نے نادار طبقہ سے روا رکھی ہے یہی انسان دوستی کی برہانِ قاطع ہے وہ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا مکافاتِ عمل ہے ظلم و ستم اور جبر و جور کی عمر بہت قلیل ہوتی ہے انجامِ کار سچ کی بالا دستی ہوتی ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ محرومی کا شکار انسانیت سے خلوص و مہر کا معاملہ کیا جائے اور کسی سے کسی نوع کی زیادتی روا نہ رکھی جائے وہ سماج کے ناسور رویوں کو بے نقاب کرتے ہیں احساس کی شدت اور فراوانی کے باعث ان کا لہجہ بلند بانگ ہو جاتا ہے عند البیان انسانی دوستی کا درسِ بلیغ ملتا ہے ۔

خدا کا شکر ہے سر سے ٹلی ہے
غموں کی شام مشکل سے ڈھلی ہے
نہ اتنا ناز کر اپنے کئے پر
ستم کی شاخ کب پھول پھلی ہے؟
امیرِ شہر کی ہی غفلتوں سے
غریبِ شہر کی کٹیا جلی ہے

جسارتؔ جی کے ہاں انقلاب آگیں افکار وفور سے ملتے ہیں اگر انہیں دائمی انقلاب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا جو بھی بات کہتے ہیں اعتماد سے کہتے ہیں دولتِ یقین سے مالا مال ہیں انہیں اس امر کا بخوبی ادراک ہے کہ انقلاب کچھ قربانیوں کا متقاضی ہوتا ہے جب کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا شبِ تیرہ کا راج ختم ہو جائے گا ظلمتِ شب سے بغاوت کو ناگزیر سمجھتے ہیں وہ بحیثیتِ قوم اپنا محاسبہ کرتے ہوئے خود تنقیدی کے دل سوز عمل سے گزرتے ہیں وہ تمام تر تنزلی کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھتے ہیں اور خلوصِ نیت کے فقدان کی نشاندہی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں دہشت گردی، لاقانونیت کے باعث ایک عدم تحفظ کا احساس ان کے ہاں پنپتا نظر آتا ہے جس کے باعث یاسیت و قنوطیت کی دل دوز کیفیت پائی جاتی ہے زیست کی رونق و رعنائی کے معدوم ہونے کا تذکرہ بھی شد و مد سے ملتا ہے آرزو کے گریزپا ہونے کے شواہد ملتے ہیں غم و یاس کا یہ عالم ہے کہ فانیؔ بدایونی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور قاری حزن و الم سے ہمکنار

ہونے کے بعد محوِ تفکر ہو جاتا ہے ان کی ایک غزل کے چار اشعار زیبِ قرطاس ہیں ۔

ظلمتِ شب سے بغاوت شرط ہے
پھر بھلا کیسے سحر ہوتی نہیں
باغبانی میں کمی ہوگی ضرور
شاخ کوئی بے ثمر ہوتی نہیں
دن گزرتا ہے بموں کے خوف سے
رات سوچوں میں بسر ہوتی نہیں
زندگی تنہا ہوئی ہے اس قدر
آرزو بھی ہم سفر ہوتی نہیں

حضرتِ جسارتؔ کے ہاں احساس کی پونجی وافر ہے بے پایاں خلوص ہے بے پناہ مروتیں ہیں وہ دوست کیا دشمنوں کے لئے بھی بے انت محبت رکھتے ہیں جو ان کے بڑے پن کی دلیل ہے اور انسان دوست ہونے کا واضح ثبوت ہے اس لئے وہ دشمنِ جاں کی بھی مدارات کے حامی ہیں اور اسے تمام مصائب و آلام کا مداوا سمجھتے ہیں ۔

ایک حل ہے اب سلگتے شہر کا
درد کی تقسیم سوغاتیں کریں
راحتِ دل چاہتے ہیں ہم اگر
دشمنِ جاں کی مداراتیں کریں

طولِ بیاں کے خوف اور قاری کی طبع نازک کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان کی ترقی پسند افکار کی حامل ایک پوری غزل بدونِ تبصرہ پیشِ خدمت ہے ۔

نہ آٹا ہے، نہ چینی ہے، نہ ملتا گھی ادھارا ہے
غریبِ شہر نے ہر پل اذیت میں گزارا ہے
چھپا کر مال بیٹھے ہیں جو غاصب شہر میں تیرے
جھپٹ کر چھین لو ان سے کہ اس پر حق تمہارا ہے

نہ کر ناداں غرور اتنا تو اپنی جاہ و حشمت پر
نہ خسرو ہے نہ قیصر ہے نہ کسریٰ ہے نہ دارا ہے
کڑی اس دھوپ میں یوں رقص کرتے ابر کے ٹکڑے
یہ موسم کے بدلنے کا پرندوں کو اشارا ہے
یقین سے میں یہ کہتا ہوں نہ ہارو حوصلے اپنے
نہیں امروز گر اپنا تو فردا پھر تمہارا ہے
ملی عظمت اس کو ہے زمانے میں جسارتؔ جی
گلے سے طوق جس نے بھی غلامی کا اُتارا ہے

اگر کلامِ جسارتؔ کو فنی پہلوؤں سے دیکھا جائے تو عروضی تلازمات کا التزام فطری انداز میں ملتا ہے۔ بحور میں ایک تنوع ہے جو اُن کی تلوّن مزاجی کا حصہ ہے مفرد و مرکب اور مخدوف بحور میں انتہائی کامیابی سے سخن سنجی کی ہے ان کی بحور میں ایک مخصوص آہنگ اور موسیقیت کی فضا پائی جاتی ہے اسلوب ابلاغ سے ہم آہنگ ہے شعوری اور لاشعوری طور پر تعلیاتی شواہد معدوم ہیں جس سے ان کی منکسر المزاجی کی عکاسی ہوتی ہے اُن کے ہاں خوبصورت ترکیبات کا ایک جہاں آباد ہے جن میں بحرِ غم، غریبِ شہر، نظامِ میکدہ، دستِ حنا، لبِ آتش فشاں، چہرۂ خونچکاں، شبِ الم، ورطۂ ظلمات، گردشِ حالات، دشمنِ جاں، تلاشِ منزل، منزلِ نو، جشنِ سحر، اندازِ فصاحت، فصلِ گل، شہرِ تمنا، خونِ جگر، بے آسرا و مجبور، نانِ جویں، فرشِ عشرت، متاعِ نظر، روزگارِ رفتگاں، قلب و نظر، آبلہ پائی، عزمِ جادہ، قسامِ ازل، زخمِ ہستی، رختِ سفر، لختِ جگر، دیدۂ تر، اہلِ جہاں، عزمِ نو، بہ نو، نغمۂ آزاد، نوعِ بشر، قوتِ بازوئے حیدر، پیغامِ سحر، صفحۂ ہستی، غرقِ غم، زخمِ جگر، بحرِ تلاطم، عالمِ انسانی، فہمِ قرآنی، بدعتِ فکری، تیشۂ تخریب، مرکزِ اوہام، زیرِ دام، موجبِ آزار، نرگسِ بیمار، داغِ جبیں، احساسِ تشنگی، دخترِ رز، جدتِ اظہار، ردِ حق، شہرِ سخن، عزمِ بیکراں، جوشِ عمل، سیلِ اشک، حصارِ ذات، تسخیرِ جہاں، خاکۂ زیست، ہوسِ زر اور شرفِ انسانی جیسی نادر النظیر تراکیب شامل ہیں جن سے اُن کے لسانی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے اُن کے ہاں فارسی لفظیات کا چلن وفور سے ملتا ہے۔

مشمولہ استخراجات شاہد کہ جسارت خیالی کا کلام سراپا انقلاب ہے ظلمتِ شب میں صبح درخشاں کی نوید ہے انہوں نے ادب کی مقصدیت اور افادی پہلوؤں کو ہی فوقیت دی ہے اُن کی شاعری کے غائرانہ مطالعہ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جسارت خیالی دنیائے سخن میں ترقی پسند افکار کے نہ صرف علم بردار ہیں بلکہ مشعل بردار بھی ہیں۔ خالقِ ارض وسما انہیں مزید طاقت وتوانائی سے نوازے تا کہ وہ ریاضِ شعر میں اپنی عرق ریزیاں صرف کر کے اپنے سخن میں فزوں سے فزوں تر ابلاغیت پیدا کر سکیں۔

☆☆☆☆☆

جاوید احسنؔ کا فنِ نعت گوئی

نعت گوئی ایک گراں مایہ سعادت ہے جو کسی خوش نصیب کو میسر آتی ہے اس کے لیئے صرف شاعر ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس کا مرکزی تلازمہ ہے کسی سخن دان کا یہ وہ عمل ہوتا ہے جو آخرت کے سفر میں اس کے لئے زادراہ ثابت ہوتا ہے اس کے لئے جہاں فنی ریاض ضروری ہے وہاں سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ وادراک بھی ناگزیر ہے مزید برآں اسلامی تعلیمات کی جانکاری اور قرآن وحدیث کی تفہیم بھی نعت نگار کے لئے ازحد ضروری ہے۔ خلوص ووالہانہ پن بھی فنِ نعت کا ایک کلیدی خاصہ ہے شذرہ ھذا میں ہم جاوید احسنؔ کے نعتیہ مجموعہ ''لوحِ شفاعت'' مطبوعہ 2009ء کے آئینے میں ان کے منتخب نعتیہ اشعار کا فکری وفنی تجزیہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

وادیٔ طیبہ سے محبت کے حوالے کا حامل ان کی نعت کا مطلع ملاحظہ ہو۔

آباد رہیں تیرے مدینے کی فضائیں
ہر وقت برستی رہیں رحمت کی گھٹائیں

مصرعِ اوّل میں وہ شہرِ نبی کے لئے محوِ دعا ہیں یہ بھی ان کی سرکارِ دو عالم سے محبت کا ایک رنگ ہے وہ گویا ہیں کہ ابد تک مدینے کی فضا شاد وآباد رہے اور ہر دم اس پر خدا کے کرم کی رحمتوں کا نزول ہوتا رہے۔ شعرِ ہذا سہلِ ممتنع کے رنگ کا حامل ہے جس میں وفورِ محبت وعقیدت پایا جاتا ہے ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دھیمے لہجے میں بات نہیں کرتے اس لیے ان کی فکر قاری کو جلد اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

نعت کے ایک اور شعر میں ان کی حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عالم دیکھیں۔

دیارِ شوق میں پہنچوں غبارِ کارواں بن کر
مجھے جنت سے بھی خوش تر تری زلفوں کے سائے ہیں

اس شعر میں شوق مدینہ کروفر سے جلوہ نما ہے۔ خواہش وصل شدید تر ہے وہ کہتے ہیں کہ میں سرکار مدینہ کے پاس کارواں کا غبار بن کے پہنچوں یہ بھی ان کی محبت کا عمیق احساس ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ کی زلفوں کے سائے مجھے جنت سے بھی زیادہ مرغوب ہیں۔

ان کی نعت کے دو اشعار ہدیۂ قارئین ہیں۔

میں تمام عمر کی نیکیاں ترے پائے ناز پہ واردوں
مجھے ایک پل جو نصیب ہو تری بزم راز و نیاز میں
جو ترے حضور گزر گیا تری بارگہ میں بسر ہوا
وہی ایک لمحہ ہے قیمتی مری ساری عمرِ دراز میں

شعرِ اوّل میں بھی محبت و عقیدت کا تاثر بڑے شدومد سے اپنی بہار دکھا رہا ہے وہ یوں کہتے ہیں کہ میں اپنی تمام زندگی کی نیکیاں ترے پائے ناز پر قربان کردوں اگر مجھے ایک پل کی عمر ملے تو میں وہ تری بزمِ راز و نیاز میں گزار دوں یہ الفت کا وہ رنگ ہے جو شاذ ہی کسی نعت نگار کے ہاں پایا جاتا ہے شعرِ دوم میں رقمطراز ہیں کہ میری زندگی کا وہ لمحہ قیمتی اور باسعادت ہے جو آپ کی محبت میں گزر گیا حقیقت میں جیون کا وہ لمحہ قیمتی ہوتا ہے جو خیالِ محبوب میں گزرتا ہے

سیرتِ نبوی کے حوالے سے ان کی نعت کے تین اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

جن کو دشمن بھی سمجھتے تھے امین و صادق
حسنِ کردار کا معیار ہے سیرت ان کی
ان کی انگشتِ شہادت کے اشارے کی قسم
چاند کو چیر دے یہ ہے طاقت ان کی
غیر تھے دین میں داخل ہوئے بھائی ٹھہرے
حاملِ عہدِ مواخات ہے امت ان کی

پہلے شعر میں صفاتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و کردارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات

کی گئی ہے کہ آپ کو دشمن بھی صادق وامین کے لقب سے پکارتے تھے لہٰذا آپ کی سیرت معیارِ حسنِ کردار ہے دوسرا شعر ایک تاریخی حوالے کا حامل ہے جس میں واقعۂ شق القمر کی بات کی گئی ہے جس کی تصدیق قرآن مجید نے بھی کی ہے کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی مبارک کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا واقعہ ہذا بھی معجزاتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ایک ہے جس سے طاقت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازہ ہوتا ہے واضح رہے کہ شعر میں شق القمر کی نسبت سے بات ہوئی ہے عموماً یہ تاثر پایا جاتا کہ یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہے کہ انہوں نے اپنی انگشتِ مبارک کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیا معاملہ کچھ مختلف ہے کہ کرشمۂ قدرت کے تحت چاند پہلے دو ٹکڑے ہوتا ہوا نظر آیا پھر آپؐ انگلی مبارک کا اشارہ فرمایا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں ایسی صراحت کی ہے تیسرے شعر میں مواخاتِ مدینہ کا مذکور ہے جو بھائی چارے کا ایک معاہدہ تھا جس کے تحت ایک انصار کو دوسرے مہاجر کا بھائی بنا دیا گیا تھا تاریخ عالم میں بھائی چارے کی عمدہ اور عملی مثال ہے حتیٰ کہ انصار نے مہاجرین کے ساتھ اپنی جائیداد بھی تقسیم کیں اور انہیں برابر کا حصہ دیا اس شعر میں شاعر موصوف یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ ایک دوسرے کے لئے غیر تھے فیضانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے انہیں حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ آپس کی موانست سے نوازا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی اُمت حاملِ عہدِ مواخات ہے۔ یہ فضیلت صرف آپ کی اُمت کو حاصل ہے۔ رسالتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعتراف کے حوالے کا ایک شعر دعوتِ توحید دے رہا ہے۔

منکر سے کہو خود کو ہلاکت میں نہ ڈالے
رحمٰن کا انکار ہے انکارِ محمد

شعرِ ہذا میں منکرانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہلاکت کی وعید سنا رہے ہیں کہ منکرِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصل میں خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے کیوں کہ آپ کا انکار خدائے قدوس کی ذات کے انکار کے برابر ہے اس شعر میں انتہائی خوبصورتی سے انہوں نے محبتِ خدا اور نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یکجا کر دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار رب کی توحید کے

انحراف کا مثیل ہے۔ حب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے یہ شعر اپنی نظیر آپ ہے۔

نعت کے مقطع میں ان کی عاجزی کا انداز دیکھیں۔

جاویدؔ تری نعت کہاں فخر کے لائق
مصرع نہیں کوئی بھی سزاوارِ محمد

اس شعر میں سخنور کا عاجزانہ انداز جلوہ گر ہے نعت کہنے والے شعرا کے لئے ایک رمز انکساری ہے تاکہ نعت گو کسی قسم کے فخر و مباہات میں مبتلا نہ ہو وہ کہتے ہیں کہ میں اپنی نعت پر فاخر و نازاں نہیں ہوں کیونکہ میری نعت کا ایک حصہ بھی شایان شان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہے۔ ایک اور تلمیحی حوالے کا حامل شعر دیکھیں

سدرۃ المنتہیٰ بھلا کیا ہے؟
وہ وراء الورا جہاں تک ہیں

اس شعر میں واقعۂ معراج کا حوالہ دیا گیا ہے سدرۃ المنتہیٰ آخری سرحد ہے جہاں تک کسی انسان کو عروج نصیب ہوا یقیناً یہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعزاز ہے۔

یہ تو چند نعتیہ جھلکیاں تھیں جو ہم نے جاوید احسنؔ کے نعتیہ کلام کے منتخب اشعار سے پیش کیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا فنِ نعت گوئی بہت وقیع ہے اور ان کی فکر گہرائی و گیرائی کی حامل ہے ان کی نعت نگاری ان کی کہنہ مشقی کا مظہر بھی ہے جس میں حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عروج پر ہے زبان و بیان کا معیار بھی بہت عمدہ ہے۔ دعا ہے کہ نعت گوئی کے حوالے سے ان کی کاوشیں راہِ عقبیٰ میں زادِ راہ ٹھہریں۔ آمین

☆☆☆☆☆

جلیل حیدر کا افسانہ.....

''منت کشِ بے رخی'' ایک عمیق حسیّاتی تاثر

کسی بھی افسانہ نگار کی کامیابی کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ اس کا افسانہ کتنی حد تک ترجمانِ عصر ہے اس میں عصری رجحانات کی پیوند کاری کس قدر ہے وہ اپنے عہد کی مقتضیات کا احاطہ کیسے کرتا ہے کیا وہ حیات و کائنات کی صاف و شفاف تصویر پیش کرتا ہے کیا اس میں زندگی فطری انداز میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کیا اس پر مافوق الفطرت عناصر کی اثر اندازی تو نہیں کیا اس میں بناوٹ یا تصنع جیسے فکری خباثت تو نہیں ہیں کیا اس کا اسلوبیاتی اور مکالماتی انداز حقیقی نوعیت کا ہے کیا وہ حیات کا مشاہداتی' جزئیاتی' حسیاتی' عمرانیاتی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے کیا اس کے لسانیاتی زاویے صعودی طرزِ فکر کے حامل ہیں کیا قاری پر اس کے لسانی ادراکات تہہ در تہہ کھلتے چلے جاتے ہیں کیا اس کی فکر اثر افرینی کے وصف سے متصف ہے کیا وہ زیست کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو زیر بحث لاتا ہے کیا اس میں حیات کا تمثیلاتی انداز کارفرما ہے کیا وہ خود میں قاری کی فکری آموزش کا سماں رکھتا ہے کیا اس میں ایک زندہ کہانی کے طور پر خود کو منوانے کی صلاحیت ہے کیا اس کے پیرائیہ اظہار کا تسلسل ارتقائی اندازِ فکر کا حامل ہے کیا اس کا ابتدائیہ، وسطانیہ اور اختتامیہ شدتِ احساس کا پہلو سموئے ہوئے ہے کیا اس کا پلاٹ فنی جاںبکدستی کا مظہر ہے کیا اسے قاری اپنے اردگرد کی کہانی پر محمول کر سکتا ہے کیا افسانہ اپنی جنم بھومی کی تہذیب و ثقافت کا واضح پرتو ہے کیا اس میں موجود حالات و واقعات میں ایک ربط وضبط کی فضا پائی جاتی ہے افسانہ نگاری کے حوالے سے یہ مثالی تنقیدی معروضات ہیں جو کسی بھی

افسانے کو شاہکار افسانوں کی فہرست میں شامل کرنے پر قادر ہیں ہم نے جب جلیل حیدر کے افسانے ''منت کشِ بے رخی'' کو نقد و نظر کے آئینے میں دیکھا تو ہمیں متذکرہ خصائص کی جلوہ سامانی عمق کے ساتھ نظر آئی ہے یہی سبب ہے کہ ہم اس کا انتقادی جائزہ سپردِ قرطاس کرنے پر مجبور ہوئے۔ معروف شاعر و نقاد ابوالبیان ظہور احمد فاتح ان کے افسانے کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں۔

''جلیل حیدر کا پلاٹ حیرت انگیز طور پر سادہ مگر پر کار ہے وہ ہمارے ہی سماج میں سے ایک ایسی کہانی اجاگر کرتے ہیں جو خود میں ایک جہانِ محسوسات لئے ہوئے ہوتی ہے جس کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کافی دیر تک سوچتا رہ جاتا ہے ان کے کردار نہ ماورائی ہیں اور نہ طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے ہیں حقیقتاً وہ عام لوگ ہوتے ہیں مگر ان کا کوئی وصف انہیں درجۂ تخصیص پر فائز کر دیتا ہے یوں وہ ایک ناقابل فراموش کردار بن جاتا ہے جسے مکالمات کا برجستہ استعمال اور زیادہ دلکشی عطا کرتا ہے جلیل حیدر کی اٹھان کا جب یہ عالم ہے تو دیدہ باید جب وہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار بن جاتے ہیں تو ان کا رسوخ انہیں کہاں تک لے جاتا ہے۔''

جلیل حیدر کے اس افسانے کا نام شاعرانہ اور نظمیاتی نوعیت کا حامل ہے جو اس میں موجود کہانی کا تقاضا بھی ہے اس افسانے میں ایک معروف شاعر کی شاعرانہ زندگی کے ایک واقعے کو سوانحی بپتا کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پیش کش کا انداز فطری اور حقیقی تاثر سے مربوط ہے جس میں اس کے شاعرانہ اعزاز میں ایک پر وقار تقریب کا انعقاد کسی بڑے شہر کے عالی شان ہوٹل میں کیا گیا ہے مضافاتی معاشرت سے تعلق ہونے کی وجہ سے کسی بڑے شہر کے سفر کا تجربہ بھی اس کے لئے کچھ پرانا نہیں تھا لیکن اس کی شاعرانہ شہرت کے چرچے اطراف و اکناف میں زبان زدِ عام تھے اس کے شاعرانہ اعتراف میں ہونے والا برنامج اسے احساسِ طمانیت سے سرشار کئے ہوئے تھا مسافر کوچ میں سفر کے دوران وہ باہر کے گزرتے ہوئے مناظر کو شاعرانہ زاویوں سے دیکھتا رہا اور اس کے تمثیلاتی شواہد حقیقی زندگی میں تلاش کرنے لگا وہ ان خیالات کو منظوم کرنے کا خواہاں تھا کہ موبائل فون خلل پذیری کا باعث بنی اظہارِ کوفت میں خود کلامی کے انداز میں اس نے فون کو بھی طنزیہ کلمات سے نوازا اور اس کے استعمال کے

ضرر رساں پہلوؤں پر مختصراً مگر اجمالی اظہارِ خیال کیا جونہی وہ لاری اڈے پر پہنچا تو ایک چمکتی ہوئی بڑی سفید کار اس کے پرتپاک استقبال کے لئے موجود تھی جو اسے جائے تقریب پر لے گئی ایک عوامی سیاسی لیڈر کے انداز میں تالیوں کی گونج میں حاضرینِ مجلس نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا وہ ایک ناقابل بیاں احساس مسرت سے مسرور تھا پروگرام میں اس نے خوب اپنا کلام سنایا اور سامعین نے بھی اپنے منفرد انداز میں داد و تحسین کی انتہا کر دی آخر کار رات کافی بیت چکی تھی اسے معذرت سے کام لینا پڑا پھر محفل برخاست ہونے لگی اور لوگ رفتہ رفتہ اپنے گھروں کو جانے لگے اسے بھی مجبوراً کہنا پڑا کہ وہ صاحب کہاں ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ آج رات آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اس جملے پر اس کے یارانِ سخن محوِ حیرت و استعجاب ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے بالآخر اسے اپنے انتہائی قریبی دوست سے بڑے مان سے کہنا پڑا کہ آج رات میں تمہارا مہمان ہوں دوست نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میرے گھر میں تو گاؤں سے آنے والے مہمانوں کا ہجوم ہے یوں اس نے جواز پیش کرنے کے بعد عافیت محسوس کی دوسرے دوست کو اپنی عرضداشت پیش کی تو اس نے بھی پہلو تہی کرتے ہوئے اپنی بیگم کو طالبان کا ہم پلہ قرار دے دیا مجبوراً اسے ایک غریبانہ ہوٹل میں رات بھر کے لئے قیام کرنا پڑا اور واپسی کا کرایہ بمشکل بچانے میں کامیاب ہوا پھر اس نے اپنے اس کرب کا کتھارسس نظم کی صورت میں کیا جس کے باعث وہ مسرت و شادمانی کی بازیافت میں کامیاب ہوا لیکن پھر بھی وہ اپنے ادبی رفقا کے لیے احساسِ ممنونیت رکھتا تھا کہ وہ اس خوبصورت نظم کی تخلیق کا سبب بنے یوں اس المیاتی طرز کے افسانے کا فرحت آمیز اختتام ہوا یہ افسانہ اردو کے المیہ مگر رجائیت آمیز افسانوی ادب کا نمائندہ ہے۔

افسانے کا آغاز غیر روایتی انداز میں ہوتا ہے یہ افسانہ اپنی تمام تر جزئیات کے جلو میں سفر کرتا ہے کوچ میں بیٹھے ہوئے مناظر کا آنکھوں سے تیزی سے گزرنا اور اس معاملے کا زندگی کے دیگر وقوعات سے ایک تمثیلی رشتہ قائم کرنا افسانے کے مرکزی کردار کے داخلی احساسات کی جزئیات اس کی شاعرانہ وجاہت کا بیان' سفر کی روداد کو نظم کرنے کا خیال' موبائل ٹون کی خلل انگیزی پھر اس کا تھوڑی دیر کے لئے موبائل فون کو کوسنا اس کی ضرر رسائی کا احساس' موبائل فون

کی عدم موجودگی کی عافیت' لاری اڈے سے چمکتی ہوئی بڑی سفید کار کا موصوف کے لئے محوِ انتظار ہونا پھر پروگرام میں اس پر داد و تحسین' اختتامِ محفل پر حاضرین کا اٹوگراف لینا' شاعر مذکور کو اپنی محبوبہ کا خیال آنا اور اس کی یہ خواہش کہ وہ اس کی قدر و منزلت کو ملاحظہ کرتی تو اس سے رشتہ ازدواج استوار کرنے کے سلسلے میں اعراض نہ برتتی پھر اس خیال کو اس حقیقت پسندی سے جھٹک دینا کہ وقیع اور گراں قدر الفاظ بھوکے انسان کا پیٹ نہیں بھرتے پھر اس کے احباب کا اسے اپنے ہاں رات ٹھہرانے سے انکار کرنا اپنے گھر اور بیگم کے حوالے سے مختلف النوع بیانات صادر فرمانا۔ پھر اس کا سستے ہوٹل کیبرے کا مخصوص اندازِ تکلم، سادہ کاغذ کی فراہمی سے انکار پھر موصوف کا ایک شاندار نظم تخلیق کرنے کے بعد کتھارسس کے باعث اپنے آپ کو پر اطمینان اور شانت محسوس کرنا یہ جملہ معاملات جلیل حیدر کی افسانوں جزئیات نگاری فکری وفنی بالیدگی' افسانے کے فن پر دسترس اور ان کے عمیق حسیاتی شعور کے واضح اور روشن امکانات ہیں افسانوی لحاظ سے ان کے درخشاں مستقبل کی نوید دینا قرینِ فطرت ہے۔

☆☆☆☆☆

حمیدہ سحر کی افسانہ نگاری.....
حقیقی زندگی کے تناظر میں

افسانے کی کامیابی حیات کی مشابہت و مماثلت سے عبارت ہے جو افسانہ جتنا ترجمانِ زیست ہوگا وہ اتنا ہی کامیاب و کامران ہوگا جو افسانہ نگار اپنے عصر اور معاشرے کی اپنے افسانے میں بہتر تصویر کشی کرتا ہے وہ زندۂ جاوید ہوتا ہے آج ہم حمیدہ سحر کی افسانہ نگاری کے حوالے سے رقمطراز ہیں ان کا افسانوی مجموعہ ''سحر انگیز افسانے'' مطبوعہ جنوری 2014ء ہمارے زیر نظر ہے جس میں کل بیس افسانے شامل ہیں اس سے قبل کہ ہم ان کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کریں ان کے افسانوں کے حوالے سے ارباب نقد و نظر کی آراء پیش کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

معروف شاعر اور نقاد ڈاکٹر اختر ہاشمی حمیدہ سحر کی افسانہ نگاری کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں۔

''حمیدہ سحر کے افسانے اس دور اس سماج اور موجودہ معاشرے کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں ان کی نظر حالاتِ حاضرہ پر مرکوز ہے اور وہ عمیق نظری سے اپنے اردگرد کا مشاہدہ کر رہی ہیں اور وہ اپنے انہی مشاہدات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے قرب و جوار میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر اور ذرائع ابلاغ عامہ سے منسلک ہیں۔

شاعر و ادیب اور افسانہ نگار شاعر علی شاعرؔ نے کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے۔

''وہ اپنے افسانوں کا مرکزی خیال اپنے اردگرد معاشرے میں پھیلے ہوئے موضوعات کو بناتی ہیں انہیں نہ صرف کہانی بیان کرنے کا سلیقہ آتا ہے بلکہ وہ کہانی کو افسانوی رنگ دینے کے

ہنر سے بھی اچھی طرح واقف ہیں ان کے ''سحر انگیز افسانے'' قارئین کو ضرور متاثر کریں گے۔

مشہور ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کہتے ہیں۔

''ایک ایمان دار سرکاری نوکر کی مجبوریاں اور فرض شناسی کا قصہ ہو یا ایک عورت کے گھریلو جھگڑے کی کہانی ہو وہ کسی دفتر کا منظر نامہ ہو یا کسی گاؤں کی چوپال کا افسانہ ان کا قلم ہر کردار کے ساتھ انصاف کرتا ہے منظر کشی اور کہانی کی بنت بہت سلیقے اور مہارت سے کی گئی ہے۔

ان کے چار افسانوں کے حوالے سے اپنے تجزیات پیش کرتے ہیں جو کتاب مذکور کا خمس اوّل قرار پاتا ہے۔

''ناسور'' کتاب ہذا کا اولین افسانہ ہے جس میں ایک معمولی دفتری اہل کار کی کتھا بیان کی گئی ہے جس کی مدتِ ملازمت ختم ہونے کے قریب ہے جس کی چار بیٹیوں کی ابھی شادی ہونی ہے جو ملازمت میں توسیع کا خواہاں ہے لیکن افسرِ بالا رشوت کے بغیر آمادۂ کار نہیں ہے بیگم کی طرف سے بھی اسے جلی کٹی باتیں سننائی جاتی ہیں وہ مسائل کی ایک طویل داستان ایک سانس میں سنا دیتی ہے بالآخر وہ رشوت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس طرح اس افسانے کا پُراسرار اختتام ہو جاتا ہے یہ ایک کلائمکس نوعیت کا افسانہ ہے جس میں درمیانے اور سفید پوش طبقے کی عکاسی کی گئی ہے اس کی مجبوریوں اور مصائب و آلام کا بھرپور بیان ہے رشوت کے تناظر میں افسانے کا نام ''ناسور'' بھی خوب جچ رہا ہے۔

''طوائف'' کتاب مذکور کا دوسرا افسانہ ہے جس کے مطالعہ سے ایک طوائف کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے جس سے اس طبقہ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اس افسانے میں ایک طوائف کے تمام تر دکھ درد پنہاں ہیں جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ دوسروں کے لئے تفریح طبع کا سامان کرنے والے خود کتنی رنجیدہ زندگی بسر کرتے ہیں؟

''سدِ باب'' اس افسانوں مجموعے کا تیسرا افسانہ ہے جو اگرچہ رومانوی طرز کا افسانہ ہے لیکن اس میں زیست کے تمام تر نشیب و فراز چھپے ہیں جو حیات کی تلخ و شیریں روداد پیش کرتے ہیں جس سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی کی تلخ حقیقتیں جیون کی رونق و رعنائی کو کس طرح معدوم کر دیتی ہیں اس افسانے میں ہمارے معاشرے میں موجود جنسی بے راہروی یا بے

اعتدالی پائی جاتی ہے خوبصورت غمازی کی گئی ہے جس سے ازدواجی زندگی کے حسن و قبح کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

''محبت'' سحر انگیز افسانے'' کے سلسلے کا چوتھا افسانہ ہے جہاں معاشرے کے غریب طبقے کی مجبوریوں کو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے یہ امر بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان عمر بھر اپنی ذمہ داریوں سے اعراض نہیں برت سکتا اس افسانے میں ایک عورت کی اعلیٰ ظرفی بھی دیکھی جاسکتی ہے جس نے اپنی ہمت کے بل بوتے پر نہ صرف زندگی گزاری بلکہ گھر اور بچوں کی ذمہ داریوں کو نبھایا معاشرے میں ایک معزز حیثیت حاصل کی پھر اپنے شوہر کو بھی ناگفتہ بہ حالت میں قبول کرلیا جس سے رشتوں کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

ابھی حمیدہ سحر کے افسانوی سفر کا نقطۂ آغاز ہے جو حوصلہ افزا ہے لیکن ابھی ان کے افسانے کو لسانی اور فنی چابکدستی مطلوب ہے انہیں افسانے کے پلاٹ پر خاطر خواہ توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ فنی گرفت کا حصول سہل تر ہو جائے اگر ان کا یہ سفر اسی انہماک سے جاری رہا تو مستقبل میں ان کے افسانے سے بہتر توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

خادمؔ عظیم آبادی کا قرینہ حمد و نعت

خالقِ ارض و سما کا خصوصی لطف و کرم اور نگاہِ استحسان ہے کہ اقلیمِ شعر و سخن حمد و نعت کے جواہر پاروں سے مالا مال ہے ہمارا شعری ادب حمد و نعت کی مضبوط و مستحکم اور تندرست و توانا شعری روایت کا امین ہے حبِ خدا اور حبِ رسول اس سلسلے کا ایک تلازمہ ہے مذہبیات کا مطالعہ اور عمیق ادراک بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے یہ عمل گہری احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔

آج کے شذرے میں ہم خادمؔ عظیم آبادی کے حمد و نعت کے مجموعہ ''نورِ سحر'' مطبوعہ 2011ء کے تناظر میں ان کا منتخب حمدیہ و نعتیہ کلام سلسلہ وار زیرِ تجزیہ لائیں گے یہ فن ایک بے انت ریاضت کا طلبگار ہوتا ہے ویسے تو ہر شاعر اس حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھ لیتا ہے لیکن جب کوئی دین کا شغف رکھنے والا اور پابندِ صوم و صلوٰۃ اس تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے جس میں وفورِ عقیدت و الفت کے احساسات جلوہ افروز ہوتے ہیں خادمؔ عظیم آبادی کا فنِ حمد و نعت ہمہ پہلو و ہمہ گیر ہے ان کے ہاں موضوعاتی و اصنافی تنوع بھی ضو پاشیاں کر رہا ہے ان کے کلام میں عربی و فارسی اور کہیں ہندی لفظیات کا چلن بھی جلوہ گری کر رہا ہے حمد و نعت کا سلیقہ صرف الفاظ کی شعبدہ بازی یا صرف افکار کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ خلوص اور لگن شرطِ اوّل ہے منفرد شعری وجدان، صنائع بدائع، رموز و دقائع اور عروضی محاسن کی پاسداری بھی فنی تقاضوں میں شامل ہے جو ان کے فکری و فنی کینوس کا حصہ ہے۔

ان کی کچھ حمدیات و نظمیات و مناجات قرآنی تعلیمات سے ماخوذ ہیں کہیں عقیدت کا رنگ ہے تو کہیں محبت کا طرز کہیں آموز گاری کا طور ہے تو کہیں ملت پہ غور اس کے علاوہ کہیں حب الوطنی کا عکس بھی غالب آجاتا ہے کہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کی جلوہ گری کے حوالے

ہیں تو کہیں اس کی قدرتِ کاملہ کی کرشمہ کاریوں کا اظہار پر وقار ہے کہیں محوِ مناجات ہیں تو ان کا طرزِ استدعا عاجزی وانکساری کا حامل ہے مانگنے کا رنگ ایسا ہے کہ بخشنے والا مائل بہ عطا ہو جائے اور احساسِ سپاس گزاری کا وفور بھی ہے۔

احساسِ سپاس گزاری کی حامل ایک حمد کے چند اشعار ہدیۂ قارئین ہیں۔

ہم نہ کر پائیں گے جب اپنے گناہوں کا شمار
کام آئے گی عزیز و اس کی رحمت بار بار
کوئی اندازہ نہیں انساں کو رب کے فیض کا
ہے وہی مالک فقط اور ہے وہی با اختیار
کیسی کیسی نعمتیں کر دیں عطا اس نے ہمیں
مالکِ ارض سما پہ کر دیں اپنی جاں نثار
نعمتیں ایسی کہ جن کا کچھ بدل ممکن نہیں
شکرِ رب کے سجدے کرتا کہ کرے رب تم سے پیار
کاش کچھ اعمال ہوں ایسے کہ مولا روزِ حشر
ہو تری چشمِ کرم ہو جائے نیا میری پار

یہ ایک غیر مردّف حمد ہے ردیف کے تکلف سے مبرّا و بے نیاز ہے۔ اس میں ان کی سوچ کے مختلف زاویے سامنے آتے ہیں لاتعداد گناہوں کا اعتراف بھی ہے اور مالک قدوس کی بے پایاں رحمت کا اظہار بھی ہے کہ انسان رب کے فیض کا اندازہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا لطف و کرم بعید از شمار ہے اس نے ہمیں طرح طرح کی نعمتیں ودیعت فرمائیں ہمارا حق یہ ہے کہ اس زمین و آسمان کے مالک پر اپنی جاں نثار کر دیں یہ ایک ایسا حق ہے جو جاں نثار کرنے سے بھی پورا نہیں ہوتا بقولِ شاعر۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ شعور بھی کارفرما ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کوئی نعم البدل نہیں ہے ساتھ ہی دعوتِ عمل

بھی دے دی گئی ہے آخر میں ایک حسرت کا بیان بھی ہے اس کی چشم کرم سے اپنی نیا پار کرنے کی امید بھی ہے۔

ان کے بیان میں سادگی وسلاست جاذبیت ولطف افرینی ہے جو قاری کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے اس پر وجد طاری ہوجاتا ہے قاری کو سرسری گزر جانے یا اعراض برتنے کی جسارت نہیں ہوتی۔

ایک اور حمد کا مطلع اور ایک شعر لائق توجہ ہے۔

اشکوں سے جو لبریز مرا دیدۂ تر ہے
اس میں بھی مرے رب کی محبت کا اثر ہے
وہ کون سی شئے ہے جو ترے گن نہیں گاتی
کرنوں کے بھی ہونٹوں پہ ثناء وقتِ سحر ہے

روح کل جو خدا کی روح ہے اور روح جز انسان کی روح ہے یوم الست میں ارواح کو ملن میسر آیا تھا اس کے بعد انسان کی روح فرقت کی اذیت سے دوچار ہے روح جز روح کل سے ملنے کو بے قرار ہے اس لیئے سالک کی آنکھ فرقت میں نمناک رہتی ہے یہی روداد اس حمد کے مطلع میں موجزن ہے وہ کہتے ہیں کہ مرا دیدۂ تر اشکوں سے لبریز ہے جو مرے محبوب حقیقی کی محبت کا اثر ہے عالم ہجراں میں سیلِ گریہ بھی پیار کی نشانی ہے دوسرے شعر میں ایک قرآنی آیت کے مفہوم کی ترجمانی ہے کہ کائنات کی ہر چیز خالقِ کائنات کے گن گاتی ہے تسبیح کرتی ہے کرنوں کے ہونٹ کے بھی وقتِ سحر محوِ ثناء ہوتے ہیں دوسرے شعر کا دوسرا مصرع ایک اسلوبیاتی جدت کا مظہر ہے اور فکر کی کرشمہ کاری بھی ہے۔

لیجئے حمد کے دو اور عقیدت امیز اشعار لائق توجہ ہیں۔

کھل رہا ہے ہر چمن میں اس کی عظمت کا گلاب
نور سے معمور ہے خوش رنگ وحدت کا گلاب
لکھ رہا ہوں حمد تیری نور ہے چاروں طرف
اس عمل سے بام پر ہے میری قسمت کا گلاب

خادمؔ عظیم آبادی کے ہاں اسلامی تعلیمات ونظریات اپنے پورے کروفر کے ساتھ جلوہ نما ہیں شاعرِ موصوف کو ہر کہیں اپنے محبوبِ حقیقی کی صورت جلوہ گر نظر آتی ہے جیسے میرؔ درد نے کہا تھا۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

مطلع میں جہاں ان کو ہر جگہ قدرت اپنے درشن کرا رہی ہے، وہاں فطرت کی عظمت کے گلاب بھی چشمِ بصیرت کو فروزاں کر رہے ہیں توحید کا گلاب انہیں نور سے معمور اور خوش رنگ و خوش نما نظر آتا ہے اس پوری حمد میں گلاب کی ردیف کی نادرہ کاری ایک دلکشی پیدا کر رہی ہے شعرِ ثانی میں وہ حمد نگاری کی برکات و فیوض کا ذکر کر رہے ہیں اور اس سعادت کی بدولت اپنی قسمت کے گلاب کو بام پر دیکھتے ہیں۔

ایک اور مقطع دیکھئے۔

اسمِ خدا ہے خادمؔ سب سے بڑا سہارا
مشکل کشا وہی ہے بندہ نواز بھی ہے

شاعر زمینی سہاروں کا بطلان کر رہا ہے اور حقیقی سہارے کو آشکار کر رہا ہے کیونکہ وہی مشکلیں آسان کرتا ہے اور وہی انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے جیسے راقم الحروف کا ایک مقطع ہے۔

سہارے یہ سب عارضی سے ہیں ناقدؔ
سہارا ہے اک ان سہاروں سے آگے

حمد کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو

مشہور ہے سخاوت حاتم طائی جہاں میں
اس کو بھی ہے عطا تیری وہ بے اختیار ہے

شعرِ ھذا ایک تلمیحی حوالے کا حامل ہے حاتم طائی کی سخاوت کے قصے تاریخ میں بہت مشہور ہیں شاعر یوں عرض پرداز ہے کہ اس کی سخاوت بھی بے اختیار ہے اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب تیری عطا ہے خادمؔ عظیم آبادی کا ایک اور وصفِ خاص ہے کہ وہ اسلامی تہذیب وتمدن کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اور اس کے خدوخال اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ شعر بھی

اسی سلسلے کی کڑی ہے ان کی حمد کے اکثر و بیشتر اشعار میں خدائی صفات کا بیان ذیشان ہوتا ہے یہاں بھی قادرِ مطلق کی صفتِ سخاوت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ایک اور شعر دعوتِ تبصرہ دے رہا ہے۔

عالمِ ہست و بود میں تیرے وجود کا ظہور
اپنی سمجھ سے ماورا، تیرے لیئے وہ ممکنات

ان کی حمدیات میں فارسی الفاظ کا چلن بھی عام ہے ان کے حمدیہ اشعار میں ہمہ اوست اور ہمہ از اوست دونوں نظریئے کارفرما ہیں وہ اپنے اشعار کو مختلف فکری پیرہن عطا کرتے ہیں اس شعر میں یوں گویا ہیں کہ دونوں عالم میں اے خدا تیرے وجود کا ظہور ہے اور یہ امر اپنی سمجھ سے بالاتر ہے جسے ہم سمجھ نہ پائیں جو ہمارے لیے مشکل ہو وہ تیری ذاتِ بابرکات کے لیے بہت آسان ہے۔

اب ان کا رنگِ استدعا دیکھتے ہیں۔

امن و اماں آئے وطن میں مرے کریم
اب اس کے دشمنوں کا کہیں بھی نشاں نہ ہو

یہاں وہ محو مناجات ہیں اور پاک دھرتی کے لیے دعا کر رہے ہیں کہ میرے وطن کو امن و امان کا گہوارہ بنا اور اس کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے ان کی حمد میں ایسے موضوعات جن کا تعلق براہ راست خدا یا بالواسطہ طور پر خدا کی ذات سے ہو وفور سے پائے جاتے ہیں ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو حب الوطنی کا مظہر ہیں۔

اب ذرا ان کے نعتیہ اشعار زیرِ تجزیہ لاتے ہیں ان کی نعت حب رسول کا مظہرِ عالیہ ہے جس میں نبی آخر الزماں کی صفات کا بیان ہے اور سیرتِ طیبہ کے حوالے بھی شامل ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جس نے سیرت النبی کا مطالعہ اختصار و جامعیت کے ساتھ کرنا ہو وہ خادم عظیم آبادی کی نعت زیرِ مطالعہ لائے ان کے دروں میں حب رسول کا بحرِ بیکراں ہے جو قاری کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے ان کی نعت میں بے پناہ فکری وسعت پائی جاتی ہے اسی حوالے کا ایک شعر دیکھتے ہیں۔

جب بھی لکھیں گے وصفِ نبی پر کتاب ہم
قرطاس کم پڑیں گے ضخامت نہ پوچھیے

درود پاک ایک ایسی فضیلت کا حامل ہے جس کے پڑھنے سے مشکل کام آسان ہوجاتے ہیں اگر کسی کام کے آغاز سے پہلے پڑھ لیا جائے اور انسان صاحب عقیدت بھی ہو تو اسے ضرور کامیابی ہوتی ہے خود خدا کی ذات بھی آپ کی ذات پر درود بھیجتی ہے یہ محبت کا ایک سلیقہ ہے جس کے پڑھنے سے دونوں جہانوں کے مرحلے آسان ہوجاتے ہیں اسی نوعیت کا یہ شعر دیکھیں۔

جو کام بھی کیا تو پڑھا پہلے ہی درود
اس سے جہاں کے مرحلے آسان ہوگئے

خادمؔ عظیم آبادی کے افکار اقبالؔ سے بھی مماثلت رکھتے ہیں مذکورین اتحاد و اتفاق کا درس دیتے ہیں اور مسلمانوں میں یگانگت کے خواہاں ہیں کہ موافقت و موانست کی وہ فضا قائم ہو جس کی عملی تصویر سرورِ کونین کے عہد میں دیکھنے کو ملی ان کی یہی خواہش اس شعر میں یوں جلوہ گر ہورہی ہے۔

ایک ہوجائیں مسلماں کاش ہم ایسا کریں
پھر سے ملت آپ کی زندہ و تابندہ کریں

وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں وہ سنتوں کا فروغ چاہتے ہیں سنت کے خلاف انہیں کچھ بھی گوارا نہیں ہے ان کی حساسیت کو قلق پہنچتا ہے جب وہ سماج میں سنن کی خلاف ورزیاں ملاحظہ کرتے ہیں پھر وہ مجبور بیاں ہوجاتے ہیں کہ ہمارے دعوے کھوکھلے اور بے بنیاد ہیں ہم کہاں باکردار ہیں ہمارے کردار داغدار ہیں۔ امت کا یہ غم انہیں چبھن کی طرح محسوس ہوتا ہے فرقہ بندی کے خلاف ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنے فرقوں میں بٹنے کے باوجود بھی ہم شاداں و فرحاں ہیں جو ہماری بے راہ روی کی مبینہ دلیل ہے انہیں خیالات کو ان کی زبانی دیکھیں اور ان کی اسلوبیاتی سادگی کا حظ اٹھائیں۔

کتنی باتیں مختلف ہیں آپ کی سنت سے آج
پھر بھی دعویٰ ہے ہمارا کتنے باکردار ہیں؟

اک ستم امت میں یہ بھی ہوگیا ہے آج کل
فرقوں فرقوں میں بٹے ہیں اور سب سرشار ہیں

وادیٔ بطحا وطیبہ میں جہاں دیگر متفرقات ہیں وہاں ایک بہت بڑا فرق لوگوں کے رویّوں کا ہے مکہ کے لوگ سخت مزاج کے حامل ہیں کیونکہ خداوند کی صفت قہاری وجباری کا معمولی حصہ انہیں ودیعت ہوا ہے جب کہ رحمت العالمین کے شہر مدینہ کے لوگ انتہائی نرم دل اور خلوص کی دولت سے مالا مال ہیں یہ سب ہمارے نبی کی رحمت کا فیضان ہے جس پہ جہاں حیران ہے یہی منظر اسی شعر میں بھی جلوہ نما ہورہا ہے۔

کتنے سادہ لوگ ہیں شہر محمد میں مقیم
بات میں نرمی ہے سب کے یہ کرم آقا کا ہے

القصہ مختصر خادم عظیم آبادی کی حمد ونعت منفرد شعری مزاج اور معیار کی حامل ہے جس میں سلاست وروانی بھی ہے اور عروضی تقاضے بھی احسن طریقے سے پورے کیے گئے ہیں تاثیر کی دولت بھی بے پایاں ہے خلوص کا بحر بیکراں ہے عقیدت کی زوردار موجیں ہیں ادراکات کی بے شمار کرنیں ہیں جو انسانی بصیرت کو مہمیز کرنے پر قادر ہیں وہ اقبال کے فکری مقلد ہیں جو کام اقبال نے اپنی غزلوں اور نظموں سے لیا وہی مقصد خادم عظیم آبادی نے اپنی حمد ونعت سے پورا کرنا چاہا جس میں وہ کامیاب ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں وہ ملتِ اسلامیہ کا عمیق درد رکھتے ہیں اور اس دکھ درد کو ذاتی دکھ درد سے فزوں تر جانتے ہیں دعا ہے ان کی کاوشیں زادراہ ٹھہریں اور ان کا یہ سفر سعادت تاحیات جاری وساری رہے۔ آمین

☆☆☆☆☆

دُردانہ نوشین خان کی برجستہ افسانہ نگاری

خالقِ کائنات، موجودات ومعدومات نے اپنی تمام ارضی وسماوی تخلیقات کو حسین وجمیل خلق فرمایا۔ اس نے اپنی ہر تخلیق میں کچھ خواص رکھ دیئے۔ حضرتِ انسان کو اس سنسار کا شاہکار قرار دیا گیا۔ روئے ارضی پر اسے کلیدی حیثیت حاصل ہے اور اسے تمام تر فطری حسیات سے بھی نوازا گیا۔ نہ صرف اپنے ادراکات کا کھوج لگاتا ہے بلکہ ادراکاتی فروغ کا التزام وانصرام و استحکام بھی کرتا ہے۔ اگر یہ عمل فطری اور بے تکلفانہ انداز میں وقوع پذیر ہو تو اس کی اہمیت وفوقیت اور افادیت ومقبولیت مسلمہ ومصدقہ ہوتی ہے۔ اپنے اس انتقادی شذرے میں ہم معروف افسانہ نگار دردانہ نوشین خان کے حوالے سے رقمطراز ہیں جو مذکورہ خصائص سے متصف ہیں۔ جن کے سوانحی کوائف اختصار وجامعیت کے پیرائے میں سپردِ قرطاس ہیں۔

دردانہ نوشین خان کی پیدائش مظفر گڑھ میں ہوئی جو علمی وادبی اعتبار سے ایک زرخیز خطۂ ارضی ہے، جس نے شعروادب کی مہان ادبی شخصیات کو جنم دیا۔ ان کے والدِ گرامی کا نام غلام محمد خان' قلندرانی بلوچ (مرحوم) ہے جن کی رسمی تعلیم بی اے تھی اور محکمہ انہار سے وابستگی تھی۔ دردانہ نوشین خان نے ابتدائی تعلیمی مدارج مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی میں ہی طے کیے۔ گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ سے بی اے اور بی ایڈ کیا۔ انگریزی ادبیات اور سیاسیات میں پوسٹ گریجویٹ کیا۔ علاقہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ٹی او ایف ایل کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ ماہرِ مضمون کے عہدہ پر بھی فائز رہیں۔ درویش منشِ طبع کے باعث ملازمت ترک کردی۔ لیل ونہار کا مصرف یادِ الٰہی اور خامہ وقرطاس کی خدمت کو بنایا۔ ان کے شام وسحر ادب کی سیوا کے حوالے سے جنون کی حد تک نماز ہیں۔ 2005ء میں سعادتِ حج بیت اللہ بھی حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے شوہر ارشد حفیظ مخدوم پیشۂ بینکاری سے وابستہ ہیں اور ایک اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے

خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو ان کے ادبی معاملات میں معاون و مددگار ہیں۔ ان کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ لکھنے کا آغاز ماہنامہ "دوشیزہ ڈائجسٹ" سے کیا اور انہیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ان کی چار کتب مطبوعہ ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔	پہلا زینہ	(افسانے)	مطبوعہ 2002ء
۲۔	اندر جال	(ناول)	مطبوعہ 2007ء
۳۔	ریت میں ناؤ	(افسانے)	مطبوعہ 2010ء
۴۔	پھولوں کی رفوگری	(نثری نظمیں)	مطبوعہ 2013ء

ابھی تک ان کی چار وقیع اور گراں قدر کتب منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ تاہم مزید تخلیقی ارتقا سبک روی سے روبہ منزل ہے۔ دردانہ نوشین خان بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، لیکن انہوں نے ناول اور نثری نظم کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔

دردانہ نوشین خان کے اجتماعی تخلیقی کارناموں کے حوالے سے خامہ فرسائی کے لئے تو دفتروں کے دفتر درکار ہیں۔ تاہم "مشتے از خروارے" کے بمصداق ان کے دوسرے افسانوی مجموعہ "ریت میں ناؤ" مطبوعہ جون 2010ء کو زیرِ تجزیہ لاتے ہیں۔

مجموعہ ھذا کے حوالے سے معروف نقاد ڈاکٹر رشید امجد کچھ یوں رقمطراز ہیں:

"دردانہ نوشین خان کی افسانوں کی قرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے روئیوں کو گرفت میں لا کر ہنرمندی سے کہانی کی تعمیر کرتی ہیں۔ وہ کہانی کی تعمیر کرتے وقت جہاں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں میں پیوست رہتی ہیں، وہاں کرداروں کے ذریعے قاری کے ذہنوں پر دستک دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی اپنے کرداروں کے ذہنی مطالعہ پر گرفت اس قدر مضبوط ہوتی ہے، اس عمارت کی فضا میں سانس لینے والے کو قطعی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی بلکہ خود کو عمارت کا حصہ سمجھتا ہے۔"

دردانہ نوشین خان کا افسانہ اظہار کی برجستگی و بے ساختگی، بے تکلفی اور فطری پن سے مربوط ہے جو زیست کا جزئیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے، وہ حیات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو افسانے کا حصہ بناتی ہیں جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقی زندگی کا عمیق ادراک رکھتی ہیں اور ہر جزو کو نظری عمق سے ملاحظہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں گیرائی و گہرائی کے

فلسفے کارفرما نظر آتے ہیں۔ وہ حیات کی معمولی حقیقتوں سے اپنے افسانوی حسن کو آشکار کرتی ہیں۔ ان کی افسانوی فضا میں ایک جزئیاتی مرصع کاری کارگر نظر آتی ہے۔

ان کا افسانہ عصری رویّوں کا بھرپور غماز ہے جس میں عہدِ موجود کی واضح اور نمایاں جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری عصری رجحانات و میلانات سے ہم آہنگ بھی ہے، وہ اپنے افسانے کے توسط سے اپنے عہد کو بھرپور انداز میں متاثر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جو ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

انتقادی اکائی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور قارئین کی طبعِ نازک کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تاکہ ان پر طوالتِ شذرہ گراں بار ثابت نہ ہو۔ مجموعہ ھذا کے دو افسانوں کو شاملِ تجزیہ کرتے ہیں اور ایک استخراجی عمل کے نتیجے میں ان کی افسانہ نگاری کی تصویر کشی کی سعیِ بلیغ کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''سرخ گلاب کے دن'' اور ''صافی'' اور ''رومال'' شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔

''ریت میں ناؤ'' میں کل انیس افسانے شامل ہیں۔ ''سرخ گلاب کے دن'' کتاب کی ترتیب کے اعتبار سے دسواں افسانہ ہے جس کا آغاز غیر روایتی طور پر پند و موعظت کے انداز میں ہوا ہے جس میں تنبیہاتی واژگونی و سنگینی بھی پائی جاتی ہے۔ اس افسانے میں طبعِ انسان کی ایک فطری سچائی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو ایک تلخ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ انسان صرف اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اور اس کی تمام تر محبتیں اسی احساس کے گرد گھومتی ہیں۔ اس افسانے میں دردانہ کی اظہاری بے تکلفی اور برجستگی کھل کر سامنے آئی ہے۔ ان کا اسلوب ہر نوع کے تصنع و تکلف سے مبرا و ماورا ہے۔ اسلوبیاتی اشتہاد کے طور پر ان کے اس افسانے کا ایک اقتباس نذرِ قارئین ہے۔

''آئی لو..... آئی..... لو..... بٹ اونلی مائی سیلف، سن لیا تم نے؟ ہاں یہی ایک فطری سچائی ہے۔ انسان، حیوان ہر جاندار اپنے آپ سے پیار کرتا ہے حالانکہ پیکرِ خاکی کی ساری دوڑ اپنے آپ کے محور پر ہوتی ہے۔ ذات سے انخلا اس کی کیمسٹری میں ہی نہیں، ارے کوئی مہان دیوتا تھا جس نے یہ قول دیا کہ اپنی ذات عشق سے سچا باقی سب افسانے ہیں۔''

''صافی اور رومال'' بلحاظِ ترتیبِ کتاب گیارہواں افسانہ ہے جو ایک گھریلو اور مضافاتی معاشرت کی عکاسی کرتا ہے، جس میں گھر گرہستی کے ادراکات بھی مبینہ طور پر مطالعہ کیے

جاسکتے ہیں۔ افسانے کا عنوان اس کے موضوع کے اعتبار سے خوب جچ رہا ہے جس میں ایک گھریلو اور مضافاتی خاتون کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جس کا ''صافی'' کو ''رومال'' بنانا، اس کی کثرتِ مصروفیت کا عکاس ہے۔ یہ ایک کلائمکس اور بیانیہ طرز کا عمدہ افسانہ ہے، اگر ان کے افسانوں کا ارتقا فرطِ تسلسل سے روبہ جادۂ منزل رہا تو افسانوی دنیا میں اپنی نمایاں شناخت بنانے کے عمل میں کامیاب و کامران ٹھہریں گے۔

☆☆☆☆☆☆

ذوالفقار گادھی کی خارجیت آمیز شاعری

مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ انسانی فراست و ذکاوت بھی محوِ ارتقاء رہی۔ انسان صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد آج اس مقام پر کھڑا ہے۔ اس لئے اس کا دماغ و شعور تجربات و مشاہدات کا ایک گراں قدر مخزن رکھتا ہے۔ اس نے افکار و نظریات کے ابلاغ کے لئے اظہار کے مختلف پیرائے دریافت کیے ان ذرائع میں ایک معتبر پیرائیہ اظہار شاعری بھی ہے جو اثر آفرینی کے خصائص سے مالا مال ہونے کے باعث درجۂ قبولیت پر فائز ہے۔ جس طرح ہر شعبۂ حیات ترقی کے مختلف مدارج سے گزرتا ہے پھر اس میں جدت و تنوع کے مظاہر آشکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں پھر اس میں ایک درجہ بندی کا مقام آتا ہے۔ اسے مختلف حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے یہی معاملہ فنِ شاعری کا ہے جسے ہیئتوں اور موضوعات کے دائروں میں رکھا جاسکتا ہے شعری پیرائیہ اظہار کو داخلی اور خارجی اظہار سے موسوم کیا گیا ہے شاعر کے درونِ ذات کے جذبات و احساسات اور خیالات داخلیت سے متعلق ہوتے ہیں جب کہ خارج سے علاقہ رکھنے والے معاملات و تخیلات خارجیت سے نسبت رکھتے ہیں ہر شاعر کا اپنا مخصوص زاویۂ اظہار ہوتا ہے کوئی داخلیت پر دسترس رکھتا ہے تو کوئی خارجیت میں ید طولی رکھتا ہے آج ہم ذوالفقار گادھی کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کے کلام میں خارجیت کے شواہد بکثرت ہیں ان کا اولین شعری مجموعہ "دریچہ بے صدا" مطبوعہ 2014ء ہمارے زیرِ نظر ہے۔

ان کے فکری کینوس پر حزن و ملال کا رنگ چھایا ہوا ہے وہ کائناتی مصائب و آلام کا مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہیں جہاں میں رونقیں اور عنائیاں انہیں معدوم نظر آتی ہیں شب ظلمت انہیں دراز محسوس ہوتی ہے لیکن رجائیت اور عزم و حوصلہ ان کے رگ رگ میں سرایت ہے اس

لئے ان کے ہاں انقلاب آفریں درس ملتا ہے وہ جہدِ مسلسل کے قائل ہیں اس لئے افکار میں ایک شکتی نظر آتی ہے عصری آشوب کی تمثیلات پر زور انداز بیان کی حامل ہیں سماجی بے حسی کی ایک بازگشت سنائی دیتی ہے اخلاقی اقدار کی پامالی کا کرب عندالبیان مترشح ہو رہا ہے یوں بالواسطہ طور پر مکارم اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

ان کے موضوعات میں ایک تنوع اور تلون کی فضا پائی جاتی ہے، مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہونے کی کیفیات بھی ملتی ہیں عصری روئیوں کا مذکور بھی دیدنی ہے حقیقت پسندی کے مظاہرے ان کی فکری بالیدگی پر دلالت کرتے ہیں زندگی کرنے کی آموزش بھی ان کے کلام کا حصہ ہے ان کی لفظیات میں ہندی بھاشا کی سُندرتا اور کوملتا ہے شبدوں کی کرشمہ کاری ہے بہر حال ان کے شعری کینوس میں خارجی عوامل کی کرم فرمائی بخوبی ملاحظہ کی جاسکتی ہے ابھی انہوں نے جہانِ فن کے ہفت آسمان سر کرنے ہیں اگرچہ منزل بہت دور ہے لیکن ان کی شعری صلاحیتیں ان کی قوتِ متخیلہ کے نئے امکانات کا پتا دیتی ہیں۔

ان کے مذکورہ مجموعہ سے چند شعری استشہادات نذرِ قارئین ہیں۔

دور تک ہے دھواں ہی دھواں
چل سکو تو سحر تک چلو

روشنی کا مگر دور ہے
دور حدِ نظر تک چلو

وقت مرہم کہاں لگاتا ہے
زخم دیتا ہے بھول جاتا ہے

تونے دیکھا ہے اپنے گرد کبھی
آدمی آدمی کو کھاتا ہے

اپنی مرضی چلانے آتے ہو
یا مجھے آزمانے آتے ہو

یہ بھی کیا بات ہے جو تم اکثر
اپنے احساں جتانے آتے ہو

کاغذی گلابوں میں سادگی نہیں ملتی
موسمی ہواؤں میں تازگی نہیں ملتی

ساز دھڑکن کے تھم گئے ہیں اب
جینے والے تو کیا نہیں کرتے؟

دنیا والو اجاڑ کر ہم کو
ہاتھ افسوس کے ہو اب ملتے

کیوں پاٹ کروں نا گیتا کا
یہ گیتا پاک کویتا ہے

☆☆☆☆☆

رفیع الدین راز اور ناقدانہ رویے

تنقید کا خمیر انسان کی سرشت میں ہے اس لیے انسان جب بولنے کے عمل کا آغاز کرتا ہے تو اس کے تنقیدی رویے بھی آشکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں قبل ازیں خدوخال کے تیور اور اس کی حرکات وسکنات سے بھی اس کی تنقیدی سوچ کی غمازی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بچے بہت زیادہ ناقدانہ طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں وہ اپنے والدین، اساتذہ، اپنے ساتھیوں اور اپنے اردگرد کو تنقیدی انداز میں دیکھتے ہیں اور ان کے رویوں میں استفہامیہ اور استفساری اشاریے وفور سے ملتے ہیں علاوہ ازیں حیوانات وحشرات اور کچھ دیگر مخلوقات میں بھی حسِ تنقید پائی جاتی ہے تنقید فکر کا وہ وصف خاص ہے جس نے اپنے لیے زندگی کے ان شعبوں اور موضوعات میں بھی گنجائش پیدا کر لی ہے جہاں ازمنۂ گزشتہ میں قرینِ قیاس نہیں تھی اس لیے ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تنقیدی رویوں کی اہمیت مسلمہ ومصدقہ ہے جو شخص ناقدانہ طرزِ فکر سے عاری ہے اس کی مثال ایک ایسے فرد سے دی جا سکتی ہے جس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو۔ افکار میں انقلابی تغیر صرف ناقدانہ رویوں کا مرہونِ منت ہے اب تو انسان نے فطرت اور رومان جیسے موضوعات کو بھی تنقیدی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا عمل شروع کر دیا ہے اس وقت رفیع الدین راز کا چوتھا شعری مجموعہ ''اتنی تمازت کس لیے؟'' مطبوعہ 2007ء ہمارے سامنے ہے جس کے بعد ان کی دو اور کتابیں نعتیہ مسدس ''روشنی کے خدوخال'' اور نظموں کا مجموعہ ''ابھی دریا میں پانی ہے'' منظرِ عام پر آئیں ان کے شعری کینوس میں ناقدانہ رویے فرطِ تسلسل سے ملتے ہیں جو ان کے ایک مستقل فکری حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں یہاں ہم ان کے اول الذکر شعری مجموعے کے خمس اول کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار مذکورہ موضوع کی نسبت سے زیرِ

تجزیہ لا رہے ہیں۔

رفیع الدین رازؔ حیات و کائنات کو تنقیدی زاویئے سے دیکھنے کے قائل ہیں اس لیے ان کا طرزِ اظہار فلسفیانہ نوعیت کا ہے حتیٰ کہ وہ اپنی ذات کو بھی ایک کڑے تنقیدی عمل سے گزارتے ہیں بسا اوقات وہ زیست کو غالبؔ کی طرح مضحکہ خیز زاویوں سے بھی دیکھتے ہیں اور اسے اپنا کمال فن گردانتے ہیں ان کی ایک غزل کا ایک شعر دیدنی ہے:

ہم نے کچھ گرد و کثافت مل دی اُس کے جسم پر
لو ہمیں بھی آئینے پر مسکرانا آ گیا

ان کی تنقیدی تخیلات کی اُڑان بہت بلند ہے حتیٰ کہ قدرت بھی ان کے تنقیدی اہداف میں شامل ہے ان کے افکار بسیط و عمیق ہیں خیالات ہمہ پہلو اور ہمہ گیر ہیں ایک گیرائی و گہرائی ہے جو بین السطور جلوہ سامانی کرتی دکھائی دیتی ہے ان کے ہاں مضمون آفرینی زبردست نوعیت کی ہے جو قلب و خرد کو بھرپور انداز میں متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے انہیں احساسات سے مملو ان کی ایک غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

تھام کر انگلی اگر تا عمر چلنا ہے تو پھر
یہ تصور، یہ سماعت، یہ بصارت کس لیے
ساتھ تیرا ہر قدم پر ہے تو پھر اتنا بتا
پڑتی رہتی ہے مجھے اپنی ضرورت کس لیے

نقدِ فکر کا ایک روپ نالہ و شیون بھی ہے رفیع الدین راز کے ہاں شکوہ و شکایت کی حکایت بھی بھرپور انداز میں ملتی ہے جس کے باعث ان کی فکر کا حزنیہ پہلو نمایاں ہو جاتا ہے زندگی سے طرب و تمکنت کے معدوم ہونے کی بپتا پورے شد و مد سے ملتی ہے۔

سبب کیا ہے جو ہونٹوں پر تبسم کا قصیدہ ہے
عروسِ زندگی شاید ابھی تک آب دیدہ ہے

ان کی قوتِ متخیلہ بڑے بڑے فلسفے تخلیق کرنے کی قدرت رکھتی ہے اس لیے ان کے افکار میں نادرہ کاری جلوہ گر نظر آتی ہے رفعتِ تخیل کے بھرپور شواہد ان کے کلام کا طرۂ

امتیاز ہے۔

دوست کی خاطر نہ دشمن کی نصیحت کے لئے
آئینے کا ذکر ہے اپنی ضرورت کے لیے
خاک سے تخلیق کرنے کا سبب شاید تھا یہ
آدمی کو وقف کر دینا تھا، ہجرت کے لئے

دنیا کا مشکل ترین کام اپنی ذات کا محاسبہ کرنا یا خود تنقیدی کے عمل سے گزرنا ہے اور وہ اپنی ذات میں یہ جسارت رکھتے ہیں ناقدانہ طرز فکر کے باعث ان کے ہاں شکوک وشبہات اور خدشات کا بھی ایک غالب عنصر ملتا ہے۔

عین ممکن ہے گواہی دوں میں خود اپنے خلاف
اعتبار اتنا تو رکھتا ہوں میں اپنی ذات پر
ہاں مجھے بھی اک گماں سا ہے کہ ہستی کی بنا
غالباً رکھی گئی ہے نت نئے خدشات پر

رفیع الدین راز کے فکری وفنی گوشوں کی سیر حاصل سیر کے بعد یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوئی ہے کہ ان کے کلام میں ناقدانہ طرز فکر کے بھرپور شواہد ضو پاشیاں کر رہے ہیں ان کا اسلوب سادگی کا حامل ہے انہوں نے زیادہ تر مفرد اور رواں دواں بحور میں سخن سنجی کی ہے ان کی شاعری میں مزید امکانات روشن ہونے کی نوید ملتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی.....شاعرِ بحرِ تجلیات

حمد و نعت کا فن عمیق ریاضت کا متقاضی ہے جس کے تلازمات میں جسمانی روحانی ریاضتوں کے پہلو بہ پہلو قرآن و حدیث' سیرت النبی اور اسلامی تعلیمات کا گہرا شوق و شغف شامل ہے صرف روایتی حبِ خدا اور حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تخیلات حمد و نعت کو فکری بالیدگی سے ہم آغوش نہیں کر سکتے مذکورہ مبادی اصولوں کے ساتھ ساتھ فنِ شاعری پر بسیط دسترس حاصل ہونا بھی انتہائی ناگزیر ہے جس کے لئے طویل المیعاد مشاطگیٔ عروسِ سخن مطلوب ہے اس سلسلے میں متقدمین و متوسطین و متاخرین کی حمد و نعت کا مطالعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس سے حمد و نعت کے ارتقائی سفر کی جانکاری میسر آئے گی ایک حمد و نعت گو شاعر کے لیے حمد و نعت کے انتقادی اصولوں سے بھی آشنا ہونا ضروری ہے تاکہ اس کے فنی ادراکات جلا پاتے رہیں اور ان کا اہتمام اپنے ہاں کرنے میں کامیاب ہو جائے نعت گوئی کے حوالے سے عمومی مشاہدے میں آیا ہے کہ شعرا اسلامی تعلیمات کے فقدان کے باعث غلو سے کام لیتے ہیں حالانکہ ایسی اعلیٰ اور ارفع ذاتِ ستودہ صفات کے لیے مبالغہ آرائی کی قطعاً نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بین السطور ایسے افکار پائے جاتے ہیں جن کے حوالے سے قرآن و حدیث اور سیرت النبی سے کسی قسم کی صراحت نہیں ملتی بہت ہی کم نعت گو شعرا ایسے ہیں جن کی نعت ہر قسم کے غلو سے مبرا و ماورا ہے ان معدودے چند معتبر نعت گو شعرا میں ریاض ندیم نیازی کا نام نامی بھی شاملِ فہرست ہے جنہوں نے عمدہ نوعیت کی حمد گوئی بھی کی ہے ان کے افکار میں جابجا عرفانِ خالقِ کائنات ضو پاشیاں کرتا دکھائی دیتا ہے شذرہ ھذا میں ہم ان کی حمد و نعت گوئی کے حوالے سے رقمطراز ہیں ان کا مجموعۂ حمد و نعت بعنوان 'سحر

تجلیات" ہمارے زیرِ نظر ہے جس کے نصف اوّل کی منتخب حمد و نعت کے منتخب اشعار بطور استشہادات شاملِ تجزیہ ہیں۔ مذکورہ کتاب کی طباعت اگست 2012ء میں عمل میں آئی قبل ازیں واضح رہے "خوشبو تری جوئے کرم" سے موسوم نعتیہ مجموعہ مطبوعہ فروری 2010ء بھی اربابِ نقد و نظر سے داد و تحسین سمیٹ چکا ہے اول الذکر نعتیہ مجموعہ کی نسبت سے ہم یہ مذکور لازمی گردانتے ہیں کہ کراچی کے دبستانِ وارثیہ نے جو ردیفی نعتوں کے مشاعروں کی طرح ڈالی ہے وہ انتہائی خوش آیند ہے اس خوبصورت روایت کے زیرِ اثر ریاض ندیم نیازی کے ہاں بھی ایک ایک ردیف کے تحت بہت سا حمدیہ و نعتیہ کلام موجود ہے جو ان کی فکری و فنی دستگاہ کی علامت ہے۔

خدائے بزرگ و برتر کی ذات سراپا فیوض و برکات ہے جس کے بنی نوع انسان پر الطاف و اکرام کے لامتناہی سلسلے جاری و ساری ہیں ابنائے آدم پر اس قادرِ مطلق کی اطاعت ہر رنگ، ہر حالت اور ہر عالم میں فرض ہے ایک عبدِ حقیقی کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ دل میں محبوبِ حقیقی کی الفت کی شمعیں ہر دم فروزاں رہیں یہی حق عبدیت اور طرزِ الفت ہے اسی نوع کی بے پایاں محبت کا اندازہ ان کی حمد کے دو اشعار میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

جسم و جاں کو روشنی دے اس کی رحمت کا چراغ
خلوت و جلوت میں روشن ہو اطاعت کا چراغ
میرے دل میں ہے فروزاں تیری الفت کا چراغ
ہے مری آنکھوں میں روشن تیری عظمت کا چراغ

مدحتِ باری تعالیٰ کلیۂ فیوض و برکات ہے اُس پاک ذات کی حمد و ثناء سراپا عبادات اور باعثِ جملہ ترقیات ہے انسان کی دینی و دنیاوی فلاح کا راز اس میں مضمر ہے جس سے روح کو بالیدگی۔ دل کو پاکیزگی اور جاں کو شگفتگی میسر آتی ہے خرد اور نگاہ کا فروغ اسی کا مرہونِ منت ہے جب ایک شاعر خالقِ ارض و سما کی تحمید کو وظیفۂ لوح و قلم بناتا ہے تو پھر اس کا ذوقِ ہنر ثریا کی رفعتوں پر کمندیں ڈالنے کی اہلیت رکھتا ہے اسی نسبت سے ان کی حمد کے دو روح پرور اشعار لائقِ التفات ہیں یہ امر دیدنی ہے کہ انہوں نے ایک مشکل ردیف کو کس قادر الکلامی سے برپایا۔

حمد باری میں ہے پوشیدہ بشر کا ارتقا
ہے اسی میں جاں کا دل کا اور نظر کا ارتقا
ہے مری نوکِ قلم پر صرف حمدِ ربِ پاک
حمد ہی سے ہے مرے ذوقِ ہنر کا ارتقا

فکری اور اسلوبیاتی اعتبار سے ان کی حمد اپنے جلو میں ایک بے انت دلکشی سموئے ہوئے ہے حب خدا میں ڈوبی ہوئی کیفیات ہیں وجدوحال کے معاملات ہیں نادر النظیر تشبیہات و استعارات ہیں بین السطور کہیں کہیں قرآنی تعلیمات کی جھلک بھی ضوفشانی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ان کی حمد میں ہمہ اوست اور ''ہمہ از اوست'' کا فلسفہ بھی جلوہ سامانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ریاض ندیم نیازی کی حمد سے حمد کے فروغ کا درسِ زریں نمو پاش ہو رہا ہے اسی تناظر میں ان کی حمد کے تین اشعار پیشِ خدمت ہیں ۔

تری حمد کے جگمگائے ہیں تارے
کہ جب ہوگیا دیدۂ تر چراغاں
ہیں مصروف سب تیری حمد و ثنا میں
شب و روز ہوتا ہے گھر گھر چراغاں
لکھے جائیں اشعار حمدِ خدا کے
کیے جائیں یوں ہی سخنور چراغاں

ریاض ندیم نیازی کی حمد و نعت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کے ہاں افراط و تفریط والا معاملہ نہیں ہے جو اکثر نعت گو شعرا کے ہاں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ان کی نعت کا یہ وصف جلیلہ انہیں اپنے ہمعصر نعت گو شعرا سے ممتاز و منفرد کرتا ہے وہ حمد کو حمد کے درجے اور نعت کو نعت کے زمرے میں رکھنے کے قائل ہیں اسی نوعیت کا ان کی حمد کا ایک مطلع زیبِ قرطاس ہے ۔

ہے احترامِ نبی تیرے احترام کے بعد
نبی کا نام جو لکھوں تو تیرے نام کے بعد

خالق ارض و سما کی ذات فوادو جواد ہے اس نے اپنی تمام مخلوقات پر اپنے لطف و رحم کو

مساوی بنیاد پر استوار کیا ہے اس لئے تمام مظاہر فطرت کے فوائد و ثمرات اس کی تمام تخلیقات کے لئے یکساں ہیں روشنی، پانی اور ہوا یہ وہ نعمتیں ہیں جو سب کے لئے برابر نوعیت کی ہیں۔ اس اعلیٰ وارفع خیال کو شاعر موصوف کی زبانی دیکھیے۔

روشنی ، پانی ، ہوا دیتا ہے رب مخلوق کو
کم نہیں ہوتی ہے اُس جود و سخا کی آن بان

عند البیان اسلامی تعلیمات کی جلوہ آرائی اُن کی خامہ فرسائی کے حسن کو فزوں تر کر رہی ہے اُن کی حمد سے بسیط رجائی امکانات کی مشعل فروزاں ہے جو دور از قیاس نور پاشیاں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

ندیم اُس کا وعدہ ہے محشر میں ہم کو
دکھائے گا خود اپنا جلوہ مبارک

اُن کے افکار میں گیرائی و گہرائی کی حامل عرفانی صداقتیں پائی جاتی ہیں مصرع در مصرع، شعر در شعر اور حمد در حمد وہ ایک راسخ العقیدہ سالک کی طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں تخیلات میں ایک ترفع ہے جو اُن کے بسیط انداز فکر کا مظہر ہے اُن کا اس امر پر یقینِ واثق ہے کہ شانِ قدرت بے حد و بے حساب ہے اس لیے وہ زمانی و مکانی حدود و قیود سے ماورا ہو کر سوچتے ہیں۔

ہے تری عظمت کے جلوے کی نشانی کائنات
تو ہی جانے ہے کہاں تک لامکانی کائنات
پھول کھلتے ہیں تو لگتی ہے ترو تازہ ابھی
ورنہ کس کو علم کتنی ہے پرانی کائنات

اُنہیں اپنی چشم بصیرت سے سنسار کے ذرے ذرے میں محبوبِ حقیقی کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے اس امر کا ادراک ایک چشم بینا ہی کر سکتی ہے جیسے خواجہ میر درد نے کہا تھا۔

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اب ذرا ہم اُن کی نعت کی بابت بات چلاتے ہیں حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

اطاعت وعقیدت اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امکانات ریاض ندیم نیازی کی نعت کے اوصاف جلیلہ ہیں نبی محتشم مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی توضیح وتشریح اُن کی نعت کا حصہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر مذکور قرآن وحدیث اور امت مسلمہ کی تاریخ سے بخوبی آشنا ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ابنائے عالم کے لیے ایک زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے قابلِ اتباع بھی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد نے حیات وکائنات کا نقشہ بدل دیا ہے جس کی وجہ سے بنی نوع انسان کی زندگی میں انقلاب برپا ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات انسانیت کے لئے خدا تعالیٰ کے تعارف اور رابطے کا ذریعہ بنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بدولت آگہی کے باب وا ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ کامل اور تعلیمات کے سبب جسم وجاں کو روشنی ملی قلب وخرد کے سارے طبق روشن ہوئے اس لئے ابنائے امت پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اگر انسان چشمِ بصیرت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الطاف واکرام کا نظارا کرتے تو دل میں حب اور عقیدت کے دیپ جلتے ہیں تو پھر حیاتِ انسانی منور ومعنبر ہو جاتی ہے اس حوالے سے ان کی نعت کے تین اشعار دردل پر دستک دے رہے ۔

دل لگا کر میں نے جس دم آپ کی سیرت پڑھی
ہر ورق' ہر سطر' سارے حاشیئے روشن ہوئے
ان کے دم سے ہوگئی توحید سے وابستگی
عبد کے معبود سے سب رابطے روشن ہوئے
اب گزر جائیں گے روز وشب یہ ماہ وسال بھی
آدمی پر زندگی کے دائرے روشن ہوئے

آدمی پر زندگی کے دائرے روشن ہوئے ان کی دروں کی دنیا میں حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بحرِ بیکراں ٹھاٹھیں مار رہا ہے جس میں عظمت کے حوالے بھی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی انسان کو اس جہاں کے فرمانرواؤں سے بے نیاز کر دیتی ہے اسی نسبت سے ان کی نعت کے دو اشعار نذر قارئین ہیں ۔

لیتا ہے احترام سے آقا کا نام دل
پہچانتا ہے عظمتِ عالی مقام دل
خاطر میں تب سے لاتا نہیں بادشاہوں کو
جب سے ہوا ہے سرورِ دیں کا غلام دل

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت کا حق لفظوں میں ادا کرنا ناممکنات کا حصہ ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے نظیر و بے مثال ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ والا صفات بے انت رفعتوں کی امین ہے۔جس کا ادراک صرف خالقِ دو جہاں کو ہے اور وہی ذاتِ کبریا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجتی ہے انہیں افکار کے مظہر اُن کی نعت کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

ہوں بیاں لفظوں میں کیسے مدحتِ خیر البشرؐ
بے مثال و بے بدل ہے عظمتِ خیر البشرؐ
اُن کی ذاتِ محترم پر بھیجتا ہے رب درود
کس کو اندازہ ہو کیا ہے رفعتِ خیر البشرؐ

ریاض ندیم نیازی کی نعت میں حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے پناہ مظاہر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ امتِ مسلمہ کے لیے صراطِ مستقیم کا درجہ رکھتا ہے وہ ایک سچے اُمتی کی حیثیت سے درِ انوار کے درشن کی حسرت رکھتے ہیں اُن کی نعت کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں۔

جس کی منزل آپؐ ہیں وہ گمشدہ راہی ہوں میں
ہے صراطِ استقامت امتی کا راستہ
حاضری میری بھی ہوگی جب درِ انوار پر
مدتوں سے تک رہا ہوں اس گھڑی کا راستہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و رفعت جس کا کوئی ثانی نہیں ہے آپ کے مقام و مرتبے کی بلندی کو دیکھ کر ارضی و سماوی رفعتیں بھی مسرت زدہ اور متحیر ہیں شذرہ ھذا کی آخری

کڑی کے طور پر اُن کی نعت کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے ۔

یوں تو کتنے ہی پہنچے ہوئے لوگ ہیں آسماں کی بلندی کو چھوتے ہیں جو
میرے آقا تو ان منزلوں تک گئے دیکھتی ہیں بہ حسرت جہاں رفعتیں

مشمولہ تصریحات اس امر کی بھرپور غماز ہیں کہ ریاض ندیم نیازی کی حمد و نعت عقیدت و الفت کا مخزنِ گراں بہا ہے جو قاری کی حبِ خدا اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مہمیز دیتا ہے قرآن و سنت اور اسلامی تعلیمات کا مزید مطالعہ اُن کے ذوق و شوق اور فنِ حمد و نعت کو فزوں تر بالیدگی سے ہمکنار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆☆☆

رضیؔ عظیم آبادی کا عارفانہ سخن

عام طور پر عارفانہ سخن سے مراد ایسا کلام لیا جاتا ہے جو عشقِ حقیقی سے عبارت ہو جسے عرفِ عام میں معرفت سے تعبیر بھی کیا جاتا ہے یہ ایک عمومی تاثر ہے جو عارفانہ سخن کی تعریف و توضیح کے لئے پیش کیا جاتا ہے جب کہ حقیقی مفاہیم کے مطابق ایسی شاعری جو بصیرت' دانش' حکمت اور معرفت سے متصف ہو عارفانہ کلام کے زمرے میں آتی ہے جو فکر انگیز بھی ہوتی ہے اور بصیرت آموز بھی۔ شذرہ ھذا میں ہم رضیؔ عظیم آبادی کی سخن سنجی کے حوالے سے قطراز ہیں جن کے کلام میں مذکورہ موضوع کے شواہد بکثرت ملتے ہیں جہاں تک ان کے سوانحی کوائف کا تعلق ہے تو ان کا اجمالی تعارف کچھ یوں ہے ان کے والدین کی جنم بھومی صوبہ بہار بھارت ہے سید خانوادے سے ان کا تعلق ہے جس کے جدِ اعلیٰ حضرت سید ابراہیم سپاہ گری کے شعبے سے منسلک تھے اور حضرت شاہ شبستانی کے ہم عصر تھے جو فنِ حرب میں ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے جن کی سلطان محمد تغلق کے دربار سے بھی وابستگی بھی تھی بہار کی جغرافیائی خوبصورتی اور سبزہ زاروں سے مانوس ہو کر وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے رضیؔ عظیم آبادی کے والدِ گرامی غلام مصطفیٰ ایک ادب فہم اور ادب دوست شخصیت کے مالک تھے جو اردو' فارسی' ہندی اور سنسکرت کا لسانیاتی تبحر رکھتے تھے اور اکثر اپنے بیٹے کو شیخ سعدی کے اشعار اور کبیر داس کے دوہے سنایا کرتے تھے اور یوں اپنے فرزندِ ارجمند میں ذوقِ ادب ودیعت کرنے میں سرخرو ہوئے علاوہ ازیں مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش کے شہر چاٹگام کے سرسبز و شاداب کھیت' سبز زار وادیاں' بلند و بالا کوہسار' چائے' ربڑ کے باغات' ساگوان کے دراز قامت درخت اور پٹ سن کی کھیتیاں بھی ان کی شعری تحریک کا سبب بنیں' انہوں نے ابتدائی تعلیم کرنافلی پیپرمل انگلش میڈیم ہائی اسکول

سے حاصل کی یہ وہی فرخندہ نصیب علاقہ ہے جسے ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں جنت الفردوس سے موسوم کیا ہے بعد ازاں چاٹگام پورٹ ٹرسٹ ہائی اسکول سے 1968ء میں میٹرک کیا علاوہ ازیں چاٹگام سٹی کالج سے ایف اے پاس کیا۔

مشرقی پاکستان میں جب قتل وفسادات بام عروج پر پہنچے تو اکتوبر 1971ء میں ہجرت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کی علامہ اقبال کالج ڈرگ روڈ کراچی سے 1974ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی بعد ازیں نیشنل موٹر لمیٹڈ کراچی میں ملازمت کرنے لگے کچھ برس بیت جانے کے بعد 1987ء میں کراچی سے ہی ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اگرچہ 1965ء سے بے ضابطہ طور پر شاعری کی طرف راغب ہو چکے تھے لیکن اس کا ریکارڈ رکھنے سے قاصر رہے اس کے کچھ عرصہ بعد شاعری کی طرف سنجیدگی سے مراجعت کی اب تک ان کے دو شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں پہلا مجموعہ حمدیہ ونعتیہ کلام پر مشتمل "آئینۂ یزداں" منظر عام پر آیا جس میں زیادہ تر نعتیہ کلام شامل ہے دوسرا مجموعہ "حلقہ مری زنجیر کا" 2012ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا جو تمام تر غزلیات پر مشتمل ہے شذرہ ھذا میں ہم ان کے آخری شعری مجموعہ کے ربع اول کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار برائے تجزیہ شامل کرتے ہیں۔

ان کی ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر لائق التفات ہے

اپنے لب پر سوال رکھتا ہوں
کیا میں روزی حلال رکھتا ہوں؟
آئینے پاتے ہیں جلا مجھ سے
میں یہ کس کا جمال رکھتا ہوں

اپنی ذات کو کڑے محاسبے کے عمل سے گزارنا جہاں جہاں خود تنقیدی کی دلیل ہے وہاں صاحب بصیرت ہونے کی عمدہ تمثیل ہے اکتساب معاش کے سلسلے میں احتیاط برتنا اس حوالے سے روزی کے حلال ہونے کی فکر کرنا انسان کے نجیب النفس ہونے کی علامت ہے اللہ رب العزت کے اوامر ونواہی کو ملحوظ خاطر رکھنے کا معتبر حوالہ ہے جو انسان ان اوصاف حمیدہ سے متصف ہو تو اس کی شخصیت آئینے کے بمصداق صاف وشفاف ہوتی ہے اس کا وجود مسعود مبارک ومطہر ہوتا ہے

یہ وہ جمال ہے جو کل سے جز کو ودیعت ہوا ہے جس کے جز نے کل کے پرتو کی صورت اختیار کر لی ہے عرفان و آگہی کا یہی انداز مذکورہ بالا غزل کے مطلع اور ایک شعر میں کارفرما ہے۔

صنعت تضاد کا حامل مذکورہ غزل کا یہ شعر بھی دیدنی ہے۔

تلخیاں پی گیا زمانے کی
تشنگی لازوال رکھتا ہوں

انسانی شخصیت کی تکمیل دولتِ ضبط کی بازیافت میں مضمر ہے یہ امر انتہائی صبر آزما اور طویل المیعاد بھی ہے جس تک رسائی حاصل کرنا ہر کہ دمہ کے بس کا روگ نہیں ہے جو اس مقامِ اعتبار پر پہنچ جاتے ہیں وہ یقیناً بلند اقبال ہوتے ہیں۔

ان کی ایک اور غزل کا مطلع نذرِ قارئین ہے

اس کی صبح زندگی بھی شام ہے
جو رہینِ حسرتِ ناکام ہے

درویشانہ صفت کی حامل ہستیاں قناعت پسند ہوتی ہیں دنیاوی خواہشات اور آرزوؤں کے باب ان پر بند ہو چکے ہوتے ہیں وہ ایسی زیست کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتیں جس کے گرد حسرتوں کی حاشیہ آرائی ہو وہ خوابوں اور امنگوں سے دور رہ کر جیون بتاتی ہیں اور مشیت کی ہر رضا پر راضی رہتی ہیں حسرت سے معمور جیون کی سحر ان کے نزدیک شام سی ہے وہ اس لئے حسرتوں کی مذمت کا آدرش دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عمیق معرفت کا حامل غزل کا ایک مطلع قابلِ غور ہے

زندگی آلام ہی آلام ہے
موت آرام و سکوں کا نام ہے

رضی زندگی کو سراپا آلام گردانتے ہیں یہ بھی ان کی بصیرت و حکمت کا ایک تابناک پہلو ہے مرگ ان کے نزدیک سکونِ جاں سے عبارت ہے گویا حزن و ملال و زیست کا ایک جزو لاینفک ہے جس سے فرار کسی طور ممکن ہی نہیں غم والم کو جب حیاتِ انسانی میں اس قدر اہمیت حاصل ہے تو پھر پریشانی و بے کلی چہ معنی دارد؟

ان کا عکسِ بصیرت غزل کے ذیل کے چار اشعار میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

آج کل کس بلندی پہ انسان ہے؟
پھر بھی اخلاص کا اس میں فقدان ہے
دیکھ کر کے ترقی نئے دور کی
عقل انسان کی آج حیران ہے
وہ قلندر بھی ہے اور درویش بھی
ذات کا اپنی جس کو بھی عرفان ہے
اب کسی کی قناعت پہ تکیہ نہیں
اس نئے دور کا یہ بھی فیضان ہے
سوچ مغرب کی تہذیب نے چھین لی
ساری دنیا کا انساں پریشان ہے

ان کا کلام معرفت کی دولت سے مالا مال ہے اخلاقی اقدار کی پامالی ان کے لئے باعثِ اذیت ہے وہ انسان کی مادی ترقی کو بھی ہدفِ تنقید بناتے ہیں مادیت اور اخلاقیات کا تقابلی مطالعہ ان کے کلام میں بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ان کا سخن سرچشمۂ عرفان و آگہی ہے ذات کے ادراک کو وہ ایک درویشانہ صفت گردانتے ہیں انسان کی شخصیت کے اعلیٰ و ارفع خصائص عصرِ حاضر میں ناپید و مفقود ہیں قناعت کی بلند صفتی عنقا ہوگئی ہے انسان حرص و ہوس کا اسیر ہو چکا ہے۔ مغربی تہذیبی یلغار نے حیاتِ انسانی کی دلکشی اور رعنائی چھین لی ہے کرۂ ارضی پر انسان کا وجود ایک تصویرِ الم بن گیا ہے اس قدر حکمت و دانش شاذ ہی کسی سخنور میں مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں

نظروں میں وقت کی وہی ٹھہرے ہیں محترم
جو دوسروں کے خواب پریشاں سمیٹ لائے
چبھتی نہیں ہیں اس کو سمندر کی وسعتیں
وہ ناخدا جو کشتی میں طوفاں سمیٹ لائے

انہوں نے عندالبیان مکارمِ اخلاق کی بھرپور تعلیم دی ہے ان کے جذبے ایثار و مروت سے معمور ہیں ان کے تخیلات رفعتوں کی حدوں کو چھوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے ان کا سخن شخصیت سازی کے وسیع تر امکانات خود میں سموئے ہوئے ہے آموزش کا عمیق آدرش ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

رخ موڑتا رہا ہوں بگولوں کا عمر بھر
طوفان بھی میری راہ میں حائل نہیں رہا

رضی عظیم آبادی کا تخیل عزم و حوصلے کی بے انت داستاں ہے رجا کا بھرپور حوالہ ہے بصیرت کی کرن ہے حکمت کی مشعل ہے جو ہر دم فروزاں رہتی ہے جس سے قاری کو فزوں تر شکتی ملتی ہے دنیا کے جھنجھٹ زیست کی کٹھنائیاں اور مصائب و آلام ان کا بال بھیگا کرنے کے قاصر ہیں وہ ہر حال میں پرامید نظر آتے ہیں بقول کسے ۔

طوفان کر رہا تھا مرے عزم کا طواف
دنیا سمجھتی رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے

سلسلہ ھذا کی آخری کڑی کے طور پر ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ اعتنا ہے۔

اب کیوں دکھائی دیتی نہیں روشنی مجھے
کیا میں سحر سے پہلے ہی بیدار ہوگیا

ان کے ہر شعر میں معرفت و حکمت اور دانش و بصیرت کے باب وا ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کا پیشگی شعور حیرت و استعجاب کی ایک دنیا آباد کرتا ہوا نظر آتا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا ان کے ہاں روشنی، بیداری اور سحر کے دلکش استعارات پائے جاتے ہیں۔

اب جبکہ اقلیمِ شعر لایعنی خیالات و تصورات کی اماجگاہ بن چکی ہے جہاں افکار کی معرفت فرو ہو چکی ہے ایسے عالم میں رضی عظیم آبادی جیسی پر مغز و پر حکمت اور معرفت سے لبریز شاعری کسی نعمتِ کبریٰ سے کم نہیں اگر ان کا ریاضِ شعر تواتر سے جاری و ساری رہا تو ان کا سخن مزید بالیدگی کی بازیافت میں کامیاب و کامران نظر آئے گا۔

☆☆☆☆☆

راشد ترین..... رومانی جذبات کا شاعر

اگر چہ جدید عصری رویّوں میں ناقدین کے مابین جذبۂ رومان ریشہ دوانیوں کا شکار رہا ہے مگر اس سلسلے میں کی جانے والی ہر کاوش ناکام ہوئی ہے یہ وہ احساس ہے جو شعری تاریخ کے ہر عہد میں سدا بہار اور تر و تازہ رہا ہے اگر شاعری میں عشق و محبت کا مذکور نہ ہو تو وہ بے کیف و بے سرور ہوتی ہے اور تمام تر رعنائیوں سے محروم ہوتی ہے جن شعرا و شاعرات نے اپنے کلام میں ان جذبات و احساسات کی پیوند کاری کی ہے وہ پسندیدگی اور پذیرائی سے ہم آغوش ہوئے شذرہ ھذا میں آج ہم راشد ترین کے شعری مجموعہ ''آؤ لوٹ جاتے ہیں'' کے تناظر میں ان کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ مذکورہ موضوع کی مناسبت سے کریں گے مجموعہ ھذا کی طباعت جون 2012ء میں عمل میں آئی اس میں زیادہ تر غزلیات شامل ہیں ان کا ادبی سفر نوے کی دہائی سے شروع ہوا ابھی تک ان کے تین مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آچکے ہیں ان کا اولین شعری مجموعہ ''ریت پر سفر'' تھا جبکہ دوسرا مجموعہ کلام ''محبت ہار دی ہم نے'' سے معنون ہے موصوف جنوبی پنجاب کی اہم ادبی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں اور انہیں ادبی حلقوں میں نگاہِ استحسان سے دیکھا جاتا ہے ان کا شمار استاد الشعرا میں ہوتا ہے ۔ بہت سے تلامذہ و تلامذات گیسوئے شعر و سخن سنوارنے میں ان سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔

ان کے افکار و خیالات میں ایک ندرت کا پہلو کا فرما نظر آتا ہے ان کا اسلوب ان کے سخن میں بھرپور تاثیر پیدا کر دیتا ہے ان کے احساسات میں رفعتِ تخیل بھی ہے اور زبان و بیان کی شیرینی بھی ہے ان کا پیرائیہ اظہار جاذبیت سے لبریز ہے ان کے ہاں جہاں محبت کے خالص جذبے ہیں وہاں پندارانا کی بات بھی ہے پاسِ انا ان کے سخن کا امتیازی وصف ہے کہیں

کہیں ان کے ہاں وصل کی خواہش کے حوالے سے مناجات کا رنگ بھی چھلکتا ہے اس حوالے ان کی غزل کے دو اشعار ہدیۂ قارین ہیں۔

ایسے نہ اپنی زلف کی زنجیر کر مجھے
میں آسماں کا چاند ہوں تسخیر کر مجھے
ویسے تو اس سے وصل کا امکان تک نہیں
مولا اسی کے ہاتھ کی تقدیر کر مجھے

راشد ترین ایک وضع دار شخصیت کے مالک ہیں اس لیئے ان کی طبیعت میں ایک طنطنہ پایا جاتا ہے وہ محبت کے جذبات و احساسات میں بھی ایک پندار انا رکھتے ہیں اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک شعر زیبِ قرطاس ہے۔

قدموں میں مرے آکے انائیں لپیٹ گئیں
اس کی گلی کے چاند نگر تک نہیں گیا

وہ عصری رویوں کا عمیق ادراک رکھتے ہیں ان کے ہاں سماجیات کا گہرا شعور ملتا ہے وہ زمانہ شناس ہیں اسی نوع کے افکار ان کے کلام میں وفور کے ساتھ پائے جاتے ہیں وہ جانتے ہیں نفسانفسی عروج پر ہے لوگ مطلب پرست ہیں محبت نے کاروبار کا لبادہ اوڑ لیا ہے محبتیں اغراض کی محتاج ہوگئی ہیں اسی فکر کی غمازی ان کے ذیل کے شعر میں نظر آتی ہے۔

اب کہاں لوگ محبت سے ملا کرتے ہیں؟
اب ملاقات بھی ہوتی ہے مفادات کے ساتھ

وہ دل کو مقدس اور پوتر پیکر تسلیم کرتے ہیں اور اسے کسی الہامی اور اساطیری کتاب سے تعبیر کرتے ہیں دل مقامِ محبت ہے اگر چاہت کا مسکن اتنا پاکیزہ ہے تو اس میں سکونت پذیر الفت کتنی ممتاز و مطہر ہوگی اس حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے۔

دل کے اوراق مقدس بھی ہوا کرتے ہیں
زندگی صورتِ انجیل بھی ہوسکتی ہے

راشد ترین کا کلام رومان کی دولت سے معمور ہے ان کے افکار میں جاذبیت اور

اسلوب میں ایک اپنائیت کا احساس رچا بسا ہوا ہے ان کے ہاں غضب کی روانی اور جولانی پائی جاتی ہے ان کے جذبوں میں وہ خلوص اور چاشنی ہے کہ قاری سرسری نہیں گزر پاتا یہ تو ان کے کلام سے چند استشہادات تھیں جو ہم نے قارئین پر آشکار کیں ان کا کلام سراپا انتخاب ہے اگر ان کی مشاطگی عروسِ سخن جاری و ساری رہی تو ان کی غزل ان کو اس سے بہت آگے لے جائے گی۔

☆☆☆☆☆

رضوان بابرؔ کی شعری رنگ سامانیاں

زیست رنگوں سے عبارت ہے اور رنگ رونق و رعنائی کی علامت ہیں تخیل کی رنگ امیزی کلام کو ہر دلعزیز کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے جس کے باعث سخن میں تادیر تاثیر قائم رہتی ہے اور شاعری بقائے دوائم سے ہم آغوش ہو جاتی ہے ایسے ہی جواں فکر اور زندہ دل شعرا میں ایک نام رضوان بابرؔ کا بھی ہے جنہوں نے انتہائی کم دورانیے میں سخن سنجی کر کے قارئین شعر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان کے اظہار کی نادرہ کاری فطری اور سماجی ناہمواریوں پر ردعمل کے طور پر بھی سامنے آئی ہے جس کے باعث وہ مجبور نوا ہو جاتے ہیں۔

میں ٹھکانہ بدلنے والا ہوں
اب زمینیں لپیٹ دی جائیں

یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری مجموعہ بھی ''زمینیں لپیٹ دی جائیں'' سے موسوم قرار پاتا ہے مذکورہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد اگست 2013ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا جس کے نصف اوّل کی منتخب غزلیات کے اشعار متذکرہ موضوع کی نسبت سے شاملِ شذرہ ہیں کتاب ھذا تمام تر غزلیات پر مشتمل ہے جس سے ان کے غزل سے والہانہ پن کی عکاسی ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لئے مختلف رنگوں کے استعارے استعمال کیئے ہیں جن میں ستارے، شمع، وصال، بہار، نشانی، لمس، خزاں، اجالا اور ہجر شامل ہیں۔

رضوان بابرؔ کے ہاں محبت کی عمومی اداؤں کا تذکرہ بڑے کروفر سے ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آخری دم تک محبت کا دم بھرنے کے قائل تھے ان کی رومان نگاری میں داستانِ الفت سموئی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی قدرتِ متخیلہ کے زور پر محبت کے احساسات

وجذبات کو تقویت بخشی ہے ان کے اشعار میں محبت کی بو باس رچی بسی ہوئی ہے اشتہادات کے طور پر ان کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

بچھڑتے وقت وہ بوسہ تمھارے ماتھے کا
وہ تیرا لمس تری آخری نشانی تھی
خزاں میں بھی مرا سارا بدن گلابی تھا
وہ تیرا لمس تری آخری نشانی تھی

مذکورہ اشعار میں مصرع ثانی کا اعادہ بھی ان کی فنی قرینہ کاری کا مظہر ہے اور دو مختلف کیفیات کی عکاسی ہے۔

ان کے ہاں رجائی جذبے بھی حوصلہ افزا نوعیت کے حامل ہیں جس سے یہ غمازی ہوتی ہے کہ ان میں زندگی کرنے کی بے پناہ شکتی موجود تھی ان کے فکری کینوس میں جہاں بے پناہ حزن والم ہے وہاں رجائیت بھی بامِ عروج پر دکھائی دیتی ہے ان کی غزل کا ایک شعر لائق توجہ ہے۔

وہ پھول لے کے مرا ساتھ دینے آئی تھی
وہ اس لیئے کہ خزاؤں سے جنگ جاری تھی

انہیں زندگی کا پر آشوب روپ انتہائی بھیانک نظر آتا ہے وہ حیات کو اپنے حقیقی روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں خوشیاں ہوں مسرتیں ہوں جہاں مایوسی اور افسردگی کا گماں تک نہ ہو طرب افزا کیفیات ہوں امن ہو آشتی ہو جہاں مسرت روبہ زوال نہ ہو اور غم کو حاصل کمال نہ ہو اسی حوالے سے ان کی ایک غزل کا ایک شعر دیدنی ہے۔

سرخ پھولوں سے مجھے خون کی بو آتی ہے
ان گلابوں کو ذرا دور ہٹایا جائے

رضوان بابر کے تخیلات کا اعجاز یہ ہے کہ امید افزا امکانات پورے اہتمام سے ملتے ہیں ان کی داخلیت اور خارجیت ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتی ہے جس سے احساسات کا ایک نیا جہان آباد ہوتا ہے محبت کا عمومی اظہار ان کے ہاں پورے شان وشوکت سے نظر آتا ہے ان کی ایک غزل کا مطلع دردل پر دق الباب کر رہا ہے۔

تمہاری شال پر کچھ پھول اور ستارے تھے
ہماری آنکھ میں کچھ خواب تھے تمھارے

وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ صبحِ بہار کچھ قربانیوں کی خواستار ہوتی ہے اس لیے وہ جذبہ ایثار کی پالنا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے سخن میں رنگ سامانی کے بے پناہ شواہد ہویدا ہیں اور وہ اپنے قاری کو شعورِ حیات سے مرصع دیکھنا چاہتے ہیں اس شذرہ کی آخری کڑی کے طور پر ان کی غزل کا ایک شعر نذرِ قارئین ہے۔

خزاں میں جس نے درختوں کا درد بانٹا ہے
مجھے یقیں ہے وہ صبحِ بہار دیکھے گا

مشمولہ استنباطات شاہد ہیں کہ رضوان بابر کا کلام اپنے اندر بے انت رنگ سامانیاں رکھتا ہے جس سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ ان کا شعری کینوس بسیط و عمیق ہے اگر حیاتِ چند روزہ ان سے کچھ مزید وفا کر جاتی تو ان کی شعری روانی اور جولانی ان کو کہیں سے کہیں لے جاتی۔

☆☆☆☆☆

زاہد علی سید کا خیال آفرین بیان

کسی بھی سخنور کی جولانیٔ طبع کا اندازہ اس کی مضمون آفرینی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے اگر اس کے فکری کینوس میں خیال افرینی کے جواہر بکثرت موجود ہیں تو اس کی فنی بالیدگی قابلِ تحسین و صد ستائش ہے آج ہمارا موضوعِ بیان زاہد علی سید کے کلام کی خیال آفرینی ہے جو ان کے سخن کا امتیازی وصف ہے ان کے شعری مجموعہ "چراغِ فکر" مطبوعہ جنوری 2012ء کے سدس اول کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار برائے تجزیہ شاملِ مضمون ہیں۔

ان کی اولین غزل کے تین اشعار زیبِ قرطاس ہیں

آئینہ آئینہ پتھر کے نگر کو کردوں
مجھ کو ہو جائے میسر جو ہُنر سورج کا
تم اندھیروں کو سمجھ بیٹھے ہو سورج کی زمیں
تم نے دیکھا ہی نہیں کبھی گھر سورج کا
یوں اندھیروں کے ہر اک وار کو رد کرتے ہیں
تذکرہ کرتے ہیں اربابِ ہنر سورج کا

ان کے ہاں بے پناہ ہمت و حوصلہ ہے مگر اپنی بشری کمزوریوں کا ادراک بھی رکھتے ہیں جو اس امر کی روشن دلیل ہے کہ وہ ایک حقیقت پسند انسان ہیں وہ اپنی قوتِ متخیلہ کی بدولت بنی نوع انسان کے گلشنِ ادراک کی آبیاری میں ہمہ وقت مصروف و منہمک ہیں وہ قاری کو اس کی حماقتوں سے آشنا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ ظلمتوں کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتے ہیں اس سلسلے میں وہ مشاہیر کے کارناموں کو مشعلِ راہ بناتے ہیں ان کا آدرش پڑھنے والے کے

قلب وخرد کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اپنی ابلاغیت کا ثبوت دیتا ہے مندرجہ بالا اشعار ان کے ایسے ہی خیال افرین بیاں کی بین دلیل ہیں۔

ان کی غزل کا ایک مطلع کیجیے

زاہد بہت ہی سخت ہیں تصوف کی منزلیں
جنت نہیں ملے گی تمنائے خام سے

ان کا بیشتر کلام سراپا انتخاب ہے عند البیان وہ ایسی مضمون افرینی کرتے ہیں کہ پڑھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں مقطع بالا میں انہوں نے زبردست نوعیت کی خیال آرائی کی ہے اور اپنے موقف کی بالا دستی کو باور کرایا ہے اپنے تخلص کی رعایت سے بھر پور فائدہ اٹھایا ہے وہ مسلسل خلوص اور ریاضت پر یقین رکھتے ہیں اور یہی تلقین ان کے کلام میں دکھائی دیتی ہے۔

ان کی ایک غزل کے تین اشعار زیب قرطاس ہیں

الفت ہے تو اظہار تمنا بھی کیا کر
اے دوست کبھی ذکر ہمارا بھی کیا کر
کچھ گردشِ حالات گوارا بھی کیا کر
ہونٹوں پہ تبسم کا اجالا بھی کیا کر
کیوں تجھ پہ گراں حرف ہنرمند ہے زاہد؟
شاعر ہے تو تنقید گوارا بھی کیا کر

زاہد علی سید کی شاعری صرف سنجیدہ اور تلخ موضوعات کا مرقع نہیں ہے بلکہ خوشگوار اور لطیف احساسات بھی اس میں شامل ہیں رومانویت کی ایک بھر پور لہر ہے جو موجزن نظر آتی ہے چنانچہ شعر اول میں وہ اپنے محبوب دل نواز سے یوں گویا ہیں کہ الفت کے لئے اظہار تمنا بھی ضروری ہے اور وہ اپنے یار ہزار شیوہ کی زبانی اپنا ذکرِ خیر سننے کے بھی متمنی ہیں شعرِ ثانی میں دولتِ ضبط کا ایک عمیق احساس پایا جاتا ہے انسانی فطری طور پر ناشکرا ہے اور ضبط و تحمل جیسی شے بہت دور ہے معمولی سی گردشِ حالات اسے حالتِ ناشکیبائی سے دوچار کر دیتی ہے اس لئے وہ گردشِ دوراں کو گوارا کرنے کا سندیس دیتے ہیں اور ہونٹوں پر تبسم کے اجالے کی

ترغیب دیتے ہیں عام طور پر شاعروں کا یہ المیہ رہا ہے کہ منفی تنقید کے قائل نہیں ہوتے بلکہ صرف اپنی مدح وستائش کے شیدا وشیفتہ ہوتے ہیں اور نقائص پر یقین نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ شاعر ونقاد کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی ہے جب کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ سخن ناقدانہ آراء کا احترام کریں کیونکہ اسی میں ہی ان کی اصلاح وبہتری ہے انہوں نے اپنے مقطع میں اسی عقدہ کی کشود کی ہے جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔

مذکورہ بالا استشہادات کے علاوہ بھی ان کے متعدد اشعار ہیں جو خیال افرینی کے مظاہر ہیں لہٰذا ہم انہیں بلا تبصرہ شاملِ شذرہ کرتے ہیں۔

وہ مجھے یہ روگ کیسا ناگہانی دے گیا؟
آگ دل کو دے گیا آنکھوں کو پانی دے گیا
تھا بدن پھولوں سا اس کا تتلیوں سا پیرہن
جو بہاروں کو بھی ذوقِ گل فشانی دے گیا

☆

روئے روشن کتاب کی صورت
خال و خد انتساب کی صورت
ہے وہ چہرہ کتب کی صورت
ذہن و دل میں نصاب کی صورت
ہیں سوالات آپ کی آنکھیں
میرے آنسو جواب کی صورت

☆

ہر سلوک اپنوں کا لگتا ہے عداوت کی طرح
مجھ کو سائے بھی ملے ہیں تو تمازت کی طرح
لیلیٰ کے حسنِ تغافل کی طرح آپ کا ذوق
اور انداز مرا قیس کی وحشت کی طرح

ہر آرزو کے عکس میں ہے آپ کا جمال
دل سے نکالوں آپ کی تصویر کس طرح

مشمولہ استخراجات اس امر کی بھرپور غماز ہیں کہ خیال افرینی زاہد علی سید کے کلام کی شناخت کی حیثیت رکھتی ہے ان کا سخن فکری و فنی پختگی سے ہم آہنگ ہے جس سے جدت و ندرت کے مظاہر ضو پاش ہوئے ہیں مزید ریاضت ان کے مقامِ اعتبار کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

☆☆☆☆☆

سہیل غازی پوری وسیع الموضوعات شاعر

اقلیمِ شعر و سخن فاخر و نازاں ہے کہ اسے اعلیٰ پائے کے شعرا میسر آئے جن کے تخلیقی جواہر پاروں کی بدولت آج شہری تاریخ مالا مال ہے فکر و فن کے مشاہیر نئی نسلوں کے لیے مینارِ نور کی طرح ہوتے ہیں چند ایک موضوعات و اصناف پر تو ہر شاعر طبع آزمائی کر لیتا ہے بہت سے مضامین اور بہت سی ہیئتوں میں شعر گوئی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوا کرتی انہیں وسیع الموضوعات احباب میں سہیل غازی پوری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے جو چھ دہائیوں سے مشقِ شعر و سخن میں مصروف و منہمک ہیں ہمارے پاس ان کے مکمل شعری مجموعوں کا ریکارڈ تو نہیں ہے کہ ہم انھیں سلسلہ وار زیرِ بحث لائیں ہاں البتہ ان کے حوالے سے جمال ضیا اور احمد کمال کی تالیفی دستاویز مطبوعہ ۲۰۱۱ء "سہیل غازی پوری سے ملیے" کے نام سے موجود ہے جس میں برصغیر پاک و ہند کے سو اسو کے قریب ادباء جن میں کچھ شعرا بھی شامل ہیں کے غیر منظوم و منظوم تنقیدی معروضات شامل ہیں ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام کے منتخب اشعار کے تناظر میں ہم سہیل غازی پوری کے فکر و فن کے حوالے سے اپنے تنقیدی تجزیات پیش کرتے ہیں۔

جب سخن گستر فکر و فن کے عمیق تجربوں سے گزرتا ہے تو اس قسم کے خیالات کا صدور ہوتا ہے اس حوالے سے سہیل غازی پوری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میرے لیے یہ بات بڑی ہے کہ اب مجھے
پہچانتے ہیں لوگ مری داستان سے

مجھے بھی اپنی طرف دیکھنے نہیں دیتی
یہ کیسی ہجر کی دیوار ہے میرے اندر

یہ کیا کہ صرف ہدف دوسرے ہی بنتے رہیں
خود اپنے آپ کو بھی آئینہ دکھایا کر

سہیل غازی پوری کی شعری ریاضت میں وہ خلوص اور چاہت ہے جو قاری کا دل موہ لیتی ہے یہ امران کے تجربے کا غماز ہے اور وہ بذاتِ خود اس امر سے آگاہ ہیں اور وہ اپنے آس پاس کے ماحول پر گہری نگاہ رکھتے ہیں پہلے شعر میں بھی اس حوالے سے بات کی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ بات میرے لیئے باعثِ افتخار ہے کہ لوگ مجھے میرے فن کی بدولت جانتے ہیں جو ایک داستان کی سی حیثیت اختیار کر چکا ہے دوسرا شعر ایک روداد ہجر بھی ہے اور محرومیوں کا قصہ بھی اصل میں لفظ ہجر ایک کثیر المعانی مفہوم کا حامل ہے کسی بھی چیز کا معدوم ہونا یا کسی بھی چیز کی عدم دستیابی اس کی جدائی سے تعبیر کی جاتی ہے جب ہجر بھیانک اور وحشیانہ صورت اختیار کرتا ہے تو انسان فطری طور پر خود اعراضی پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہ وحشت دیوار کا روپ دھار لیتی ہے دیوار کے پار اپنے وجود کا نظر آنا محال ہو جاتا ہے تیسرے شعر میں ایک سماجی عمومی رویئے کی عکاسی کی گئی ہے فطری طور پر انسان دوسروں کو ہدف تنقید بناتا ہے جبکہ سہیل غازی پوری خود احتسابی اور اپنی ذات پر تنقید کرنے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہر بار دوسرے ہی تنقید کا نشانہ بنتے رہیں بلکہ انسان کو اپنے آپ کو بھی آئینہ دکھانا چاہیے کہ اس کی تصویر آئینے میں کیسی ہے یعنی اپنی ذات پر بھی تنقید روا ہے ایسی بات تب کی جاتی ہے جب اپنا من ہر قسم کی کثافت اور آلائش سے محفوظ ہو اس شعر میں موصوف نے اپنی ذات کے سچ کو بیان کیا ہے اور حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔

ان پر قدرت کی لطف وعنایت کیا ہے دیکھیے اس شعر میں۔

دعائیں مانگی تھیں دو چار پھول پتوں کی
چمن میں شاخ ثمر بار گر پڑی مجھ پر

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شعراء اپنی قسمت سے شاکی ہوتے ہیں کبھی مقدر کا گلہ کرتے ہیں اور کبھی گردوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور یہ موضوع شعری روایات کا حصہ بن چکا ہے لیکن یہاں شاعر مذکور نے ایک غیر روایتی انداز میں بات کی ہے اور کہا ہے کہ میں نے تو

استدعا کی تھی کہ مجھے دو چار پھول اور پتے میسر آئیں لیکن مشیت نے ایسی یاوری کی کہ گلستاں میں شاخِ ثمر جو ثمر سے معمور تھی میرے اوپر آ کر گر پڑی یعنی مجھے میرے تقاضے سے بھی فزوں تر نواز دیا گیا۔ اب ذرا بیداد زمانہ کی شکایت ان کی زبانی سنتے ہیں۔

پچھلی قطار میں ہیں کھڑے ساٹھ سال سے
شہرِ ہنر میں کون سے فنکار ہم ہوئے

دنیا میں ناانصافی کا راج ہے اور شعر و سخن جیسا مقدس شعبہ بھی اس کی چیرہ دستی سے محفوظ نہیں رہ سکا، وہ لوگ جنہوں نے اپنی عرق ریزیوں سے دنیائے شعر کو مہکا دیا ہے وہی ناقدری کا شکار ہیں اور بونوں کی علم داری ہے جنھیں انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا ہے وہ لوگ جنھوں نے گیسوئے شعر سنوارنے میں شب و روز صرف کیے ان کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے سہیلؔ غازی پوری کا یہ شعر اصل میں ناقدریٔ جہاں کا ایک نوحہ ہے جو اپنے اندر بھرپور تاثر رکھتا ہے۔ سہیلؔ صاحب کی ندرت نگاری ملاحظہ ہو۔

وہ ایک شخص غموں کا اسیر تھا کب سے
خبر نہیں کہ پرستارِ میرؔ تھا کب سے

کچھ ایسے حرف لکھوں شاعری کے ماتھے پر
کہ تیرگی نہ رکے روشنی کے ماتھے پر

آنکھوں میں کوئی رنگ نہ دل میں کوئی امنگ
جیسے کہ بند تالے پہ قبضہ جمائے زنگ

فکر کے چراغوں کو کوئی تو جلائے گا
اے سہیلؔ ڈرنا کیا تند خو ہواؤں سے

پہلا شعر حزنیہ طرزِ فکر کا حامل ہے جس میں سہیلؔ غازی پوری صاحب بھی معتقدِ میرؔ نظر شبیر ناقدؔ

آتے ہیں۔انہوں نے ایک شخص کا حوالہ دے کر اس کے مصائب و آلام کے ڈانڈے حزنِ میر سے جاملائے ہیں یہ شعر عظمتِ میر کا عکاس بھی ہے اور حزن و ملال کا شاہکار بھی جس میں وقت کا کوئی تعین نہیں ہے دوسرے شعر میں شعر گوئی کا حسین ضابطہ رقم کیا گیا ہے جس میں لکھنے والوں کو روشنی کا ایک ہالہ متعارف کرایا گیا ہے کہ میں ایک ایسی شعری روایت رقم کر جاؤں جس میں روشنی کے عکسِ جمیل پر تیرگی کا احتمال نہ رہے یہ شعر دنیائے شعر کے لیے ایک قندیل کی حیثیت رکھتا ہے جس سے شعور و آگہی کی لویں پھوٹ رہی ہیں اور شاعرِ موصوف کا فیض جاری ہے تیسرے شعر میں کئی شعری تلازمے کارگر نظر آتے ہیں جن میں آنکھیں رنگ، امنگ، بند تالے، قبضہ جمائے اور زنگ جیسی خوبصورت تمثیلات ہیں جہاں منظر نگاری کا دلکش رنگ اشکار ہو رہا وہاں ان کی کہنہ مشقی بھی عیاں ہو رہی ہے اس شعر میں دل کی ویرانی کا دلکش اسلوب ہے جو اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ فکری تنوع کے ساتھ ساتھ قاری کے لیے ان کا اسلوبیاتی انداز بھی دلچسپ اور قابلِ غور ہے آخری شعر میں رجائیت کی جڑیں پھوٹ رہی ہیں اور اس امید کا بیانِ ذیشان ہے کہ فکر کے چراغوں سے روشنی کے سلسلے جاری و ساری رہیں گے اور خود آموزی کے انداز میں کہا گیا ہے کہ تند و تیز اور سرکش ہواؤں سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں جیسے کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

روشنی گر خدا کو ہو منظور
آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں

ان اشعار سے شاعر بزرگوار کی فکر و فن سے دلی وابستگی کی عکاسی جلوہ ریز ہو رہی ہے میرے فاضل دوست اختر شاہ جہاں پوری نے اپنے تنقیدی شذرے میں سہیل غازی پوری صاحب کو پاکستان کے صفِ اوّل کے شعرا میں شمار کیا ہے ہم سمجھتے ہیں یہ ان کے ساتھ زیادتی ہے ہمارے خیال میں وہ عصرِ حاضر کی دنیائے شعر کے صفِ اوّل کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔

شعور آگہی کی سطحوں کو اجاگر کرنے والا ان کا ایک اور شعر نذرِ قارئین ہے

فصیلِ جاں پہ اندھیرا ہے اے شبِ ہجراں
چراغ رکھنے کا کچھ اہتمام کرتے ہیں

موصوف زندگی کی آشوب زدگیوں کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اور ان کا مداوا چاہتے ہیں وہ جہاں دوسروں کو ظلمتوں اور وحشتوں کے خلاف عملی تلقین کرتے ہیں وہاں خود بھی عملی طور پر فعال نظر آتے ہیں اور یہ امر ان کے خلوص کا مظہر ہے اس شعر میں بھی کچھ ایسا ہی سماں نظر آتا ہے اور فصیل جاں کی تیرگی سے رستگاری پانے کے لئے چراغ کا اہتمام کر رہے ہیں۔

آمدہ شعر میں شاعر کا تنقیدی شعور دیدنی ہے۔

نہیں ضوابطِ شعر و سخن مقرر کیا؟
جو حرف حرف نہ پرکھے وہ سخن ور کیا؟

اساتذۂ سخن کو بہت قلق ہوتا کہ جب کوئی شعری ضابطوں کی پاس داری نہیں کرتا یا ان کی حدود و قیود کو پھلانگتا ہے یہاں بھی وہ یہ فرما رہے ہیں کہ ضوابط شعر و سخن مقرر ہیں اور جو حرف حرف کو پرکھنا نہیں جانتا شاعر کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا یہاں ایک گہری شعری رمز کی بات کی گئی ہے۔

ان کا ایک سماجی خدمت کے حوالے کا حامل شعر دعوتِ التفات دے رہا ہے۔

کسی کو ہنس کر کسی کو رو کر دلاسے دینا
یہ درحقیقت عبادتیں ہیں خیال رکھیے

شاعر یا تخلیق کار کے اندر جب تک خلوص کی جڑیں گہری نہیں ہوتیں اس وقت تک وہ معتبر نہیں ہو پاتا لیکن بفضلِ تعالیٰ جناب سہیل خلوص کی دولت بے پایاں سے مالا مال ہیں ان کے اسی خلوص کا فیض ان کے کلام میں ایک موجزن سمندر کی مانند ہے شعر ھذا میں بھی یہی بات ہے جو قابل غور ہے جس میں یہ آدرش دیا جا رہا ہے کہ دکھی انسانیت کی خدمت عین عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور انسانیت کے زخموں پر مرہم کے لئے انہوں نے طریقہ ہائے کار بھی وضع کر دیئے ہیں کہ کسی کو ہنس کر دلاسہ دیں یا رو کر یہ خیال رہے کہ یہ کارِ عبادت ہے۔

دو اور اشعار مجبوراً تبصرہ کر رہے ہیں۔

اپنے حروفِ عصر کی تحقیر کیوں کریں؟
جو بات سچ نہ ہو اسے تحریر کیوں کریں؟

ہم نے بدل دیں سینکڑوں قوموں کی قسمتیں
اہلِ قلم ہیں خواہشِ شمشیر کیوں کریں

شعر اوّل میں موصوف نے عصری ادب کو حروف عصر سے موسوم کر کے حسن ایمائیت پیدا کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ادب کی تحقیر کس لیے کریں اور جو بات صداقت کا درجہ نہیں رکھتی اسے ہم تحریر کیوں کریں صداقت پرستی ہر کھرے قلم کار کا شیوہ اور وطیرہ ہوا کرتی ہے اور موصوف بھی اس صفتِ عالیہ سے متصف ہیں شعرِ دوم میں بھی حزب القلم کی عظمت کا اعتراف ہے اور قلم کی حرمت کا بیان دل نشیں ہے اور یہ شعر بھی ایک تاریخی دستاویز کی سی حیثیت رکھتا ہے وہ کہتے ہیں کہ اہلِ قلم نے سینکڑوں قوموں کی قسمت بدل دی اور ہم قلم کے وارث ہیں اور ہمیں شمشیر کی چنداں ضرورت نہیں ہے ہم اپنے قلم کے توسط سے اپنا لوہا منوا سکتے ہیں۔

گہری حساسیت کا آئینہ دار شعر دعوتِ غور دے رہا ہے۔

ذرا سی بات سے دل ٹوٹ بھی تو سکتے ہیں
اس بات کا اکثر خیال رکھنا ہے

اس شعر میں روز مرہ زندگی کا ایک ضابطۂ اخلاق بتایا گیا ہے اگر ہر فرد اس کا عملی اطلاق اپنی ذات پر کرے تو یہ دنیا بہشت بن سکتی ہے اصل میں بہشت کی تعریف بھی یہی ہے کہ ایک ایسا مقام جہاں آزار کو عمل دخل نہ ہو اس شعر میں ایک بسیط احساس پایا جاتا ہے کہ چھوٹی سی بات سے کسی کا دل ٹوٹ سکتا ہے اور زندگی میں اس بات کو خصوصی طور پر خاطر میں لانا ہے اصل میں حدیث مبارکہ کی روشنی میں مسلمان کی تعریف بھی یہی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مومن ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

یہ چند جھلکیاں تھیں جو ہم نے سہیل غازی پوری کے فکر و فن کے حوالے سے ہدیہ قارئین کی ہیں ان کے تمام تر اشعار سراپا انتخاب ہیں اور حوالے کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے حوالے سے خامہ فرسائی کے لئے دفتروں کے دفتر درکار ہیں ان کے فن کی کئی حیثیتیں ہیں اور ہر حیثیت معتبر سے انہوں نے کامیابی سے نعت گوئی بھی کی اور حمد نگاری بھی۔ اس نسبت سے ان کے مجموعے بھی آچکے ہیں غزل تو ویسے بھی ان کی فنی پہچان ہے اس کے علاوہ انہوں نے ہائیکو پر

بھی کامیابی سے مشاطگی فن کی ہے منظوم تبصروں کی کتاب کے بھی دو ایڈیشن آ چکے ہیں حال ہی میں انہوں نے تضمین نگاری کی نئی طرح ڈالی ہے اور تضمین کے کلاسیکی انداز سے تغیر کی راہ نکالی ہے جو ان کا جداگانہ انداز ہے اور روایت کا روپ دھارنے کی بساط رکھتا ہے سہیل غازی پوری کا غزل نگاری سے ایک دم آزاد نظم کی طرف راغب ہونا مذکورہ ہیئت کی پذیرائی پر دال ہے جس سے یہ قیاس بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ آزاد نظم اپنے وجود کو تسلیم کرانے میں مصروف و منہمک ہے اور اس سلسلے میں اسے اطمینان بخش کامیابی بھی میسر آئی ہے یہی وجہ ہے کہ بیشتر سخنوران کے ہاں اس کا طوطی بولتا نظر آتا ہے ابھی تک سہیل غازی پوری کے ایک درجن کے قریب شعری مجموعے زیور طباعت سے مرصع ہو چکے ہیں موصوف سہ ماہی کتابی سلسلہ شاعری کی ادارت بھی کر رہے ہیں جس میں پاک و ہند کے شعرا کی شعری تخلیقات شامل ہوتی ہیں جو سراپا سخن ہے جس میں نثر کا کوئی سروکار نہیں ہوتا یوں اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے خالقِ کائنات سے استدعا ہے کہ ان کے فن کو زندہ و تابندہ رکھے۔ آمین

☆☆☆☆☆

سعید الظفر صدیقی کی شگفتہ شاعری

صانعِ لوح و قلم کے الطاف و اکرام کا مجھ مشتِ خاک پر سلسلہ دراز رہا ہے جس کے باعث جہانِ ادب کے قلزم بیکراں کی غواصی کے بھرپور مواقع میسر آئے ہیں اور فکر و فن کے گوشوں کی تخلیقی و تنقیدی اور تحقیقی انداز میں سیر ہو کر سیر کی ہے مجھے میرے آموزگار ادب ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے یہی سکھایا کہ ادب کی خدمت ایک عبادت ہے اور عبادت میں احساسِ سود و زیاں نہیں ہوتا فکر کے اس بسیط انداز نے مجھے شعر و ادب کی خدمت کا بے لوث جذبہ ودیعت فرمایا جو ہستیاں اس قسم کے احساسات سے سرشار ہوں وہ نمود و نمائش، شہرت و مقبولیت سے بے نیاز ہو کر گلشنِ شعر و ادب کی آبیاری خلوص و لگن سے کیا کرتی ہیں ایسی ہی اعلیٰ و ارفع خصوصیات سے متصف ہستیوں میں سعید الظفر صدیقی کا شمار بھی ہوتا ہے جنہوں نے پورے جوش و جذبے اور تندہی سے کشتِ سخن کو اپنی جانفشانی سے سینچا ہے بقول راقم الحروف ؎

ہے کشتِ سخن ہم نے سینچی لہو سے
فقط فخر ہے اور شکایت نہیں ہے

ان کی فکری اُپج عمومی شعری اظہار کی ڈگر سے ہٹ کر ہے جس میں برجستگی اور شگفتگی کا غالب عنصر پایا جاتا ہے ان کی شگفتہ مزاجی قاری کو چونکا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے جس کے باعث وہ ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں الفاظ و خیالات کا تکراری پہلو معدوم ہے اور کسی قسم کی یکسانیت کا گماں نہیں گزرتا۔ وہ ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں جن کی عرق ریزی مصرع در مصرع، شعر در شعر اور غزل در غزل بین السطور ٹپک رہی ہے۔ وہ ایک عرصہ سے مصروفِ ریاض ہیں جن کے ابھی تک چار شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں جن

میں ''غبارِ راہ میں ہے'' مطبوعہ 1997ء ''جنوں پہ ہے بہار'' مطبوعہ 1999ء ''مہر بلب ہونے تک'' مطبوعہ 2008ء اور ''چوٹ دل کو دکھاتی نہیں ہے'' مطبوعہ 2011ء شامل ہیں۔ میں ان کے مؤخرالذکر مجموعۂ کلام کے ربع اوّل کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ کرتا ہوں۔ کتاب ھذا کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر' عارف منصور' جاوید رسول جوہر' شاعر علی شاعر اور نازیہ ممتاز ملک کے وقیع القدر شذرات مشمولات کا حصہ ہیں۔ شاعر ممدوح کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے شعر و سخن کی ریاضت کے پہلو بہ پہلو نثر نگاری میں بھی گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ سائنس کے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ ان کی ایک حیثیت کیمیادان کی سی بھی ہے۔ ادبی جریدہ ''عالمی رنگِ ادب'' کے سرپرست اور موحولیات کے موضوع پر شائع ہونے والے رسالے کے کالم نگار اور بائیو آملہ کمپنی کے ریسرچ ڈائریکٹر بھی ہیں۔ بنیادی اور مستقل طور پر ان کا تعلق کراچی سے ہے۔ اس کے علاوہ انہیں بھارت' ناروے' فرانس' جرمنی' دبئی' ابوظہبی اور ترکی جانے کے مواقع بھی میسر آئے، جس کے باعث ان کے تجربات و مشاہدات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

ان کے کلام میں شگفتگی کے پہلو بہ پہلو تحیر کا عنصر بھی وفور سے پایا جاتا ہے جو قاری کو بے ساختہ طور پر متوجہ کرانے کی صلاحیت سے مالا مال ہے جس کی وجہ سے وہ بسا اوقات سراپا سوال نظر آتے ہیں ان کی تلوّن مزاجی نئے نئے موضوعات کے در کھولتی نظر آتی ہے ان کے فکری کینوس میں بہت سے انسانی مصائب و آلام اور ان کا مداوا موجود ہے ان کی اولین غزل کے چار اشعار زیبِ قرطاس ہیں جن میں شگفتگی کا تاثر بھرپور نوعیت کا ہے ۔

سایہ کہیں کسی کو میسر نہیں ہے کیا؟
سر پر جو آسمان تھا سر پر نہیں ہے کیا؟
اک دوسرے سے اپنا پتا پوچھتے ہیں لوگ
اب کوئی اپنے آپ کے اندر نہیں ہے کیا؟
ہم زندگی ترے لیے جاں سے گزر گئے
اب بھی ترا حساب برابر نہیں ہے کیا؟

اس دورِ ناسپاس کا ہونے سے تو سعیدؔ
مٹی میں ڈوب جائیں یہ بہتر نہیں ہے کیا؟

ان کے ہاں حیات و کائنات کے حوالے سے ایک مسلسل جستجو کا تاثر بھی ملتا ہے ان کا استفہامیہ انداز انسان کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جدید نوعیت کی اصطلاحیں بھی ہیں جیسا کہ متاثرہ بالا شعر میں مٹی میں ڈوب جانے کی اصطلاح برپائی گئی ہے ان کی شعری شگفتگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے ہاں مکانی آشوب کی یکسر تردید ملتی ہے ان کا اظہار زیادہ تر داخلی نوعیت کا ہے وہ حزن دالم کو مشیت سے منسوب کرتے ہیں۔ مسئلہ جبر کی ایک جھلک ان کی غزل کے ایک شعر میں دیکھتے ہیں۔

زمیں پر اور کوئی دکھ نہیں ہے
بلائے آسمانی کے علاوہ

تخیلاتی حوالے سے انہوں نے زیادہ تر توجہ داخلی امور پر مرکوز کی ہوئی ہے۔ ان کی سوچ کا سفر خارج سے شروع ہوتا ہے اور داخل کی بسیط گہرائیوں پر منتج ہوتا ہے۔ وہ عمومی خواہشات و توقعات اور خواب و خیال سے ماورا ہیں، جس کے باعث ان کے تخیل کی شگفتگی کو مزید تقویت ملی ہے۔ ان کی ایک غزل کے دو اشعار انھی حوالوں سے لائقِ التفات ہیں۔

ہمیں تو دل کے اندر جھانکنا ہے
یہ چہرے دیکھنا کافی نہیں ہے
جسے ہیں لوگ آنکھوں میں سجائے
وہ ہم نے خواب دیکھا ہی نہیں ہے

وہ اپنی من موجی طبیعت کے باعث اور فطری شگفتگی کے علی الرغم کبھی رہینِ یاس نہیں ہوتے ان کی زندہ دلی اُن کے لئے جشنِ کا سماں پیدا کرتی رہتی ہے اپنی روایات انہیں بہت عزیز ہیں اور وہ دنیا میں ان کی پاس داری کرتے ہیں۔ اس لیے وہ فعال بھی نظر آتے ہیں اگر انہیں روایت کا بھگت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اسی نسبت سے اُن کی غزل کے دو اشعار دامنِ دل تھامتے نظر آتے ہیں۔

کچھ نہیں ہے تو ہنسی اپنی اُڑائیں چلیے
اس بہانے ہی کوئی جشن منائیں چلیے
گر زمانے کو کچھ احساس نہیں ہے نہ سہی
ہم تو جو اپنی روایت ہے نبھائیں چلیے

انہوں نے سماجی رویّوں کی حقیقتوں کو اشکار کرنے کی زبردست کاوشیں کی ہیں جو ایک حقیقی تخلیق کار کا فرض منصبی ہے بالواسطہ طور پر ایک اصلاح' ایک تبلیغ اور مشن بھی ہے یہ امر جہاں ان کی شگفتہ مزاجی کا مظہر ہے وہاں ان کے تنقیدی رویّوں کا مثیل بھی ہے، وہ سماج کے مصائب پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، جن کے اظہار میں کسی نوع کے بخل سے کام نہیں لیتے، اسی نوعیت کا ان کی غزل کا ایک شعر دیدنی ہے ۔

بنامِ ممبر و محراب' واعظ
کبھی جبہ ، کبھی دستار مانگے

اُن کی شعری شگفتگی قاری کے لیے نکہت بیز بھی ہے جس کے باعث لبوں پر بے ساختہ تبسم مچلنے لگتا ہے کہیں کہیں ان کا اظہار ظرافت کا حسیں روپ دھار لیتا ہے کہیں شکوہ و شکایت کی حکایت ہے تو کہیں عمیق رجائی امکانات ہیں جن سے بے پناہ عزم و حوصلہ جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ اپنی منکسر المزاجی کے ساتھ ساتھ سماج کے غرور کو بھی بین السطور لاتے ہیں۔

ان کی غزل کے چھ اشعار قارئین شعر و سخن کے ذوقِ طبع کی نذر ہیں ۔

کسی کے ساتھ سفر میں نہ اپنے گھر میں ہیں
ہم آج آپ کے اخبار کی خبر میں ہیں
نہ اہتمامِ وفا نہ سر فروشیِ عشق
یہ کس قماش کے سودے ہمارے سر میں ہیں
یہ زندگی سے کہو تلخ گفتگو نہ کرے
ہم اب بھی ان کی محبت بھری نظر میں ہیں

جو تند و تیز ہواؤں کو زیرِ پا رکھیں
وہ حوصلے بھی ابھی بال و پر میں ہیں
ہم اب بھی خواب سویروں کے دیکھتے ہیں بہت
ہم اب بھی اپنی تمناؤں کے اثر میں ہیں
ہمارے عجز کو شاید ابھی وہ نہ سمجھے
ابھی وہ اپنی خدائی کے کروفر میں ہیں

سعید الظفر صدیقی کی شگفتہ مزاجی کی مثیل ایک غزل بدونِ تبصرہ پیشِ خدمت ہے ۔

کچھ بتاؤ تو سہی یہ واقعہ کیسے ہوا؟
تھا جو پتھر کا پجاری دیوتا کیسے ہوا؟
لوگ تو توبہ کے طالب آخری دم تک رہے
وہ فقط گنگا نہا کے پارسا کیسے ہوا؟
راستوں میں تو رہا ہو گا ہجومِ رفتگاں
پھر تمہارا خود سے اپنا سامنا کیسے ہوا؟
تم نشانہ باز تو سچے تھے پھر میری طرف
جو نشانہ تم نے باندھا تھا خطا کیسے ہوا؟

مشمولہ استخراجات سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ سعید الظفر صدیقی کا کلام اپنے جلو میں بے انت شگفتگیاں سمیٹے ہوئے ہے اور یہی امر انہیں دیگر ہم عصر شعرا سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سعید سوہیہ..... مضمون نگاری کے تناظر میں

مضمون نگاری ایک عمیق و بسیط فن ہے جو بیک وقت ایک تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور وجدانی عمل ہے۔ اس کی مقتضیات میں عقل و بصیرت، دانش و حکمت، فہم و ذکاوت، بالیدہ فکری، مہارتِ فن، معائب و محاسن کا بیان، عصری ادراکات، علمِ تاریخ، توازن اور استخراجی نتائج شامل ہیں۔ مضمون نگاری کی مبادیات میں موضوع کا انتخاب، موضوع کی اہمیت و افادیت اور موضوع کی مکمل پاس داری شرط ہے۔ اس کے فنی معروضات میں یہ امر انتہائی ناگزیر ہے کہ مضمون کا ابتدائیہ، وسطانیہ اور اختتامیہ بھرپور، جان دار اور وقیع ہو۔ اسلوبیاتی حوالے سے لایعنی الفاظ و خیالات جس سے اسلوب کے سپاٹ ہونے کا قوی اندیشہ ہو، سے گریز لازم ہے۔ طرزِ اظہار منطقی اور استدلالی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ ایک مضمون نگار کے اندر مذکورہ فکری و فنی خصائص کے پہلو بہ پہلو علم و ادب سے وسیع دلچسپی، صنائع بدائع اور رموز وقائع کا زبردست شعور ہونا چاہیے، جس سے علمِ بیان، علمِ معانی، فصاحت و بلاغت اور اختصار و جامعیت سے عہدہ برا ہو سکے۔ مذکورہ بالا تمہید ان تاثرات کا نتیجہ ہے جو سعید سوہیہ کے مضامین کے مجموعہ مطبوعہ 2012ء ''مضامینِ سعید'' کے غائرانہ مطالعہ کے بعد اقلیمِ خرد پر وارد ہوئے۔ سعید سوہیہ اپنے ہم عصر ادباء کے ساتھ ساتھ پہچان بنانے کے ابتدائی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ ان کا ارتقائی سفر حوصلہ افزا، اور طمانیت بخش ہے۔ موصوف پیشہ کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ اس لیے کائنات و حیات کو حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بحرِ استدلات کے بحر کے شناور ہیں۔ مذکورہ کتاب کا انتساب اور مزاج ترقی پسند سوچ کا آئینہ دار ہے جس کا سبب دبستانِ خیال سے ان کی گہری وابستگی اور فکری ہم آہنگی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو جسارتِ خیالی کی

صحبت کا فیض بھی شامل ہے۔ ''مضامینِ سعید'' میں کل بیس مضامین شامل ہیں جو مقامی، ملکی اور بین الاقوامی ادبی اور سماجی نوعیت کے حامل ہیں۔ شذرہ ہذا میں ہم اُن کے چار منتخب مضامین کا فکری وفنی تجزیہ پیش کرنے کی سعی جمیل کرتے ہیں جو مذکورہ مجموعہ کا مجموعی طور پر خمس قرار پاتا ہے۔ تنقیدی اکائی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور قاری کی طبعِ نازک کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے طولِ بیاں سے گریز مطلوب ہے تاکہ قاری کی سعید سوہیہ کے مضامین سے دلچسپی برقرار رہے۔

''فکرِ اقبال'' کتاب ھذا کا اوّلین مضمون ہے جس میں اقبال اور فکرِ اقبال پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال کی مقبولیت اور پسندیدگی کا جائزہ عالمی تناظر میں لیا گیا ہے۔ اس سے متعلق تمام اسباب وعلل کو عندالبیان سمویا گیا ہے۔ اقبالیاتی حوالے سے اجمالی تحقیقی کاوشوں کا مذکور بھی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان میں اقبال کے سراہے جانے کے انداز کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ عصری حوالوں سے بھی اقبال کی اہمیت اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عہدِ اقبال کے کردار کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اقبالیات کے متعلق عمیق وبسیط آراء بھی بین السطور موجود ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کے حوالے سے اقبال کے افکار اور ہمدردیوں کا ذکرِ خیر بھی ہے۔ مختصر مگر جامع انداز میں اقبال کی علمی وادبی بصیرت کو واضح کرنے کی ایک عمدہ کوشش کی گئی ہے اور قارئین کے لیے اقبال فہمی کے باب وا کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر انتہائی عمدہ مضمون ہے جو بالیدہ فکری کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع مضامین کی فہرست میں شامل ہونے کا استحقاق رکھتا ہے۔ زبان و بیان کا معیار بھی عمدگی کا غماز ہے۔

کتاب کی ترتیب کے اعتبار سے پانچواں مضمون، ساحرؔ لدھیانوی کا صوفیانہ کلام ہے۔ متذکرہ موضوع سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سعید سوہیہ موضوع کے انتخاب میں عمیق احتیاط کے قائل ہیں۔ عموماً طور پر ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں جن پر قبل ازیں کام نہ ہوا ہو، یا بہت ہی کم ہوا ہو۔ یہی سبب ہے کہ ان کا موضوعاتی کینوس جاذبیت کی دولت سے مالا مال ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی کی شاعری کے صوفیانہ تناظر میں معدودے چند ناقدانِ سخن نے دھیان دھرا ہے جب کہ ان کے کلام کے دیگر موضوعات کے حوالے سے بہت کچھ کام ہوا ہے کیونکہ ہمارے سماج اور دنیائے ادب کا ایک بہت بڑا فکری المیہ یہ ہے کہ جس شخص نے عملی طور پر

مذہبی اور صوفیانہ انداز میں زندگی گزاری ہو تو اُسے اس تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ اگر کسی بھی شاعر، ادیب، نقاد یا دانشور کا اس سلسلے میں صرف فکری یا نظریاتی نوعیت کا کام ہو تو اسے اتنا قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنی انتقادیات میں انقلابی اور حیرت انگیز نوعیت کی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ متذکرہ مضمون کے آغاز میں شعراء کے خصوصی فکری گوشوں کی انتہائی سرسری انداز میں صراحت کی گئی ہے۔ اس معاملے کو قاری کی ذہنی طمانیت کا سبب گردانا گیا جو امرِ واقعہ ہے جس سے شاعر کی منفرد شہرت و مقبولیت کے باب وا ہوتے ہیں۔ فکری اعتبار سے صوفیانہ اور ترقی پسند طرز کے افکار اس مضمون میں انتہائی کامیابی سے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں جس سے سعید سوہیہ کی فنی چابکدستی کی غمازی ہوتی ہے۔ مذکورہ شذرہ میں ساحر لدھیانوی کا صوفیانہ اور ترقی پسندانہ طرزِ فکر کا حامل کلام بھی بطور استشہادات شامل کیا گیا ہے۔ مضمون کا اختتام تصوف کا جائزہ برصغیر پاک و ہند کی سطح پر انتہائی مختصر مگر جامع انداز میں کیا گیا ہے جس میں قاری کی نفسیاتی انداز میں پاس داری کی گئی ہے۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے یہ ایک وقیع انداز کا مضمون ہے۔

اُن کا ایک اور مضمون ''بہاڑ پور کی علمی و ادبی رونق جسارت خیالی کے عنوان سے ہے۔ ان کا یہ مضمون فہرست کے لحاظ سے نویں نمبر پر ہے جس میں ملک کے معروف نقاد و شاعر جسارت خیالی کے ادبی کاموں کے تناظر میں ان کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ڈاکٹر خیال امروہوی اور خیال اکیڈمی کے دیگر احباب کا ذکرِ خیر بھی ہے۔ اس مضمون کا آغاز جسارت خیالی کے طبعی اور فکری تعارف سے انتہائی وقیع انداز میں ہوا ہے۔ بعدازیں جسارت خیالی کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مستقبل میں ان کے ادبی ارادوں کی جانکاری بھی مضمونِ ھذا کا حصہ ہے۔ اس شذرہ کے اختتام پر جسارت خیالی کے ادبی مقام و مرتبہ کو لیہ کے ادبی تناظر میں دیکھا گیا ہے جس کے باعث اس مضمون کی مقبولیت کے گراف میں کمی آئی ہے۔ اگر اسے ملکی سطح پر اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی تو مضمون کا معیار دوچند ہو سکتا تھا۔

کتابِ ھذا کا چودھواں مضمون ''ناصر ملک بطور ادیب و شاعر'' ہے جس کے آغاز میں لیہ کی ادبی حقیقت و اہمیت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ بعدازیں لیہ کے دو جلیل القدر شعرا،

تسلیم لیہ، خیال امروہوی اور ان کے تلامذہ کا مذکور ہے چونکہ ناصر ملک کا شمار ڈاکٹر خیال امروہوی کے تلامذہ میں ہوتا ہے اس لیے ان کا مذکور کلیدی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون کے تیسرے پیراگراف میں ناصر ملک کے تعارف کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے جس میں ان کے ادبی ارتقا کے سفر کو چوک اعظم سے ہوتا ہوا پھر لیہ اور بین الاقوامی ادبی افق پر دکھایا گیا ہے۔ اس مضمون میں ناصر ملک کے علمی و ادبی کارناموں کا مجموعی طور پر احاطہ کیا گیا ہے۔ مختلف موضوعات کی تصریحات کے طور پر اُن کے منتخب اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس مضمون کا اختتام ناصر ملک کے فن اور شخصیت کے حوالے سے استخراجی نوعیت کی رائے کی بجائے ان کے چند اشعار پر کر دیا گیا ہے۔

انتقادی نقطۂ فکر کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان کے مضامین موضوعاتی اعتبار سے تین درجات میں منقسم کیے جاسکتے ہیں۔ اولاً کچھ مضامین ایسے ہیں جو مقامی، ادبی اور سماجی اہمیت کے حامل ہیں۔ دوسرے درجے میں وہ مضامین ہیں جن کے افکار برصغیر پاک و ہند کے تناظر میں ہیں۔ تیسرے درجے میں وہ مضامین شامل ہیں جو بین الاقوامی ادبی، سماجی اور سیاسی اہمیت کے حامل ہیں۔ مضامین کی درجہ بندی اس اعتبار سے کی گئی ہے جس تناسب سے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے نمبر پر اوّل الذکر درجے کے مضامین ہیں۔ اس کے بعد دوسرے اور تیسرے درجوں کا نمبر آتا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے کتاب کے پسِ ورق پر سہیل ثاقب کے انتہائی وقیع اور پُر مغز تاثرات ثبت ہیں۔ وہ کچھ یوں رقم طراز ہیں۔

"مضامینِ سعید" بھرپور مطالعہ بخش کتاب ہے جس میں فاضل مصنف جناب سعید سوہیہ جو شائستہ بیاں قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ پروفیشنل وکیل بھی ہیں جنہوں نے زندگی اور زندگی سے لپٹے ہوئے مسائل کو بڑے قریب سے دیکھ رکھا ہے، نے اپنی فطری ادب دوستی کے جلو میں رقم کیا ہے اور جس موضوع کو زیرِ بحث لایا ہے اس سے عمدگی کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

مذکورہ تصریحات میں اس امر کے قوی امکانات ہیں کہ سعید سوہیہ کے فکری و فنی ارتقا کا سفر حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہے۔ عمومی مشاہدے کے اعتبار سے کسی بھی تخلیق کار کی ابتدائی کاوش کا اتنا عمدہ معیار ہونا انتہائی حیرت انگیز امر ہے۔ عام طور پر پہلی تصنیف کا یہ معیار نہیں

ہوتا جو سعید سوہیہ کے ہاں کارفرما ہے۔ جوں جوں ان کی خامہ فرسائیوں کا سفر آگے بڑھے گا، مشاطگیٔ فکر وفن میں ندرت و بلاغت کے مظاہر آشکار ہوں گے۔ بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح ؎

نقشِ اوّل دیکھ آئے نقشِ ثانی دیکھنا

بہر حال سعید سوہیہ کی یہ کاوش اس قدر وقیع ہے کہ اسے پڑھا جائے اور سراہا جائے۔ کتاب ہٰذا کے مطالعہ سے قاری کی کتاب دوستی کو تقویت ملتی ہے۔ صانعِ لوح وقلم سے استدعا ہے کہ ان کے فکر وفن کو افزودگی اور دوام سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

شاعر علی شاعرؔ.....اقلیمِ غزل کی آبرو

غزل اردو ادب کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے جو شعری تاریخ کے ہر عہد میں تندرست و توانا رہی ہے، اگرچہ ابتدائے آفرینش میں اسے تنگیٔ داماں کی شکایت رہی مگر آہستہ آہستہ اس کا دامن وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اپنے ارتقاء کے باعث اب یہ محدودیت کے دائرے سے نکل کر لامحدودیت سے ہم آغوش ہو چکی ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم شاعر علی شاعرؔ کی غزل گوئی کے حوالے سے رقمطراز ہیں جو غزل سے والہانہ محبت رکھتے ہیں، جن کی غزل تخلیقی اعتبار سے وسعتوں کی حامل ہے جو سو اشعار سے بھی تجاوز کر جاتی ہے، ان کا راہوارِ قلم تند و تیز ہے کہ جلد اس کا تھم جانا محال ہے۔ ان کی فنی نکتہ سنجی کا یہ عالم ہے کہ غزل چاہے پچیس اشعار کی ہو، یا پچاس اشعار کی ایک قافیے کو ایک غزل میں ایک بار در آنے کی جسارت ہوتی ہے، ان کی غزل میں موضوعات کے عمیق و بسیط دنیا آباد ہے۔ حیات و کائنات کے اکثر و بیشتر فلسفے جلوہ نما نظر آئے ہیں۔ ان کی غزل کے فکری و فنی خصائص میں داخلی و خارجی اظہار، عصری آشوب، فکری ندرت، عمیق رومانیت، جمالیاتی اقدار کا فروغ، رجائی امکانات، عملی تجربات و مشاہدات کی جھلک، کتھارس کی اہمیت، شعری پُر اسراریت، بے ثباتیٔ حیات، فکری انقلاب، دور اندیشی، زمانہ شناسی، ادراکِ زیست، تلخ حقائق، خود انحصاری کا شعور، انسان دوستی، پند و موعظت، فکر و فلسفہ کی کارفرمائی، کائناتی حقیقتوں کی بازیافت، حق گوئی و بے باکی، احساسِ پندارانا، ذاتی و کائناتی ادراکات کا شعور، عرفان و آگہی، فکری ہمہ گیری، تخلیقی امکانات، نادر النظیر قوافی اور ردیفوں کا استعمال، منظر نگاری، معاملہ بندی، مکالمہ آرائی، تعلیاتی شواہد، صنعتِ ایہام کا خوب صورت اہتمام اور عروضی تلازمات کے فطری التزام کے کوائف پائے جاتے ہیں۔

شبیر ناقدؔ

شاعر علی شاعرؔ جنہیں سراپا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، وہ اسم با مسمّی ہیں۔ ادبی حوالے سے ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر کی اکثر و بیشتر اصناف میں انتہائی دل جمعی سے کام کیا ہے۔ وہ منزلِ شعر و ادب کے اَن تھک راہی ہیں جو خلوص، ریاضت اور لگن کے اصولِ ثلاثہ پر عمل پیرا ہیں۔ ان کی بسیار گوئی کا عالم یہ ہے کہ عمر عزیز کے ۴۷ سالوں میں ۱۱۰ (ایک سو دس) سے زائد شعری و نثری کتب منصۂ شہود پر لا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں بین الاقوامی نوعیت کے حامل سہ ماہی جریدے ''عالمی رنگِ ادب'' جو کراچی سے نکلتا ہے کی ادارت بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے انواع و اقسام کے ادبی کام شروع کئے ہوئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً شعری انتخابات کا اہتمام بھی کرتے رہتے ہیں۔ ملک کے طول و عرض اور بیرونِ ملک رہنے والے شعراء کو متعارف کرنے کا بیڑا بھی انہوں نے اٹھایا ہوا ہے۔ اگرچہ بظاہر ان پر متانت و سنجیدگی کی چھاپ ہے مگر خلوص و مروت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ادب کی خدمت اور دوستوں سے موانست میں روحانی آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کے شعری مجموعہ ''غزل پہلی محبت ہے'' مطبوعہ جولائی 2011ء کی اوّلین چار غزلیات کے منتخب اشعار شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔ مذکورہ مجموعہ کا نام ہی ان کی غزل سے گہری محبت کا غماز ہے۔ کتاب ھذا میں تمام تر طویل غزلیات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند کے چالیس سے زائد شعراء و ادباء کی آراء بھی اس کتاب کا حصہ ہیں، جس سے شاعر علی شاعرؔ کے ادبی قد و قامت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شاعر علی شاعرؔ کے ہاں داخلی و خارجی اظہار کی یکساں تمثیلات ہیں۔ گویا ان کا تخیل داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ ان کا کلام عصرِ حاضر کا خوب صورت ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی انتہائی عمدگی کے پیرائے میں عکاسی کی ہے، جس میں عکسِ دوراں انتہائی صاف اور شفاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کے شعری مخزن میں عصری آشوب کے بھرپور شواہد ملتے ہیں، جس میں عصرِ حاضر کی دہشتوں، ظلمتوں اور آشوب زدگیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی قوتِ متخیلہ عمیق رومانیت کی غماز ہے، جس میں معاملہ بندی کی صنعت ایک شانِ دل آویزی کے ساتھ پائی جاتی ہے، جس میں وصال کی آسودگی کے پہلو بہ پہلو ایک کرب کی

کیفیت بھی موجود ہے، جہاں جمالیاتی احساسات کے ساتھ ساتھ جمالیاتی اقدار کی حسین پاس داری ملتی ہے، اسی نسبت سے ان کی ایک طویل غزل کے دس منتخب اشعار جو مجموعی طور پر غزل کا ایک خمس بنتا ہے، قارئینِ شعر و سخن کی نذر ہے۔

دل میں سو ڈر جاگ رہے ہیں
جب سے کچھ شر جاگ رہے ہیں

کیسا خوف نے ڈیرا ڈالا؟
ہم تم شب بھر جاگ رہے ہیں

کس شئے کے مٹنے کا ڈر ہے؟
رہزن ، رہبر جاگ رہے ہیں

تجھ بن کیسے زندہ رہیں گے؟
تجھ کو پا کر جاگ رہے ہیں

شاید چھت پر سویا ہے وہ
ماہ و اختر جاگ رہے ہیں

جاگتے تھے مظلوم بھی کل تک
آج ستم گر جاگ رہے ہیں

تیری جھلک پانے کی خاطر
حسن کے خوگر جاگ رہے ہیں

ناری سو گئی چین سے لیکن
اُس کے زیور جاگ رہے ہیں

اُس سے ملنے کیسے جاؤں؟
نوکر چاکر جاگ رہے ہیں

دیکھ کے اُس کا جوبن شاعرؔ
آنکھ کے منظر جاگ رہے ہیں

آپ نے مشاہدہ کیا کہ انہوں نے سہلِ ممتنع کے رنگ میں ایک انتہائی مختصر بحر کو کتنی چابکدستی سے نبھایا ہے جو ان کی مشاقیِ سخن کا اعجاز ہے۔ ان کے فکر وفن کا معیار یہ ہے کہ ان کے ہاں بھرتی کے اشعار تو بعید از قیاس معاملہ ہے ان کے شعری کینوس میں بھرتی کے الفاظ بھی معدوم ہیں ان کا ایک ایک لفظ جچا تلا اور برموقع ہے، جہاں نہ ان کے شبدوں کے تغیر وتبدل کی گنجائش ہے، نہ ان کے مقامات میں تبدیلی کا امکان موجود ہے، جہاں تعقیدِ لفظی کا پورا اہتمام نہیں ملتا ہے۔ یہ امر فکری وفنی اعتبار سے کسی بھی سخنور کا کمالِ فن ہوا کرتا ہے جس سے ان کے لسانی تبحر اور زبان و بیان کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ مصرع در مصرع، شعر در شعر، غزل در غزل بین السطور ایک نادرہ کاری کا احساس ملتا ہے۔ شاعر علی شاعرؔ کے اظہار کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب کو دقیقہ سنجی کے جھمیلوں سے مبرا ومادرا رکھا ہے اور ان کی یہ کاوش فطری نوعیت کی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ شوکتِ الفاظ کے قائل نہیں کہیں کہیں فطری انداز میں ان کے اسلوب میں لسانی تزئین وآرائش بھی پائی جاتی ہے جس سے ان کا اسلوب سپاٹ، بوجھل، گنجلک اور قاری پر گراں گزرنے کی بجائے لطف آمیز کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔

رجائی حوالے سے شاعر علی شاعرؔ کے ہاں بسیط امکانات کا ایک جہان آباد ہے۔ ذہنی تناؤ کے اس عہد میں ایسے افکار اعتبارِ ذوق اور افتخارِ زریں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی غزل عمیق مشاہدات وتجربات کی عمدہ غمازی کرتی ہے، جس سے ان کے ادراکِ زیست کی گہرائی وگیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ان کے اشعار میں تصوف کی فضا بھی پائی جاتی ہے، جس کی بدولت کتھارسس کی اہمیت وافادیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اسی تناظر میں ان کی ایک غزل کا ایک شعر لائقِ التفات ہے۔

دل کا سب میل نکل جائے گا
آنکھ اشکوں سے بھگو کر دیکھو

مزاحمتی یا انقلابی عوامل بھی ہمارے شاعرِ ممدوح کے ہاں فور سے پائے جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو یہ امکان حدِ تیقن کو پہنچ جاتا ہے کہ اُن کی شاعری سراپا مزاحمت یا انقلاب ہے جس

سے ان کے انسان دوست اور ترقی پسند شاعر ہونے کی غمازی ہوتی ہے۔ وہ انسانیت کا درد عمیق رکھتے ہیں، بنی نوع انسان سے ان کی موانست لائق ستائش ہے۔ بین السطور کہیں کہیں بھرپور نوعیت کی فکری پر اسراریت پائی جاتی ہے جو عندالبیان کی دل کشی کو دو بالا کر دیتی ہے۔ رجائی تناظر میں ان میں تمام تر امکانی عوامل پائے جاتے ہیں۔ ان کا آدرش پکار پکار کر انسان دوستی کا آدرش دے رہا ہے۔ وہ شب تیرہ کے زوال اور صبح درخشاں کے متمنی ہیں۔ ان کے تخیلات میں عاجزی وانکساری کا درس بلیغ ملتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو روئے ارضی پر فروتنی سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک ناصحانہ اور خطیبانہ انداز پند وموعظت کی ردا اوڑھے ہوئے ملتا ہے۔ وہ سامراجی استعماریت اور فسطائیت کے شدید مخالف ہیں۔ اس لیے ان کے افکار میں ایک پندار انا کی آموزگاری ملتی ہے۔ اسی پس منظر میں ان کی ایک طویل ترین غزل کے دس اشعار بطور انتخاب دنیائے سخن کے متوالوں کے ذوق طبع کی خاطر پیش خدمت ہیں جو اپنے اندر ایک فکر انگیزی کی فضا سموئے ہوئے ہیں۔

یہ ظلمت کا نشاں کب تک رہے گا؟
ہر اک چہرہ دھواں کب تک رہے گا؟
امیر شہر اتنا تو بتا دے
یہ خط بے اماں کب تک رہے گا؟
زمیں کب تک رہے گی یوں ہی پیاسی
فلک کا یہ سماں کب تک رہے گا؟
فنا کا درس دیتی ہے ہر اک شئے
ترا پختہ مکاں کب تک رہے گا؟
بھلا دے گی یہ دنیا بے وفا ہے
ترا نام و نشاں کب تک رہے گا؟
مسافر جانب منزل چلا چل
شجر کا سائباں کب تک رہے گا؟

کرے گا روح کا پنچھی بھی ہجرت
اسیرِ جسم و جاں کب تک رہے گا؟
کھلیں گے پھول کب میرے چمن میں؟
یہاں دورِ خزاں کب تک رہے گا؟
خود اپنی منزلِ مقصود جانو
امیرِ کارواں کب تک رہے گا؟
شجر بن جائے گا یہ بیج اک دن
حقیر و ناتواں کب تک رہے گا

مذکورہ اشعار سے یہ اندازہ بہ خوبی ہوتا ہے کہ شاعر علی شاعرؔ بے انت تخلیقی صلاحیتوں کے امین ہیں۔ شعری ارتقاء کا یہ سفر انتہائی سرعت سے جاری و ساری ہے۔ یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ ان کے ہاں دور اندیشی کے امکانات بے حد و بے حساب ہیں، جن میں ایک فلسفیانہ سوچ کارفرما ہے۔ وہ ماضی کا ادراک اور حال کا شعور رکھتے ہیں، نیز فردا سے بھی باخبر ہیں۔

پُر آشوب کیفیات کے باعث صنعتِ ایہام فطری طور پر ان کے کلام میں در آئی ہے جس کی وجہ سے ایک گومگو کا عالم دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افکار بسیط نوعیت کے ہیں، حق گوئی و بے باکی ان کے کلام کا وصفِ خاص ہے۔ امامِ عالی مقام سے ان کی عقیدت و محبت والہانہ نوعیت کی ہے، جہاں ان کے کلام میں توانا و معتبر مجازی حوالے ہیں، وہاں معرفت بھی اشعار کے پردے سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ خارجی عوامل ان کے قلم کو لکھنے کی تحریک دیتے ہیں، اس لیے وہ اپنی سخن سنجی کو بے سبب نہیں گردانتے، اسی نسبت سے ان کی ایک غزل کے چھ اشعار قابلِ غور ہیں۔

اکائی کی طرح یکجا نہیں ہوں
مگر میں ٹوٹ کے بکھرا نہیں ہوں
مری وسعت تمہیں معلوم ہو گی
سمندر ہوں، کوئی قطرہ نہیں ہوں

ہے یارو! حق پرستی میرا شیوہ
بتوں کے سامنے جھکتا نہیں ہوں
حسینی ہوں اسی نسبت سے بیعت
یزیدِ وقت کی کرتا نہیں ہوں
مری شہ رگ سے ہے نزدیک کوئی
میں لگتا ہوں مگر تنہا نہیں ہوں
میں خلاقِ سخن ہوں ایسا شاعرؔ
بنا تحریک کچھ لکھتا نہیں ہوں

مذکورہ استخراجات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ شاعر علی شاعرؔ کا تخیل بے پناہ وسعتوں کا حامل ہے۔ ان کا اسلوب انتہائی سادہ اور دل کش ہے۔ ان کے بیان میں کسی قسم کا تصنع نہیں بلکہ ایک فطری انداز کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں آمد ہے آورد نہیں۔ ان کی غزل تغزل کا حسین شاہ کار ہے، جس میں بھرپور نوعیت کی داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی۔ ان کا فکری کینوس متنوع اور بسیط ہے۔ ان کی طویل غزل نگاری عمیق ریاضت کی عکاس ہے۔ ان کا لہجہ بے تکان ہے۔ ان کے قلم میں بے انتہا جولانی و روانی پائی جاتی ہے۔ شاعر علی شاعرؔ ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے عہد کو زبردست انداز میں متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، جس کے باعث دنیائے شعر و ادب میں ان کی ایک واضح پہچان اُجاگر ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆

شاکر کنڈان کی شعری ریاضت

دنیائے ادب میں بہت ہی کم شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو ہمہ پہلو اور ہمہ جہت ہوتی ہیں جنھیں نظم و نثر دونوں پر دستگاہ حاصل ہوتی ہے جو تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ نقدِ فن سے بھی آشنا ہوتی ہیں ایسے منفرد لوگوں میں سے شاکر کنڈان بھی ہیں جو ایک خوبصورت شاعر، نعت گو اور تنقید نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں ایک طویل عرصہ تک سہ ماہی جریدہ ''عقیدت'' بھی نکالتے رہے اور اسی کی ادارت بھی کرتے رہے جس نے اپنے عہد میں نعت گوئی کی روایت کو تقویت بخشی اس کے علاوہ ''عساکر پاکستان'' کے نام سے افواج پاکستان سے وابستہ شخصیات کے تخلیق کردہ ادب کا تبصرہ و تجزیہ بھی تین جلدوں میں چھپ چکا ہے آج ہم ان کے شعری مجموعہ ''ریاضت'' کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ پیش کرتے ہیں مجموعہ ھذا کی اشاعت 2011ء میں عمل میں آئی مذکورہ مجموعہ کلام میں صرف غزلیات شامل ہیں۔

شاکر کنڈان کے ہاں روایت کی خوبصورت پاسداری ملتی ہے وہ متنوع مزاج کے مالک ہیں اس لئے ان کے خیالات میں بھی ایک تنوع پایا جاتا ہے ان کے افکار میں متانت اور سنجیدگی کا چلن ملتا ہے ان کے احساسات میں ایک رفعتِ تخیل کا پہلو بھی کارفرما نظر آتا ہے اسی حوالے سے ان کی غزل کا مطلع لائقِ التفات ہے۔

ہم نے سیکھا ہے بزرگوں سے محبت کا چلن
اور تقدیر سے بھی گاہے الجھ جانے کا فن

ان کے جذبات میں ایک جدت و ندرت پائی جاتی ہے جو ان کی جودتِ طبع کی غمازی کرتی ہے انہوں نے فکر کے فرسودہ راستوں کو جادۂ منزل نہیں بنایا بلکہ نئی راہیں تلاش کی ہیں وہ

عام ڈگر سے ہٹ کر سوچتے ہیں جو ان کی مقبولیت و پذیرائی کی دلیل ہے اس لئے وہ جلد ہی قاری کی ہمدردیاں حاصل کر لیتے ہیں ان کی غزل کے تین اشعار دیکھتے ہیں۔

اس لئے دشمن کو میں نے تیر پہ رکھا نہیں
وہ کہ معیارِ عداوت پر مرے اترا نہیں
میں نے اک مہتاب کو دیکھا تھا آنکھیں کھول کر
اب نظر میں آفتابِ وقت بھی جچتا نہیں
جب سفر میں تھا تو کتنے سائباں تھے راہ میں؟
تھک کے بیٹھا ہوں تو کوسوں دور تک سایا نہیں

افکار ایک تجسیم سے عاری حوالہ ہوتے ہیں انہیں مجسم کرنا کسی شاعر کا کمالِ فن ہوا کرتا ہے ان کے ہاں الفاظ کی حرمت ملتی ہے ان کی غزل کا مطلع قابلِ غور ہے۔

ہم کہ افکار کی تجسیم کیا کرتے ہیں
حرف و الفاظ کی تحریم کیا کرتے ہیں

وہ عسکریت پسند سوچ کے مالک ہیں ان کے ہاں ایک جوش و جذبہ اور ایک ہمت و ولولہ ہے جو بین السطور مشاہدہ کیا جا سکتا ہے وہ فتح و شکست کو قدرت سے منسوب کرتے ہیں لیکن زورِ بازو پر بھی انہیں اعتماد ہے ان کے ہاں حُب الوطنی کے احساسات بھی نمو پاش ہوتے ہیں اور وہ وطن پر قربان ہونے کو جاہ و منزلت قرار دیتے ہیں اسے وجہِ توقیر گردانتے ہیں اسی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار دیدنی ہیں۔

شکست و فتح تو قدرت کے ہاتھ میں ہے مگر
ذرا سا قوتِ بازو پہ انحصار تو ہو
یہ دیکھنا کہ پذیرائی کتنی ملتی ہے؟
تو ایک بار وطن پر ارے نثار تو ہو

ان کے ہاں سہل نگاری کی حسین روایت بھی ہے اور دقیقہ سنجی کا خوبصورت فن بھی ہے اس لیئے اگر اسلوبیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے اسلوب میں تنوع پایا جاتا ہے جو ان

کی طویل المیعاد شعری ریاضت کا ثمر ہے وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اس لئے ان کے ہاں حقیقی زندگی کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں۔ ہر چیز میں انہیں زندگی کی چمک دمک نظر آتی ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

ہوا سے پھول سے اور روشنی سے
تعلق زندگی کا ہے سبھی سے

یہ تو شاکر کنڈان کے کلام سے چند جھلکیاں تھیں جو ہم نے نذر قارئین کی ہیں۔ ان کا تمام تر کلام جاذبیت کی دولت سے لبریز ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انہیں نظم ونثر دونوں پر دسترس حاصل ہے۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ انہیں فکر وفن کے مزید معیارات سے نوازے۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (شہید).....

عصری تنقید کا معتبر حوالہ

سرزمین تنقید بہت سنگلاخ ہے پھر بھی بہت سی قد آور شخصیات نے جنم لیا جن کے فیض گراں قدر سے اقلیم نقد فن مالا مال ہے انہیں اصحاب تگ و تاز میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک معتبر عصری تنقیدی حوالے کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی دو درجن سے زائد تصانیف منصۂ شہود میں آچکی ہیں اور ارباب ہنر سے داد ہنر وصول کر چکی ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

۱۔ مفاہیم (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
۲۔ ترجیحات (تحقیقی و تنقیدی مقالات (انعام یافتہ))
۳۔ اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
۴۔ تصریحات (تحقیقی و تنقیدی مقالات (انعام یافتہ))
۵۔ ترغیبات (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
۶۔ جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق و تنقید)
۷۔ مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی (تحقیق و تنقید)
۸۔ سید وحید الحسن کی شہری جہتیں (تحقیق و تنقید)
۹۔ طاہرین (سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، مناقب اور سلام تجزیہ و تدوین)
۱۰۔ العطش (سید وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ و تدوین)

۱۱۔ آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن)
۱۲۔ آلِ رضا کا فن غزل گوئی (تحقیق وتنقید)
۱۳۔ باقیاتِ آلِ رضا (سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)
۱۴۔ کلیاتِ حبیب (حبیب جونپوری کے کلام کی تدوین)
۱۵۔ شام وسحر کی باتیں (ماہنامہ شام وسحر کے اداریے)
۱۶۔ قیصر اقلیم مرثیہ (تحقیق وتنقید)
۱۷۔ جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی (شخصیت وفن)
۱۸۔ سیف زلفی کے مرثیے (تجزیہ وتدوین)
۱۹۔ قیصر بارہوی (قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کی تدوین)
۲۰۔ حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں (تحقیق وتنقید)
۲۱۔ ادبی بیٹھک (ادبی کالم)
۲۲۔ ادبی چوپال (ادبی کالم)
۲۳۔ مضافاتی شعروادب (تحقیق وتنقید)
۲۴۔ اُردو شعروادب کے سفیر
۲۵۔ اردو شعرادب کی معمار خواتین (مضامین)
۲۶۔ تعینات (مضامین)

ان مذکورہ بالا تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا نہایت آسان ہے کہ ان کے ہاں معیار ومقدار دونوں عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

مسندِ تنقید پر فائز ہونا کارِ دشوار ہے اس فریضہ سے صحیح معنوں میں عہدہ برا ہونا بھی کٹھن ہے لیکن ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اس مشکل کام کو احسن طریقے سے نبھایا ہے وہ جس ادبی شخصیت یا موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اس کی مکمل تصویر زینتِ قرطاس کردیتے ہیں عصری وتہذیبی خدوخال اجاگر کرتے ہیں تمام فکری وفنی پہلوؤں کو زیرِ تجزیہ لاتے ہیں ان کا اسلوب جاذبیت کے رنگ کا حامل ہے کہیں بھی اپنے اسلوب کو گنجلک نہیں ہونے دیتے دقیقہ

نجی سے شعوری طور پر گریز کرتے ہیں مشرقی علوم کی گہری واقفیت رکھتے ہیں صنائع بدائع رموز و دقائق اور علم بیان پر خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ آج کے شذرے میں ہم ان کی موخر الذکر تنقیدی تصنیف ''تعینات'' کے تناظر میں ان کے فنِ تنقید کا تجزیہ پیش کریں گے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی نسبت سے سب سے پہلے معروف نقاد ڈاکٹر انور سدید کی رائے ملاحظہ ہو جائے۔

''تعینات'' کے مصنف ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو میں قدرت کا ایسا کرشمہ سمجھتا ہوں جو نامورانِ ادب کی خالی جگہ کو تکریم و تزئین سے پر کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں وہ اپنی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور زندگی کے متعدد پرکشش اور دلفریب گوشوں سے نظر بچا کر صرف اور صرف ادب سے لو لگائے ہیں اور ادب کی ہمہ وقت خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

''تعینات'' میں انہوں نے درج ذیل موضوعات و شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

۱۔ پیغمبرِ شعر و سخن..... مصطفیٰ زیدی
۲۔ لکھنوں تہذیب کا آخری چراغ سید آل رضا
۳۔ ڈاکٹر آغا سہیل کی افسانہ نگاری
۴۔ ایک گمشدہ تہذیب کا باشندہ ڈاکٹر سہیل احمد خان
۵۔ حفیظ تائب اور حبِ محمدؐ و آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایک تہذیبی افسانہ نگار
۷۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے ''آشوب'' میں عصری آشوب
۸۔ طالب جوہری کے شعری جواہر
۹۔ غضنفر عباس کی شعری کائنات
۱۰۔ صحرائے قطر کا آہو..... محمد ممتاز راشد
۱۱۔ اقبال حیدر کی مرثیہ نگاری، چند معروضات
۱۲۔ کچھ ڈاکٹر محمد ہارون قادر کے بارے میں

۱۳۔ عرفی ہاشمی کے جدید مرثیے

۱۴۔ انسانی جذبات کا عکاس شاعر ڈاکٹر ندیم حسن گیلانی

۱۵۔ ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کے مرثیوں میں عصری حسیت

۱۶۔ معاشرتی کرب اور ساجد پال ساجد

۱۷۔ اعجازِ مودّت کی معجز نمائیاں

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تصانیف و موضوعات کی تفاصیل ملاحظہ کرنے کے بعد یہ امر اظہر من الشمس ہوجاتا ہے کہ ان کی خامہ فرسائیوں کی داستاں بہت طویل ہے ''تعینات'' کے حوالے سے مصنف کی رائے ملاحظہ کریں۔

''تعینات بنیادی طور پر اپنے عہد کے تخلیق کاروں سے مکالمہ ہے میں نے اپنے ہر ممدوح کی کتاب سے گفتگو کی اور خود اس سوال کا کھوج لگایا ہے کہ اس صاحب فہم و فراست نے ہمارے عہد کے کن اہم مسائل و معاملات کو پیش کیا ہے اور کس طرح اپنے ناخن تدبیر سے ان پیچیدہ گرہوں کو کھولنے کی سعی مشکور کی ہے۔ آپ کے نزدیک ''تعینات'' کسی سماجی ناقد کے مضامین کا مجموعہ ہوسکتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ ایک نئی تخیلی ادبی ریاست کا ''ابتدائیہ'' ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے ''تعینات'' میں شامل ہر مضمون کے آغاز میں سماج کے کسی نہ کسی اہم رویئے کی نشاندہی کی ہے اور احساس دلایا ہے کہ ایک معتبر تخلیق کار ہی ان مسائل پر قابو پاسکتا ہے ہمارے عہد کے تخلیق کاروں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں روحِ عصر بھر دیں تاکہ آنے والے زمانوں میں اس کی بازگشت سنائی دے۔''

مصنف کے موقف سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ روحِ عصر اور اہم سماجی مسائل و معاملات کو مقتضیات ادب میں سرفہرست گردانتے ہیں اور ان کا یقین بھی ہے کہ ایک معتبر ادب اور معتبر تخلیق کار کی بدولت ان مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے خیر خواہی اور انسان دوستی ان کی حیات کے مرکزی و کلیدی تلازمے ہیں جنہیں وہ آفاقی حیثیت سے پیش کرتے ہیں ایک مثبت سوچ اور طرزِ عمل رکھتے تھے ان کے نزدیک ایک ناقد کا اوّلین فرضِ منصبی یہ ہے کہ کسی بھی فن پارے کی خوبیوں کو اجاگر کرے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن مشرقی و مغربی ادب و تنقید کا وسیع ادراک رکھتے تھے جہاں انہوں نے مغربی نقادوں کے حوالے دیئے ہیں وہاں مشرقی ناقدانِ ادب کے معروضات کو بھی حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بین التحریر ان کی کوشش ہوتی ہے ممدوح کے فکری و فنی گوشوں کی زیادہ سے زیادہ تصریح پیش کی جائے انہوں نے روایت و جدت کا تال میل پیش کرنے کی سعی جمیل کی ہے وہ چاہتے ہیں کہ جدت کی جڑیں روایت میں پیوست ہونی چاہیں انہوں نے اپنی تخلیقات میں سہل نگاری کے رجحان کو متعارف کرایا ہے کہیں بھی اپنے اسلوب کو ثقیل نہیں ہونے دیا ڈاکٹر سلیم اختر کے حوالے سے ان کا طرز استدلال ملاحظہ ہو۔

''ڈاکٹر سلیم اختر ایک اسلوب ساز تخلیق کار ہیں ان کے اسلوب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں تخلیق کے عناصر موجزن ہیں ایک طویل عرصے کی تخلیقی ریاضت کے باعث ان کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہے'' درشن جھروکہ'' میں اسالیب کے مختلف اور متنوع ذائقے ملتے ہیں کہیں سادہ بیانی ہے اور کہیں مرصع سازی، کہیں مدعا نویسی ہے تو کہیں قافیہ پیمائی تاہم یہ بات طے ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر ہر مقام پر اپنے اسلوب کو اپنے موضوع کے تابع رکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے اسلوب اور فکر میں یگانگت ملتی ہے۔''

مشمولہ تصریحات کی روشنی میں یہ امر پایۂ اختتام کو پہنچتا ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو نقدِ فن پر مکمل دسترس حاصل تھی اور وہ اس حوالے سے نابغۂ روزگار شخصیت تھے دعا ہے کہ خدا ان کے فکری و فنی کارناموں کو بقائے دوام سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

جدتِ فکر کا شاعر.....شہزاد نیّر

جب ہم جدتِ فکر کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد غیر معمولی سوچ اور غیر روایتی طرزِ فکر ہوتا ہے، جس میں ندرتِ صناع بدائع ، رموز و دقائع، تشبیہات و استعارات اور ترکیبات بھی شامل ہیں۔ مذکورہ تمام معاملات کے ساتھ ساتھ لغت کا استعمال بھی نئے رنگ، ڈھنگ اور آہنگ کے ساتھ غیر معمولی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ جملہ امور میں تخلیق کار، یا شاعر کی لاشعوری اور شعوری صلاحیتیں دخیل ہوتی ہیں۔ فطری اور کسبی عوامل فکر کے زاویے متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جدت و ندرت جب تک فنکار کے مزاج کا خاصہ نہیں بنتی، تب تک وہ کچھ نیا اور نادر النظیر تخلیق نہیں کر پاتا۔ ہم نے جب شہزاد نیّر کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو ہمیں وہ تمام عوامل نظر آئے جن کا ذکر ہم قبل ازیں کر چکے ہیں۔ آج کے شذرے میں ہم ان کے مجموعۂ کلام ''چاک سے اترے وجود'' جو غزلیات و نظمیات پر مشتمل ہے اور ''برفاب'' جو صرف نظمیات کا مجموعہ ہے، کے تناظر میں ان کی فکری ندرت کو زیرِ بحث لائیں گے موخرالذکر شعری مجموعہ 2006ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ جبکہ اول الذکر 2009ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ واضح رہے 2013ء میں ان کی نظمیات کا مجموعہ بعنوان ''گرہ کھلنے تک'' منظرِ عام پر آیا۔ ہم پہلے ''چاک سے اترے وجود'' کی غزلوں اور نظموں کو زیرِ غور لائیں گے۔ بعد ازیں ''برفاب'' کی نظموں کو زیرِ تجزیہ لائیں گے۔ کوشش رہے گی کہ طولِ بیان سے گریز کیا جائے۔ ندرتِ فکر کا حامل پہلی غزل کا پہلا شعر لائقِ التفات ہے۔

چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اُس نے انسان کو اس درجہ کشادہ باندھا

شعرِ ھذا میں موصوف نے قدرت کی کرشمہ کاری بھی دکھادی اور اپنی نادرہ کاری بھی۔ ایک شعر کے پیمانے میں مسئلہ جبر و قدر کے فلسفہ کو بھی سمیٹ لیا۔ بندش کے مقابلے میں کشادہ کا استعمال صنعتِ تضاد کا فطری التزام و انصرام ہے۔ پہلے مصرع میں "بندش" اور دوسرے میں "باندھا" بھی حسنِ مترادف پر دال ہے۔ مترادف اور تضاد کا ایک ہی شعر میں ورود بھی شاعر کی کہنہ مشقی اور مشاطگی فن کی غمازی ہے۔ چناں چہ گویا ہیں کہ خالقِ ارض و سما نے بنی نوح انسان پر ایسی پابندیاں عائد کی ہیں اور ایسے ضابطے مقرر کیے ہیں کہ اسے روزمرہ زندگی میں چلتے پھرتے کسی بھی بندش کا احساس نہیں ہوتا یعنی مالکِ کریم و رحیم نے اپنی بندشوں میں بھی وسعت کا پہلو کارگر رکھا ہے۔ اگر عمیق نظری سے اس شعر کا مشاہدہ کیا جائے تو اس میں مالکِ کائنات کی قدرت کا راز بھی مضمر ہے۔

قلب و خرد کے حوالے کا حامل شعر پیشِ خدمت ہے۔

جنون و عقل کی کیسی عجب لڑائی ہے
نظر بچا کے میں دونوں کے درمیان گرا

عام طور پر انسان افراط و تفریط کا شکار رہتا ہے۔ کبھی جنوں کی طرف جھکاؤ زیادہ ہو جاتا ہے یا پھر عقل کی طرف زیادہ راغب ہو جاتا ہے۔ دراصل حسنِ زیست، حسنِ توازن سے منسوب ہے۔ شعرِ ھذا میں بھی اس توازن کی بات کی گئی ہے کہ جنوں اور عقل کے درمیان عجیب و غریب لڑائی تھی لیکن میں نے کسی ایک طرف نظرِ التفات نہیں کی بلکہ میانہ روی اختیار کی۔ جیسے حدیثِ نبوی ہے۔ "میانہ روی بہترین حکمتِ عملی ہے۔" اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ شہزاد نیّر کا کلام محض تفننِ طبع کے لیے نہیں ہے بلکہ شعورِ حیات کا پیغام ہے۔ ان کا ادراک مذہبی فکر اور نوعیت کا حامل بھی ہے۔

اُن کی سوچ کا ایک اور زاویہ دیکھتے ہیں۔

تیرے میرے درمیاں جو مدتوں حائل رہی
ایک ہی آنسو بہا کر بدگمانی لے گیا

یہ شعر خود میں کتھارسس کی اہمیت سموئے ہوئے ہے۔ ایسے اشعار راہِ حیات میں رویہ

سازی کے حوالے سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ رویہ سازی شخصیت سازی کی اہمیت کی حامل ہوتی ہے جس سے مفید کردار جنم لیتے ہیں۔ اس شعر میں یہی بات کی گئی ہے کہ تیرے میرے درمیاں مدتوں جو بدگمانی حائل رہی لیکن اسے ایک آنسو بہا کر لے گیا کیوں کہ دیدۂ تر اور اشکِ رواں صداقت کے اظہار کا مظہر بھی ہوا کرتے ہیں۔

اس غزل کا ایک اور شعر دیکھتے ہیں۔

تمہارے ہجر کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہیں
مرے بدن کا لرزتا ہوا مکان گرا

اس شعر کی ذرا فنی ندرت ملاحظہ ہو۔ ہجر ایک تجسیم سے عاری حوالہ ہے۔ اسے مجسم کرنا اور اسے اعضاء ودیعت کرنا، پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا، بدن کے لرزتے ہوئے مکان کا گرنا سماجی تفاعل کی عمدہ تمثیل ہے۔ مکان ایک بے جان استعارہ ہے۔ بدن کی لرزش اور تحرک نے لفظِ مکان جو جسم کے لئے مستعار لیا گیا ہے، جان دار بنا دیا ہے۔ یہ کسی شاعر کا کمالِ فن ہوا کرتا ہے کہ اپنی قرینہ کاری سے بے جان اشیا میں روح پھونک کر جان دار بنا دے۔ اس شعر کو امیجری اور تجریدی آرٹ کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس شعر میں وہ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ جب تمہارے ہجر سے پالا پڑا تو جسم لرزتے ہوئے مکان کی صورت گر پڑا۔ ساختیاتی حوالے سے بھی ان کا فکری وفنی تجربہ دل چسپی کا حامل ہے۔

ایک اور غزل کا تنہا اور سرور ساماں شعر زیرِ غور ہے۔

میں اضطرابِ زمانہ سے بچ نکلا ہوں
تمہارے قول کو دل کا قرار کرتے ہوئے

شعرِ ھذا کو معرفت ومجاز دونوں حوالوں سے مہمیز کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ شعر پہلو داری اور ایہام کا حامل ہے۔ اگر اسے معرفت سے تعبیر کیا جائے تو اس کی فکری صورت کچھ یوں بنتی ہے کہ مجھے اضطرابِ زمانہ سے مفر حاصل ہے۔ کیوں کہ میں نے تمہارے قول کو دل کا قرار کرلیا ہے، یعنی ارشادِ خداوندی کی طرف اشارہ ہے "لاتقنطو من رحمۃ اللہ" اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔" اس شعر سے رجائیت کی جڑیں پھوٹ رہی ہیں۔ امید کی لویں ضوپاش ہو رہی

ہیں۔قنوطیت اور یاسیت کی تیرگی کے پردے چاک ہو رہے ہیں، نا امیدی فرو ہو رہی ہے۔

ایک روایتی فکر کا حامل شعر لائق تبصرہ ہے۔

نہ اتنا ذکر ہو باغِ عدن کا
وہیں چھینی گئی پوشاک میری

شہزاد غیر انسانی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتے ہیں اور یہی شعور اس شعر میں بھی جلوہ گر ہے۔انسان کی جبلت میں یہ امر شامل ہے اور یہ اس کا فطری جذبہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو اپنے فکری گوشے میں محفوظ رکھتا ہے۔اسے فراموش نہیں کر پاتا۔کیوں کہ اس کا حال، ماضی اور مستقبل دونوں سے جڑا ہوتا ہے۔انسان کی یہی خصوصیت اس کے تہذیبی شعور میں بھی شامل ہوتی ہے۔یہی عناصر اس شعر میں بھی جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔یہ شعر غیر روایتی نوعیت کا اس لیے ہے اور غیر معمولی اس لیے ہے کہ عمومی طور پر باغِ عدن یعنی بہشت کا تذکرہ بڑے شد و مد اور کر و فر سے کیا جاتا ہے لیکن وہ گویا ہیں کہ باغِ عدن کا تذکرہ ہمارے سامنے نہ کیا جائے۔کیوں کہ وہاں ایک انسانی سانحہ وقوع پذیر ہوا تھا۔انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو خلعت سے محروم کر دیا گیا تھا۔اس لیے اس کا مذکور ہمارے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔یہ شعر ایک تلمیحی حوالے کا آئینہ دار بھی ہے۔

ساختیاتی اہمیت کا حامل ایک اور شعر دیدنی ہے۔

پیکارِ غم نصیب میں پیکانِ نم نقیب تھے
گفتارِ سم نصیب میں خنجر بجھا دیئے گئے

زیرِ تبصرہ شعر میں مصرعوں کی نشست و برخاست ساختیاتی حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ترکیبات و استعارات کا حسن فکر و نظر پر خیرہ گری کا تاثر رکھتا ہے۔پیکارِ غم کے مقابلے میں ہم قافیہ گفتارِ سم کی ترکیب جہاں ایک صوتی حسن پیدا کر رہی ہے، وہاں ان دونوں تراکیب کا حسن بھی جاذبِ نظر اور فکر انگیز ہے۔پیکانِ نم کی ترکیب بھی بہت دل کش اور لطف آمیز ہے۔دوسرا مصرع بھی خود میں دل چسپی کا بحرِ بیکراں سموئے ہوئے ہے۔موصوف یوں گویا ہیں کہ غم کی پیکار ہمارے نصیب میں تھی اور نیروں کے تیر ہمارے نقیب تھے۔زہر آلود گفتگو

ہمارا نصیب ہو چکی تھی، جس میں خنجر بجھا دیئے گئے۔ ایک گفتگو زہریلی تھی اور اس پر طرہ یہ بھی ہے کہ اس زہریلی گفتگو کے زہر سے خنجر بجھا دیئے گئے۔ اس شعر میں بیان کی طرفگی اس کی ندرت پر دال ہے۔

تحریکِ عمل کے حوالے کا ایک شعر ملاحظہ ہو

زمانہ ریت کا طوفاں ہے جاگو!
اجل بن جائے گا سونا ہمارا

اس شعر میں ایک پیغامِ عمل ہویدا ہے۔ سعی پیہم کی ترغیب سے کہا گیا ہے، زمانہ یا وقت اتنی سرعت سے گزر رہا ہے جیسے ریت کا کوئی طوفان ہو۔ اگر ہم نہ جاگے تو یہ ریت کا طوفان ہماری ہستی کو نیستی میں بدلنے پر قادر ہے۔ لہٰذا عصری تقاضا یہ ہے کہ خواب کی بجائے بیداری اختیار کی جائے۔ ورنہ زمانہ جو ریت کے طوفان کا مثیل ہے، ہماری خفتگی کو اجل میں بدل دے گا۔ حقیقت میں اس شعر میں بنی نوع انسان کو دعوتِ عمل بیک وقت خوب صورت اور بھیانک طریقے سے دی گئی ہے۔ بھیانک اس لیے ہے کہ پرخطر تشبیہ اور استعارہ لایا گیا ہے اور اس کی خوب صورتی یہ ہے کہ انسانی فطرت صرف وعید کی صورت میں درسِ عبرت لیتی ہے اور عمل کرتی ہے۔

ایک اور شعر لائقِ توجہ ہے۔

اب جو اُجڑا ہے تو کچھ تم پہ تو الزام نہیں
قریۂ دل تھا مرا وقفِ بلا پہلے سے

عام طور پر دل کی تباہی محبوب یا قسمت کے سر تھوپ دی جاتی ہے، یا مقدر کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، یا گردوں کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے اور یہ موضوع ہماری روایتی شاعری کا ہر دل عزیز ہے۔ جب کے اس شعر میں معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ کہا گیا ہے کہ میری دل دھرتی تو پہلے ہی اجاڑ پن کا شکار ہے۔ یہ الزام میں کسی کو نہیں دیتا۔

غزل کے تین اشعار دامنِ التفات کھینچ رہے ہیں۔

یہ کائنات خواب ہے کہ وہ جہاں خیال
کچھ تو جواب دو اے خفتگانِ خاک

نقشِ قدم حضور کے یاں بھی، وہاں بھی ہیں
اک خاک آسمان ہے اک آسمانِ خاک
نیّر نوائے حرف تو مٹی کی چیخ تھی
پندارِ فن کی بات ہے گویا گمانِ خاک

شعرِ اوّل میں اہلِ برزخ سے خطاب ہے۔ ایک استفسار ہے، اصل میں موصوف دونوں جہاں کی حقیقت کے متلاشی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے اہلِ برزخ ہم پر اس راز کو افشا کرو۔ کیوں کہ تم تو اس دنیا میں بھی رہ چکے ہو، اور عالمِ برزخ میں بھی۔ لہٰذا تمہارا مشاہدہ عمیق ہے کہ یہ کائنات خواب ہے یعنی اس دنیا کی حقیقت خواب کی سی ہے، یا وہ جہاں جس سے تم اس وقت منسوب ہو، ایک خیال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اے خاک میں سونے والو! اس اسرار سے پردہ اٹھاؤ اور ہمیں کچھ تو بتاؤ، شعرِ دوئم میں شاعر مذکور گویا ہیں۔ بہ نسبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصل میں یہ شعر واقعۂ معراج کی نسبت سے ہے۔ جب حضور نے مکہ سے بیت المقدس، پھر ہفت افلاک کی سیر کی۔ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے کعب، کعبۂ قوسین کی صورت قربت الٰہی کا شرف حاصل کیا۔ اس حوالے سے وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم یہاں بھی ہیں۔ یعنی اس کائنات میں بھی اور افلاک مع عرشِ بریں، جو زمیں پر آپ کا نقشِ پا ہے۔ وہ آسمان کی خاک ہے اور جو افلاک پر ہے وہ خاک کا آسمان ہے۔ شعرِ ھذا میں انہوں نے لفظی تغیر وتبدیلی یعنی رعایتِ لفظی سے حسنِ ایمائیت پیدا کیا ہے۔ شعرِ سوم میں قلہ دفن کی جڑیں خاک یا زمین میں پیوست ہیں یہ موضوع ان کی غزلیات اور نظمیات میں وفور سے پایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں کہ اے نیّر حرف کی آواز اصل میں مٹی کی چیخ ہے چیخ کا لفظ تاثر میں اضافہ کرنے کے لیئے لایا گیا ہے اور فن کے انا کی بات اصل میں خاک کے گمان کی حیثیت رکھتی ہے شعرِ ھذا میں خاک کو ترجیح دی گئی ہے اصل میں ان کے شعور کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں جو عاجزی انکساری اور خاکساری کی دلیل بھی ہیں حب الوطنی کا مظہر بھی۔ یہ امر لائقِ تحسین و صد ستائش بھی ہے۔

غزلیات کے سلسلے کا آخری شعر اس مرحلے کی آخری کڑی کے طور پر نذرِ قارئین ہے۔

نیستی ہے کمال ہستی کا
انتہائے طرب اداسی ہے

شعرِ ھذا میں شاعر کی کہنہ کاری، کمال فن کاری اور فنی بلوغت پر دلالت کرتی ہے۔ ہر مصرع میں ایک بار صنعتِ تضاد کا برجستہ اور فطری ورود ہوا ہے شعر میں دوبار اس صنعت کو بروئے کار لایا گیا ہے اس شعر میں ایک عمیق احساس نمو پاش ہو رہا ہے موصوف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم لوگ جسے مرگ تصور کرتے ہیں وہی زندگی کا کمال ہے کیونکہ اس کے بعد نہ زندگی کو زوال ہے بلکہ ہمیشہ رہنے والی حیات ہے یعنی نیستی ہی ہستی کا کمال ہے ہماری موجودہ زیست جسے ہم انتہائے طرب سے موسوم کرتے ہیں اس کا انجام اداسی ہے یعنی بالآخر انجام موت ہی ہے درحقیقت اس شعر میں گہرائی و گیرائی کے حامل دو فلسفے بیان کیے گئے ہیں کیونکہ وہ حیات و کائنات کو فلسفی شاعر کے طور پر دیکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات شہزاد نیّر کی غزل کی فکری و فنی ندرت کی نسبت سے تھیں ان کے علاوہ بھی ان کے متعدد اشعار ہیں جو حوالے کے طور پر استعمال ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں لیکن ہم اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ طولِ بیاں قاری کے لئے بارگراں ثابت ہوگا شہزاد نیّر کا ایک مخصوص رنگِ تغزل ہے جس میں ان کی جودتِ طبع اور نادرہ کاری نمایاں ہے وہ ایک منجھے ہوئے شاعر کی طرح اپنے بیاں میں تفنن پیدا کر دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں مختلف طریقہ ہائے کار سے کام لیتے ہیں۔ نادر النظیر استعارات و تشبیہات و ترکیبات، ضائع بدائع، رموز و وقائع اور عروضی محاسن اُن کے کلام کے اوصافِ حمیدہ ہیں لفظوں کے معمولی ہیر پھیر سے وہ بہت بڑے فلسفے تخلیق کرنے پر قادر نظر آتے ہیں جہاں ضرورت محسوس ہو وہاں رعایت لفظی اور کسر نفسی سے بھی کام لیتے ہیں قاری کے لیے ان کی لغت اور اسلوبِ نگارش خالی از دلچسپی نہیں یعنی اسلوبیاتی حوالے سے بھی ان کا کلام لائقِ اعتنا ہے۔

اب ہم ان کی نظم کی بابت بات چلاتے ہیں شہزاد نیّر کا شعری کینوس غزل کی نسبت نظم میں زیادہ وسیع و عمیق ہے اس کی اصل وجہ غزل و نظم کا صنفی مزاج ہے نظم کی نسبت غزل لطیف ضابطوں کی امین ہوتی ہے اس لیے نظم کے قاری اور غزل کے قاری میں بھی بلحاظ مزاج فرق پایا

جاتا ہے غزل میں خیالات زیادہ جزئیات کے متحمل نہیں ہو سکتے اس کے برعکس نظم کا دامن کشادہ ہے غزل کے خیالات مختصر الفاظ کے متقاضی ہوتے ہیں جب کہ نظم کا پیرایۂ زبان و بیان پھیلاؤ کا حامل ہوتا ہے غزل میں کسی بھی موضوع کی مکمل جزئیات کو زیر بحث لانا محال ہوتا ہے جب کہ نظم ایک اتھاہ سمندر ہے جس کا کنارے سے مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا نظم ایک بحرِ بیکراں ہے جس کا پہلا کنارہ تو نظر آتا ہے جبکہ دوسرا کنارہ بعید از بصارت و بصیرت اور قیاس آرائی ہے شہزاد منیر کی نظم میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے طوالت کے اعتبار سے انہوں نے ہر نوع کی نظمیات تخلیق کی ہیں مختصر و طویل اور درمیانے درجہ کی نظموں میں ان کی قوتِ متخیلہ فکری و فنی سمعی و بصری، لسانی و صوتی اعتبار سے ممتاز و ممیز ہونے کے ساتھ ساتھ نادر و نظیر بھی ہے۔

ہم سب سے پہلے ان کے شعری مجموعہ "چاک سے اترے وجود" کی چند نظمیات کو زیر بحث لائیں گے سب سے پہلے ہم ان کی نظم "مشینی ارتقاء" ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔

ستارے بجھتے جاتے ہیں
افق پر گرد اڑتی ہے
شفق کا رنگ کالا ہے
دھنک کے سرمئی گھونگھٹ میں ساتوں رنگ مدھم ہیں
فلک کے نیلگوں چہرے پہ اک میلی چادر ہے
تپش خورشید میں ایسی
زمیں کی مانگ اجڑی ہے
گلوں کے رنگ پھیکے ہیں
صبا کی چال بوجھل ہے
ہوا خوشبو سے خالی ہے
مشینی کالکوں سے اک ردائے تار ڈالی ہے
ہماری صبح کالی ہے ہماری شام کالی ہے
کثافت روک لو، اس سے ہوا کی سانس رکتی ہے

فلک کی سمت دیکھو تو مری آنکھیں سلگتی ہیں
زمیں کی گود میں لیٹوں
مگر رخسار جلتے ہیں
مرے آگے دھندلکا ہے
مشینی ارتقا ہم کو یہ کس منزل پہ لے آیا؟

تلمیحِ ھذا فضائی آلودگی کے حوالے سے ''مشینی ارتقاء'' کے نام سے قلم بند کی گئی ہے اسے آپ ماحولیاتی تناظر میں شاہکار قرار دے سکتے ہیں اس میں قاری کی مناسبت سے ممکنہ تمام جزئیات ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہیں اسلوبیاتی، ساختیاتی اور نفسیاتی حوالے سے دیکھیں یا نظری و عملی نقطہ نگاہ سے یہ نظم ایک نادر نمونے کی حیثیت رکھتی ہے یہ نظم منظر نگاری اور تجریدی آرٹ کا ایک دلکش مرقع ہے۔

شہزاد نیّر نے جہاں طویل نظمیں لکھی ہیں وہاں ان کی مختصر نظمیات اپنی عجب بہار دکھاتی نظر آتی ہیں وہ موضوع کو دفعتاً سمیٹنے کا فن جانتے ہیں مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود بھی کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔

آیئے ایک اور نظم پڑھتے ہیں جو ''گورستان'' کے سرنامے سے عبارت ہے۔

میں نے کفنا کے تیری یادیں سبھی
اپنے سینے میں دفن کر ڈالیں
اب تو ہر ایک آشنا میرا
اپنی ٹوٹی ہوئی محبت کی
لاش کاندھے پہ لے کے آتا ہے
یہ مگر پھیلتا ہی جاتا ہے

قارئین کرام آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شاعرِ مذکور نے نظم کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور فکر کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں رہنے دیا۔

اب ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''برقاب'' میں سے کچھ نظموں کا جائزہ لیتے ہیں اس

مجموعۂ کلام میں زیادہ طویل اور درمیانے درجے کی نظمیں شامل ہیں وہ نظم میں موضوع کی جزئیات بیان کرتے ہوئے منظر نگاری کے دلکش نمونے بھی دکھا جاتے ہیں شہزاد نیّر کی نظموں میں اپنی مٹی سے محبت اور مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے وہ مرد و زن کے ساتھ ساتھ اپنی دھرتی کے سپوت بھی ہیں غزلیات کی نسبتاً نظمیات میں مٹی سے محبت کے حوالے سے زیادہ گہرے ہیں ان کی نظم سیاہ چن کا وسطانیہ ملاحظہ ہوا۔

جہاں میں ہوں
وہاں سورج نظر آتا ہے مشکل سے
جہاں پر دھوپ میں بس روشنی کا نام ہوتا ہے
جہاں گرمی کے موسم پر گماں ہوتا ہے جاڑے کا
جہاں پارہ نہیں اٹھتا
جہاں سبزہ نہیں اُگتا
جہاں رنگوں کی پریوں کا کوئی میلہ نہیں لگتا
جہاں خوشبو گلابوں کی
پرندے تتلیاں جگنو
اُسی صورت پہنچتے ہیں
کہ جب اپنوں کے خط آئیں
عدو کی بے حسی ایسی
کہ اس اندھی بلندی پر
نہ جانے کتنے سالوں سے؟
فقط بارود کی صورت ہمارا رزق آتا ہے

آپ نے مشاہدہ کیا کہ اس نظم کا تانا بانا کتنا دلکش ہے، خیالات زنجیر کی کڑیوں کی صورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اسلوب کی جاذبیت کے ساتھ ساتھ ان کی حزنیہ شعری طبع کی عکاسی ہوئی ہے امیجری اور منظر نگاری اپنی مثال آپ ہے اگر ان کی نظمیں طویل

بھی ہوں تب بھی قاری کو بوریت کا احساس نہیں ہوتا اور نہ کہیں اسے سرسری گزر جانے کی اجازت دیتی ہیں۔

ان کی نظم ''نشہ'' کا اوّلیں اقتباس ملاحظہ کریں۔

طلوعِ زماں سے غروبِ مکاں تک
حکومت ہے غم کی لگاتار نم کی
ابد تاب صحرا کا پھیلاؤ دکھ ہے
سراب ایک سکھ ہے
محبت بھی غم اس کی غایت بھی غم
دل پرستو خوشی کی نہایت بھی غم

اُن کی ہر نظم میں اُن کی نادرہ کاری نمایاں ہے یہاں بھی اُن کی حزنیہ فکر ندرت کے ساتھ نمو پزیر ہوئی ہے کہ قاری کو اُن کی فکر سے موانست ہونے لگتی ہے۔

علی ھذا القیاس ان کی تمام نظمیں حوالے کا درجہ رکھتی ہیں طوالت کا خوف دامن گیر ہے اس لیے مزید حوالہ جات سے گریز کیا جاتا ہے خالص نظم کا مزاج رکھنے والوں کے لیئے ان کا نظمیہ کلام ایک سوغات کا درجہ رکھتا ہے تخلیق و تنقید سے وابستہ تمام احباب کے لیے دعوت فکر ہے اور اکتساب فیض کا ساماں ہے۔

مشمولہ تمام استخراجات کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ شہزاد نیّر ندرت آمیز شعری طبع کے امین ہیں جدید طرز فکر اور فنی بلوغت اُن کے کلام سے آشکار ہے ان کے فکری و فنی گوشوں کی سیر کے دوران کہیں بھی دلچسپی کا دامن میلا نہیں ہوا اور نہ چھوٹنے پایا ہے رب ادب سے استدعا ہے کہ انہیں فکر و فن کی مزید وسعتوں سے ہمکنار کرے (آمین)

☆☆☆☆☆

شہناز پروین کا اساسی افسانوی مزاج

ادب کی اساس حیات و کائنات پر رکھی گئی ہے اور یہ امر کسی قلم کار کی کامیابی و کامرانی کی نوید ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تخلیقات میں ان امور کی مرصع کاری ہو، آج ہمارا موضوع بحث شہناز پروین کا افسانوی مزاج ہے جو اساسی نوعیت کا حامل ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی جیتی جاگتی، جگمگاتی اور اپنے حقیقی رنگوں میں ہویدا ہوئی ہے۔ شہناز پروین کا تعلق کراچی سے ہے اور معروف شاعرہ شمیم نسرین کی صاحب زادی ہیں جو 2010ء میں راہیٔ ملک عدم ہوئیں۔ اس سے قبل کہ ہم ان کے افسانے کو تجزیاتی چھلنی سے گزاریں۔ اِن کی افسانہ نگاری کے حوالے سے معروف و معتبر ارباب نقد و نظر کی آراء مختصراً ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔

''مواد اور موضوع تو خیر بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن ''حسنِ بیاں'' آپ کا اپنا ہے۔ ایسا تیکھا اور کارگر کہ قاری اپنے آپ کو افسانوں کی داد دینے پر مجبور پاتا ہے اور یہ وصف تو ایسا ہے جو سب کو نہیں کسی کسی افسانہ نگار کو نصیب ہوتا ہے۔''

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحوالہ اولین افسانوی مجموعہ ''سناٹا بولتا ہے'')

''شہناز پروین کہانی اور اس کی تعمیر پر ماہرانہ دسترس رکھتی ہیں۔ وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہانی سناتی ہیں لیکن ہلکے پھلکے انداز میں آہستہ آہستہ درد اور کرب کے پہلو نمایاں ہوتے جاتے ہیں اور کہانی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ہلکا پھلکا انداز بڑی گہری معنویت اور حالات کے جبرِ مسلسل سے عبارت ہے۔''

(ڈاکٹر اسلم فرخی بحوالہ افسانوی مجموعہ ''سناٹا بولتا ہے'')

''شہناز پروین کی کہانیاں عام طور سے مختصر ہوتی ہیں۔ یہ کہانیاں قارئین پر آئینہ در آئینہ کھلتی ہیں۔ ان کا کھلنا قاری پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے اثرات چھوڑتا ہے۔ شہناز پروین

کی کہانیوں میں مکالمات لائے ہوئے نہیں، آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خوبی مکالمات میں تب داخل ہوتی ہے جب غیر ضروری کسب کا دخل در معقولات نہ ہو، بعض کہانیوں کی ابتداء معمولی ہوتی ہے لیکن اختتام تک پہنچتے پہنچتے یہ غیر معمولی بن جاتی ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں میں تمثیل کارفرما ہوتی ہے اور اسے کہانی میں برتنا بھی جانتی ہیں۔''

(ادیب سہیل بحوالہ افسانوی مجموعہ ''سناٹا بولتا ہے'')

''اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ عصرِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں کون افسانہ نگار ہے جو جدید افسانے کامیابی سے لکھ رہا ہے جس کے موضوعات میں تازہ کاری بھی ہے اور فن کاری بھی جو عصری مسائل کو کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کر رہے ہیں تو اسے افسانہ نگاروں میں ایک نام بلا تامل لوں گی اور وہ نام ہے شہناز پروین کا کیونکہ وہ کہانی کہنے کا فن جانتی ہیں اور افسانہ نگاری کے نئے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اِن کا اسلوب بھی خوبصورت، دلنشیں اور پُر اثر ہے۔''

(افتخار اجمل شاہین بحوالہ افسانوی مجموعہ ''سناٹا بولتا ہے'')

''شہناز پروین کے مشاہدات و احساسات کا سبب اردگرد کا ماحول ہے اور وہ قوت ہے جسے وہ اپنے ساتھ لے کر واقعات کی جزئیات تک پہنچ کر انہیں آسانی کے ساتھ تحلیل کر لیتی ہیں، شہناز پروین کے افسانوی کردار سے ملاقات کرتے ہوئے ہمیں کسی طرح کا تکلف محسوس نہیں ہوتا کیونکہ ان کا تعلق ہمارے اپنے معاشرے سے ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی، اخلاقی، اصلاح پسندی کی فضا بنا کر زندگی کی خارجی اور داخلی کیفیتوں کی عکاسی کی ہے جس میں سادگی اور خلوص شامل ہے۔

(عشرت رومانی بحوالہ چند ہم عصر افسانہ نگار)

مذکورہ اہلِ نقد و نظر کے گراں قدر اور وقیع تاثرات سے شہناز پروین کے افسانوی مقام و مرتبہ کی اہمیت و فوقیت مبینہ طور پر آشکار ہوتی ہے۔ مشمولہ آراء ان کے اوّلین افسانوی مجموعہ ''سناٹا بولتا ہے'' مطبوعہ جولائی 2000ء کے تناظر میں تھیں جو اِن کے افسانوی سفر کے نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔

شہناز پروین کے دوسرے افسانوی مجموعہ ''آنکھ سمندر'' مطبوعہ جولائی 2005ء کے

حوالے سے ڈاکٹر حنیف فوق رقمطراز ہیں:

''شہناز پروین افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جس کے سامنے افسانہ نگاری کی روایات کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے اور اس سرمائے میں انسان دوستی اور مثبت اقدار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی مگر نہ صرف باہر کی دنیا میں شکست و ریخت کا عمل جاری تھا بلکہ خود فنی اظہار کے سانچے بھی ٹوٹ رہے تھے اور افسانہ نگار کی نظر ہی پر چھائیوں میں الجھی ہوئی نہیں تھی اس کا باطنی نظام بھی درہم برہم ہو رہا تھا۔ ان حالات میں بھی شہناز پروین نے زندگی کی اچھائیوں سے اپنا واسطہ رکھا اور ٹوٹتے ہوئے انسانی رشتوں کے درمیان انسانیت کی تلاش کو فراموش نہیں کیا۔''

شہناز پروین کے افسانے میں زندگی کے غائرانہ مطالعہ و مشاہدہ کے تجربات ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانے کے توسط سے زیست کی چھوٹی چھوٹی سچائیوں کو سمیٹنے کی سعی مشکور کی ہے۔ ان کے ہاں انسان دوستی کے شواہد بھی وفور سے ملتے ہیں۔ اِن کا اسلوب ہر نوع کے تصنع' آلائش اور ماورائیت سے ماورا ہے۔ لایعنی خیالات و احساسات سے ایک فطری گریز کا پہلو ملتا ہے۔

ان کے دوسرے افسانوی مجموعہ'' آنکھ سمندر'' مطبوعہ جولائی 2005ء کے دو افسانے شاملِ تجزیہ ہیں۔ مجموعہ ھذا کا نام بھی اِن کی نظری وسعت کا غماز ہے۔

''آنکھ سمندر'' کتابِ مذکور کا اوّلین افسانہ ہے جسے اس مجموعہ کے نمائندہ افسانے کی حیثیت حاصل ہے، اس لئے اس افسانوی مجموعہ کا سرنامہ بھی قرار پایا ہے۔ اس کہانی کا پسِ منظر سیر و سیاحت سے منسوب ہے۔ یہ افسانہ انسانی مجبوریوں اور المیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی کہانی ہمارے سماج کی جیتی جاگتی کہانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ افسانہ حزنیہ طرزِ فکر کا عکاس ہے۔ افسانے کے پلاٹ میں اس قدر تسلسل ہے کہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہیں جن میں غیر ضروری پھیلاؤ کی گنجائش نہیں ہے جس میں شہناز پروین کے حسیاتی عمق کو بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''مجھے سونی کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا اور صبح کا اخبار اٹھالیا۔ ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔ کسی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ نیچے لکھا تھا'' کیتھرین پاگل خانے سے بھاگ گئی ہے۔ پولیس اور پاگل خانے کا عملہ اس کی تلاش میں ہے۔ کسی کو نظر آ جائے تو

دیئے گئے نمبروں پر فوراً رابطہ کریں۔"

اس افسانے میں حیات کے تلخ و مہیب روپ کو آشکار کرنے کی سعی جمیل کی گئی ہے جس میں وہ بخوبی کامیاب نظر آتی ہیں۔

"آنسو بم" اس مجموعے کا دوسرا افسانہ ہے جو بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے جس میں نیو ورلڈ آرڈر کی واضح جھلکیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اس افسانے کی بدولت عصرِ حاضر کے بچوں کی حسیاتی بیداری کو نمایاں کیا گیا ہے۔ طفلانہ ادراکاتی سطح خود میں تحیر اور بصیرت کے خصائص رکھتی ہے۔ اس افسانے کا ایک مختصر اقتباس طالبِ التفات ہے۔

"امی صیہونیت کیا ہوتی ہے؟ اسرائیلی مسلمانوں کو کیوں مارتے ہیں؟ انڈیا پاکستان پر حملہ کیوں کرے گا؟ امریکہ سے سب کیوں ڈرتے ہیں؟ اور امی پاکستان کے پاس بھی ایٹم بم ہیں لیکن ہم سوئٹزرلینڈ کیوں نہیں بن جاتے؟"

مذکورہ اقتباس خود میں بسیط استفہامیہ اشارات رکھتا ہے جو عصرِ حاضر کے انسان کے لئے لمحۂ فکریہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی عصری حالات و واقعات کی پرچھائیاں بھی واضح انداز میں اجاگر ہوئی ہیں جن میں سیاسی اور مذہبی عوامل جلوہ ساماں نظر آتے ہیں۔

شہناز پروین کی افسانہ نگاری کے حوالے سے شذرہ ھذا ایک تاثر کا درجہ رکھتا ہے۔ "مشتے از خروارے" کے بمصداق صرف دو افسانوں کو شاملِ بحث کیا گیا ہے۔ اس افسانوی مجموعہ میں کل اکتیس افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانوی مطالعہ سے یہ تاثر پایۂ تیقن کو پہنچتا ہے کہ شہناز پروین کا افسانہ زیست کا حقیقی اور اساسی مطالعہ پیش کرتا ہے اور ان کا افسانہ زندگی سے ہم آہنگ نظر آتا ہے جس سے زیست کے خدوخال نمایاں انداز میں مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔ مزید افسانوی ریاضت ان کی افسانوی اُفق پر رسائی کے سفر کو آسان کرے گی۔

☆☆☆☆☆

شاداب صدیقی.....شاعرِ غم والم

جب ربِ دوجہاں نے بنی نوع انسان کو تخلیق فرمایا تو اسے عقلِ سلیم اور خوبصورت شبیہ بنایا مختلف حسیات و کیفیات بھی ودیعت فرمائیں ان میں مسرت و عسرت حیرت و استعجاب اور غم والم بھی شامل ہیں سوز و گداز اور غم والم کے علاوہ وہ باقی احساسات لمحاتی و وقتی نوعیات کے ہوتے ہیں لیکن غم والم ایک ایسا جذبہ ہے جو دیرپا ہے اور اسے دوام بھی حاصل ہے خدائے سخن میر تقی میرؔ کی ادبی بقا میں فنی خصوصیات کے پہلو بہ پہلو یہ جذبہ بھی کارفرما ہے اگر آپ کسی آدمی سے اس کے پسندیدہ اشعار سنیں تو ان میں زیادہ تر ابیات حزن ہی ہوں گے یعنی غم والم ایک لازوال اور امر جذبہ ہے کلاسیکی، نیو کلاسیکی اور جدید ادب کا دامن بھی اسی دولت سے مالا مال ہے ہم نے شاداب صدیقی کے شعری مجموعہ ''آتشِ پنہاں'' مطبوعہ جنوری 2011ء کا بغور مطالعہ کیا اور ان کے فکری و فنی گوشوں کی سیر ہو کر سیر کی ان کے کلام میں حقیقی زندگی کے دیگر موضوعات بھی وفور کے ساتھ پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں کہیں کہیں ادب برائے ادب کی شمعیں بھی روشن نظر آتی ہیں کیونکہ تلامذۂ ادب کی تربیت ادب برائے ادب کے زمرے میں بھی کرنا چاہتے ہیں طولِ بیاں سے گریز کرتے ہوئے ہم اپنے عرضِ مدعا کی طرف مراجعت کرتے ہیں ہمیں شاداب صدیقی کے شعری مجموعہ ''آتشِ پنہاں'' میں غم والم کا موضوع واضح نظر آیا ہے جو ان کے مستقل حوالے کی حیثیت رکھتا ہے آج کے شذرے میں ہم ان کے فکر و فن کا تجزیہ اسی موضوع کی پاسداری کرتے ہوئے کریں گے بین السطور کوشش رہے گی کہ قارئین پر ان کے فنی خصائص بھی آشکار کیے جائیں۔

غم والم کے حوالے کے حامل چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

دعا رہائی کی مانگی تھی قید خانے سے
رہائی نہ مل سکی مجھ کو اس زمانے سے
کچھ اور زخم مرے دل کے کر گئی تازہ
نسیمِ صبح جو گزری غریب خانے سے
تمام شہر ہی ہے خوں میں نہایا ہوا
نکل کے جائیں کہاں اپنے آشیانے سے
یہ بات سچ ہے نہیں ہے مبالغہ اس میں
کمی نہ درد میں آئے گی غم چھپانے سے

شعرِ اوّل میں وہ حصارِ جہاں وزماں کو قید خانے سے تعبیر کر رہے ہیں اور رستگاری کے لئے محو مناجات ہیں لیکن انہیں زمانے سے رہائی نہیں مل رہی۔ شعرِ دوئم میں وہ نسیمِ صبح کی کرم نوازی کی بے مائیگی کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ میرے زخموں کو مندمل کرنے کی بجائے مزید تازہ کر گئی ہے یعنی جب بھی بادِ سحر کا گزر میرے غریب خانے سے ہوتا ہے میرے غموں میں اضافہ ہو جاتا ہے جب موسم سہانا ہو تو محبوب کی یاد آنا ایک فطری امر ہے پھر محبوب ہزار شیوہ کی یادوں کے ساتھ غمِ ہجراں حشر بپا کرتا ہے تیسرے شعر میں خارجیت کی بھرپور غمازی ہے اصل میں ان کا یہ خارجی رویہ ان کی داخلیت کی پیداوار ہے جب من کی دنیا میں آلام کے سائے منڈلا رہے ہوں تو باہر کی دنیا میں بھی حشر سامانیاں نظر آتی ہیں جیسے راقم الطروف کا یہ مطلع ہے۔

جو میں مضطرب ہوں ، سماں مضطرب ہے
مجھے لگتا سارا جہاں مضطرب ہے

ماحول کی پر آشوبی شاداب صدیقی کو آشیانہ نشینی پر مجبور کر رہی ہے کیونکہ انہیں اپنے آس پاس کا ماحول خوں آلود نظر آتا ہے۔ شعرِ چہارم میں غم کی شدت کے باعث وہ مجبور بیاں ہیں کہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے یہ امر صداقت آمیز ہے کہ غم کی رازداری سے کیفیتِ حزن میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوگی۔

اب ذرا کھارس کی اہمیت کے حامل دو اشعار مشاہدہ کرتے ہیں۔

شب آنچل سے لپٹ کر رولوں
صبح کا چہرۂ غمگیں دھو لوں
کچھ تو نکلے دلِ مضطر کا غبار
غمِ ہستی ذرا ہلکا ہو لوں

زندگی کے رونیوں کی پیداوار رویئے ترجمان زیست ہوا کرتے ہیں جنھیں حیات کی جفا کاریوں کا سامنا ہو وہ شب آنچل سے لپٹ کر روتے ہیں اور حزیں رخِ سحر کو اپنی اشکباریوں سے دھوتے ہیں یہ کیفیت پہلے شعر میں بھی جلوہ افروز ہے کیوں کہ یہ طریقۂ وارداتِ غم غلط کرنے کے لئے کارگر اور موثر ہوا کرتا ہے جیسے راقم الحروف نے بھی اسی قسم کی خواہش اظہار کیا ہے۔

ہمیں رونے دیا جائے
الم ہلکا کیا جائے

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں زیادہ موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کچھ تو میرے دل مضطر کے غبار کا انخلا ہو اور اے غمِ ہستی میں ذرا ہلکا ہونا چاہتا ہوں کیونکہ مصائب و آلام نے مجھے ہلکان کر دیا ہے۔ غزل کا ایک شعر لائقِ التفات ہے۔

کرشمہ ہے مرے اشکِ غم کا دیکھو
زمیں پر سبزہ روئیدہ ہے کتنا

موصوف کا یہ شعر ان کی قوت متخیلہ کا شاہکار ہے گویا ہیں کہ یہ میرے اشکِ غم کا کمال ہے کہ زمیں سبزے سے مالا مال ہے میرے سیلِ گریہ کی بدولت زمیں پر دیکھو کتنا سبزہ اُگ آیا ہے یہاں غم کی پرزور کیفیت کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار احساس پایا جاتا ہے۔

زندگی کے مصائب و آلام کی روداد اس غزل کے مطلع و مقطع میں ملاحظہ کریں۔

مکر و فریب درد کی ماری ہے زندگی
دیکھیں بغور گریہ و زاری ہے زندگی
دلِ تباہ کا کیا پوچھتے ہو حال؟
شاداب ہم پہ حشر سے بھاری ہے زندگی

شاداب صدیقی کی جب ہم حزنیہ شعری طبع کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں مقلدِ میر نظر آتے ہیں یعنی ان کے پاس میر کا سا سوز و گداز ہے اور غم کی بھرپور آواز ہے۔ تہذیبی کرب کی داستان بھی ہے مطلع میں وہ گویا ہیں کہ زندگی مکر و فریب اور درد زدہ ہے اگر حیات کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کریں تو یہ گریہ وزاری سے عبادت ہے دوسرا شعر ان کے ذاتی کرب کا ایک حوالہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ آپ دلِ تباہ کا حال کیا پوچھتے ہیں کہ زندگی کی ناچاکیاں حشر کی اذیت سے بھی فزوں تر ہیں یعنی ہمیں قیامت سے پہلے قیامت کا سامنا ہے ایسی کربناکی شاذ ہی کہیں پائی جاتی ہے۔

زیست کے ناروا رویے کی عکاسی اس مقطع میں دامنِ توجہ تھام رہی ہے۔

رہائی اب ملے شاداب ہم کو
حصارِ ذات کی قیدِ گراں سے

جب زندگی ناگواریوں اور کٹھنائیوں کا مرقع بن جائے تو پھر انسان کا جی چاہتا ہے کہ اب شہنازِ مرگ کو اھلاً وسہلاً و مرحبا کہا جائے مقطع ھذا میں موصوف حصارِ ذات کی قیدِ گراں سے رستگاری کیے خواہاں نظر آتے ہیں کیوں کہ تمناؤں کا خون ہوتے ہوتے زندگی کی رعنائی و دلکشی معدوم ہوگئی ہے۔ غم کی موصوف سے موانست دیدنی ہے۔

کیا تعلق نشاط سے اپنا
ہم سے مانوس غم کے میلے ہیں

شعرِ ھذا میں نشاط و مسرت سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے کہ ہم سے غم کے میلے مانوس ہیں یہ ایک فطری امر ہے جب شب و روز شام و سحر غم سے واسطہ ہو تو غم انسان سے مانوس ہو جاتا ہے یہی کیفیت اس شعر میں کارفرما ہے۔

ایک غزل کے تین اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

لبوں پر جب کبھی موجِ تبسم رقص کرتی ہے
دلِ ناشاد پر اس دم قیامت سی گزرتی ہے
اسیرِ دردِ الفت ہوں قیودِ غم سے کیوں نکلوں
ہمیشہ زندگانی میری تنہائی سے ڈرتی ہے

پریشاں لاکھ ہو انساں نہیں ہے اس کے کچھ بس میں
مگر تقدیر سے بگڑی ہوئی حالت سنورتی ہے

شعرِ اوّل کے پہلے مصرع میں بہار افروز منظر پیش کیا گیا ہے جب کہ مصرع ثانی میں قیامت خیز صورت حال ہے خوشی اور غم کا امتزاج ایک دلچسپ ندرت پیدا کر رہا ہے شعرِ دوم میں ایک روایتی موضوع کو دلچسپ انداز میں برپا کیا گیا ہے گویا ہیں کہ میں اسیرِ دردِ الفت ہوں ایسا اسیر تاحیات اسیر رہتا ہے اور میں قیدِ غم سے کیوں اور کیسے نکلوں میری تنہائی اتنی وحشت انگیز ہے کہ زندگی اس سے خائف اور لرزاں رہتی ہے شعرِ ثالث کے پہلے مصرع میں مسئلہ جبر بیان کیا گیا ہے کہ انسان لاکھ پریشان ہوتا رہے کسی بھی مسئلے کو نہیں سنبھال سکتا کیونکہ انسان کے اختیارات محدود نوعیت کے ہیں دوسرے مصرع میں ایک رجائی انداز کارفرما ہے کہ تقدیر بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے پر قادر ہے اس شعر میں بھی خوشی اور غم کا امتزاج بہت خوبصورت طرز کا حامل ہے۔ غزل کا مقطع لائقِ توجہ ہے۔

شکوہ زبانِ شوق پہ لائے نہ ہم کبھی
شاداب کتنے دور الم کے گزر گئے

وہ مصائب و آلام کی برسات کے باوجود زندگی اور غم سے شاکی نظر نہیں آتے اور زبانِ شوق پر شکوہ بھی نہیں لاتے لاکھ الم کے دور آئیں لیکن ہماری زبان نالہ و شیون سے قاصر رہے گی یہ شعر ان کی بلند حوصلگی کا غماز ہے۔

غزل کے ان چار اشعار میں شاداب صدیقی کا اظہارِ غم دیکھیے۔

بجھ بجھ کے جل رہا ہے میرے پیار کا دیا
اس حسنِ اتفاق پر دل مسکرا دیا
چہرے خود اپنے آئینے میں لوگ دیکھ لیں
کیا تھے انہیں زمانے نے کیسا بنا دیا؟
داغِ جدائی ، دردِ جگر ، کثرتِ الم
برسوں کی چاہتوں کا ہمیں یہ صلہ دیا

یاد آئے اس قدر کہ اُڑیں نیندیں رات کی
چشمِ فغاں سے اشکوں کا دریا بہا دیا

پہلے شعر میں پیار کے دیئے کا بجھ بجھ کے جلنا اور حسنِ اتفاق سے دل کا مسکرانا دلچسپی کا حامل ہے دوسرے شعر میں ایک عمیق مشاہدے کی نشاندہی ہے زمانے کی ستم ظریفی کا تذکرہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ آئینے میں اپنی تصاویر ملاحظہ کریں کہ مرورِ ایام سے ان کی تصویریں کتنی بدل گئی ہیں کیا تھیں اور کیا ہوگئی ہیں زندگی کی تلخیوں نے چہروں کو بھیانک کردیا وقت گزرنے کے کرب نے چہرے کو کرب ناک بنادیا غم کا باعث کچھ بھی ہوسکتا ہے محبت کا غم بھی ہوسکتا ہے اور کسب معاش کا غم بھی ہوسکتا ہے دکھ کوئی بھی ہو خوف کسی بھی نوعیت کا ہو وہ انسانی صورت بگاڑنے پر قادر ہوتا ہے راقم الحروف نے اسی موضوع کو اپنی ایک نظم "مٹتے ہیولے" میں یوں برپایا ہے آپ بھی دیکھیں۔

بھوک سے چہرے بھیانک ہوگئے
خوف کی گردش ہے ہر اک خون میں
اجلے اجلے چہرے کالے پڑ گئے
خوف سے کیوں رنگ پیلے پڑ گئے
نقش دھندلے ہوگئے ہیں ذات کے

تیسرے شعر میں بہت سے لوازمات پیش کیے گئے ہیں ایک شعر میں اتنے تلازمے لانا یقیناً کارِ اُستادی ہے وہ کہتے ہیں کہ برسوں کی چاہتوں کا صلہ مجھے داغِ جدائی، دردِ جگر اور کثرت الم کی صورت میں ملا اس شعر میں روایت کی خوبصورت پاسداری نظر آتی ہے چوتھے شعر میں غمِ محبوب کا حوالہ ہے آپ اسے تصوف اور عشقِ حقیقی پر مہمیز بھی کرسکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ وہ مجھے اس قدر یاد آئے کہ میری رات کی نیندیں گئیں اور چین بھی میرا گیا میری چشمِ فغاں نے اشکوں کا دریا بہادیا اس شعر میں غم کا بھرپور تاثر پایا جاتا ہے۔

زندگی کی بے مائیگی کا مذکور ان کی زبانی سنتے ہیں۔

حادثوں کی نذر ہستی ہو گئی
کس قدر بے قدر ہستی ہو گئی؟

خوب تھی رنگینیٔ عہدِ شباب
تھی غزل اب نثر ہستی ہو گئی

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں وہ فرماتے ہیں کہ میری زندگی حادثوں کی نذر ہوگئی ہے اور کس قدر بے قدر ہستی ہوگئی ہے دوسرے مصرع میں کس قدر ار بے قدر کا ایک ساتھ استعمال بھی چاشنی پیدا کر رہا ہے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں رنگینیٔ عہد شباب کی تعریف کی گئی ہے جبکہ دوسرے مصرع میں زندگی کے ارتقاء کو ایک مصرع میں رقم کر دیا گیا جو شاعر کی قادر الکلامی اور عمیق فنی تجربے کی عکاسی ہے انہوں نے اس مصرع میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے غزل اور نثر دو اصناف ادب کا حوالہ دے کر زیست کی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔

یہ تو چند اشعار تھے جو ہم نے شاداب صدیقی کی خزینہ شعری طبع کے حوالے سے پیش کیے ان کے علاوہ بھی بے شمار اشعار ہیں جو حوالے کے طور پر دیے جاسکتے ہیں لیکن طول بیاں سے گریز بھی ناگزیر ہے شاداب صدیقی کا کلام سادگی کے رنگ کا حامل ہے جس میں غم سے بھرپور جذبوں کی عکاسی ملتی ہے ان کے اوّلین شعری مجموعہ میں تمام تر غزلیات شامل ہیں جو ان کی غزل سے عقیدت کا بین ثبوت ہے تغزل ان کی غزل کا وصفِ عالیہ ہے اگر ان کی مشقِ سخن جاری رہی تو ان کی غزل ان کو اس سے کہیں آگے لے جائے گی۔

☆☆☆☆☆

شفیق الرحمٰن الہ آبادی کا فنِ تنقید

ویسے تو دنیا کا کوئی کام چنداں سہل نہیں ہے کیوں کہ اس کی تکمیل میں بہت سی کٹھنائیاں پنہاں ہوتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے تمام شعبے عمیق ریاضت کے متقاضی ہیں۔ شعر و ادب بھی فنونِ لطیفہ کی ذیل میں آتا ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے اسے دو درجات میں منقسم کیا جاتا ہے۔ درجۂ اوّل میں تخلیقی اعمال شامل ہیں۔ جب کہ درجۂ دوم میں تالیفی معاملات ہیں۔ جب کہ تحقیق و تنقید بھی تالیفی امور کا حصہ ہے۔ خارزارِ ادب میں وارد ہونا ایک دشوار گزار عمل بھی ہے اور کرب انگیز بھی ہے۔ چاہے اس امر کا تعلق درجہ اوّل سے ہو، یا درجہ دوم سے۔ دونوں بسیط عرق ریزی کے خواستگار ہیں کیونکہ تخلیقی مشاہدات و تجربات کے بغیر کوئی بھی محقق یا تنقید نگار اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ محقق یا ناقد کے لیے تخلیقی صلاحیتوں سے مرصع ہونا ناگزیر ہے۔ جب تک اس کی تخلیق یا تنقید سے تخلیقیت کی سطح اجاگر نہیں ہوتی اس کی کاوشیں کارگر ثابت نہیں ہوسکتیں۔ آج ہمارا موضوعِ بیان شفیق الرحمٰن الہ آبادی کا فنِ تنقید ہے۔ اس سے پہلے کہ ان کے تنقیدی و تحقیقی جواہر پر روشنی ڈالیں، ان کا اجمالی تعارف ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا تعلق میلسی ضلع وہاڑی سے ہے اور شعبۂ تعلیم و تعلم سے منسلک ہیں۔ پیشہ ورانہ امور کا بسیط تجربہ رکھتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ سے ان کی تنقیدات اخبارات و جرائد کی زینت بن کر قارئینِ ادب سے خراجِ تحسین سمیٹ رہی ہیں۔ فنِ تنقید میں ان کی کاوشیں بھرپور تنقیدی صلاحیتوں اور ان کی ژرف نگاہی کی غماز ہیں۔ ان کی ہر تحریر ان کی باریک بین طبع کی عکاس ہے۔ وہ کسی بھی تحریر یا فن پارے کے تمام پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتے ہیں اور کسی بھی جہت کو تشنۂ وضاحت نہیں رہنے دیتے۔ ان کا مؤقف منطقی اور استدلالی نوعیت کا ہوتا ہے جسے دفعتاً سمیٹنے

کے ہنر سے بھی بخوبی آشنا ہیں۔ تادمِ تحریر ملک کی متعدد معتبر ادبی شخصیات کے حوالے سے اپنے تنقیدی شذرات پیش کر چکے ہیں جنہیں علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے سراہا جا چکا ہے۔ شذرہ ہذا میں ہمارا موضوع بیان ان کی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی کتاب ''شاعر علی شاعر کی تخلیقی جہتیں'' ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم شفیق الرحمٰن الہ آبادی کی مذکورہ کتاب کے حوالے سے تنقیدی خصائص آشکار کریں، متذکرہ کتاب کے ممدوح شاعر علی شاعرؔ کی ادبی خدمات کی اجمالی صراحت بھی ضروری ہے۔ موصوف ہمہ جہت ادبی شخصیت کے حامل ہیں۔ نظم و نثر کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ مذکورہ شعبوں میں کمال قدرت رکھتے ہیں۔ بہت ہی کم عرصے میں انہوں نے اپنے آدرش میں بے پناہ وسعت پیدا کی ہے۔ تادمِ تحریر جب کہ ان کی عمرِ عزیز چالیس سال ہے۔ باون سے زائد شعری و نثری تصانیف قارئینِ شعر و ادب کو مہیا کر چکے ہیں۔ اتنا ادبی سرمایا بہم پہچانا کسی معجزے سے کم نہیں اور ان کی بسیار نویسی کی بین دلیل ہے۔ اب ہم شفیق الرحمٰن الہ آبادی کی کتاب ''شاعر علی شاعر کی تخلیقی جہتیں'' کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ کتابِ ھذا کی اشاعت مئی 2013ء میں عمل میں آئی۔ اس کا اہتمام ''ظفر اکیڈمی'' کراچی نے کیا ہے۔ دیباچہ ملک کے معروف شاعر اور نقاد خورشید بیگ میلسوی نے ''شاعر علی شاعرؔ کا فکر پیا شفیق الرحمٰن الہ آبادی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جب کہ شفیق الرحمٰن الہ آبادی کا ایک اور تخلیقی کارنامہ'' سے معنون ''پروفیسر شاہدہ فیاض پرنسپل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین میلسی'' کی آراء ثبت ہیں۔ جب کہ کتاب کا مقدمہ موصوف نے خود لکھا ہے۔

اس کتاب کو ناقدِ مذکورہ نے دس ابواب کی حسنِ ترتیب سے نوازا ہے جس کی تزئینِ عنوانات کچھ یوں ہے۔

باب اوّل:	شاعر علی شاعر بحیثیت حمد و نعت گو
باب دوم:	غزل گو
باب سوم:	ترویجی نگار
باب چہارم:	بچوں کا ادیب

باب پنجم: افسانہ نگار

باب ششم: ناول نگار

باب ہفتم: ناولٹ نگار

باب ہشتم: صحافی (ایڈیٹر) مضمون نگار

باب نہم: محقق و مؤلف و مرتب

باب دہم: مینیجنگ ڈائریکٹر رنگ ادب پبلی کیشنز

کتاب کے آخر میں کتاب کے ممدوح شاعر علی شاعرؔ کا تعارف اور منتخب کلام شامل ہے۔ کتاب کی مذکورہ ترتیب اپنے ممدوح کی تمام تر ادبی جہات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے اور کتاب کے نظم وضبط و تزئین و آرائش کی ترجمان بھی ہے۔

باب اوّل شاعر علی شاعرؔ بحیثیت حمد و نعت گو کے حوالے سے ہے جس میں فاضل نقاد نے اپنے ممدوح کا جائزہ چار جہات سے پیش کیا ہے۔ جس میں شاعر علی شاعرؔ بطور حمد گو، بطور نعت گو، بطور منقبت نگار اور بطور سلام نگار شامل ہے جس میں مذکورہ حوالوں کی حامل کتب کا مذکور بھی ہے۔ ان کے حوالے سے شاعر علی شاعرؔ، دیگر ناقدین کی آراء اور موصوف کے تجزیات شامل ہیں۔ خالصتاً تحقیقی انداز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کتب کے سنِ اشاعت بھی دیئے گئے ہیں۔

دوسرا باب شاعر علی شاعرؔ کی غزل گوئی کے حوالے سے ہے۔ شفیق الرحمٰن الہ آبادی کے طرزِ تحریر کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ کسی بھی ہیت یا موضوع کے حوالے سے لکھتے ہوئے اوّل الذکر اس کا تنقیدی پس منظر واضح کرنے کی سعیِ جمیل کرتے ہیں جو ایک منجھے ہوئے نقاد کی علامت ہے۔ غزل کے باب میں انہوں نے شاعرِ مذکور کے مجموعہ ہائے غزل کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے جس میں تواریخِ طباعت اور ناقدین کے تاثرات ثبت ہیں۔

تیسرا باب شاعر علی شاعرؔ کی ترویجی نگاری کی نسبت سے ہے۔ یہ باب خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ترویجی دیگر اصنافِ سخن کی نسبت ایک نیا جہتی اظہار ہے۔ اس حوالے سے شاعرؔ صاحب کو یہ اعجاز و امتیاز حاصل ہے کہ وہ عالمی سطح پر اُردو ترویجی کے پہلے صاحبِ کتاب شاعر ہیں۔ بابِ ھذا میں شاعر علی شاعرؔ کی ترویجی کے حوالے سے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور دیگر

ناقدین کے تجزیاتی تاثرات شامل ہیں۔ چوتھے باب میں شاعر علی شاعرؔ کی بچوں کے ادب کے حوالے سے نظمیات کا تذکرہ ہے جس میں شاعر علی شاعرؔ بچوں کے شاعر اور ادیب کے طور پر سامنے آئے ہیں کیونکہ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور کہانیاں بھی لکھی ہیں اور بچوں کی کہانیوں کے حوالے سے ان کی کتب کی تفاصیل دی گئی ہیں جن میں کتابوں کے نام، سنِ اشاعت اور اس حوالے سے ناقدین کی آرا اس کتاب کا حصہ ہیں۔ اس کتاب میں بچوں کے ایک ناول ''جنت کی تلاش'' کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا کہانی، نظم اور ناول کے حوالے سے شاعر علی شاعرؔ کے ادبی مقام و مرتبے کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

باب پنجم شاعر علی شاعرؔ کی افسانہ نگاری کے متعلق ہے۔ باب کے آغاز میں افسانے کا اجتماعی انداز میں ایک ارتقائی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں افسانہ نگار کی مذکورہ کتب اور افسانوں کی مختصر تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس حوالے سے ناقدین اور محققین کی آراء بھی شاملِ کتاب کی گئی ہیں۔

باب ششم شاعر علی شاعرؔ کی ناول نگاری کے حوالے سے ہے جس میں ناول کی مبادیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے ناول ''گہرا زخم'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب کا اختتام فاضل ناقد کی استخراجی نوعیت کی آرا پر ہوتا ہے۔

باب ہفتم شاعر علی شاعرؔ کی ناولٹ نگاری پر مبنی ہے جس میں ان کی کتاب ''پانچ ناولٹ'' کا انتقادی جائزہ شامل کیا گیا ہے اور ہر ناولٹ کی کہانی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

باب ہشتم ممدوحِ مذکور کی صحافتی خدمات اور ان کی مضمون نگاری کی نسبت سے ہے۔ ان کے صحافتی کردار کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی مضمون نگاری کے حوالے سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی کالم نگاری اور اداریہ نویسی کا پس منظر بھی شامل ہے۔ اس باب کے آخر میں شاعر علی شاعرؔ نے جن معتبر ادبی شخصیات کے انٹرویو کیے ان کا حوالہ شامل ہے۔

باب نہم شاعرؔ صاحب بحیثیت محقق و مؤلف اور مرتب تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی محققانہ، مؤلفانہ اور مرتبانہ حیثیتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بعدازیں ان کو بطور معلوماتی محقق پیش

کیا گیا ہے۔ ان کے مختلف انتخاب ہائے غزل کا مذکور بھی اس باب میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں ''ایک چہرہ ایک کہانی'' سے موسوم ان کے افسانوی انتخاب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے اختتام پر ان کی کتاب ''نیا اُردو افسانہ'' کا مطالعاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں افسانوی حوالے سے شاعر علی شاعرؔ کے تنقیدی کردار کو سراہا گیا ہے۔

باب دہم میں شاعر علی شاعرؔ بحیثیت مینجنگ ڈائریکٹر رنگ ادب پبلی کیشنز کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ جس میں مجلّہ ''عالمی رنگ ادب'' کی ادبی خدمات کا ذکر بھی ہے اور رنگِ ادب پبلی کیشنز کی مطبوعات کی تفصیل بھی شامل کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں شاعر علی شاعرؔ کا تعارف اور منتخب کلام شامل کیا گیا ہے۔

مشمولہ استخراجات اس امر کے وقیع شاہد ہیں کہ شفیق الرحمٰن الہ آبادی نے اپنی کتاب ''شاعر علی شاعرؔ کی تخلیقی جہتیں'' میں انتہائی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اپنے ممدوح کے کسی بھی ادبی اور شخصی گوشے کو تشنۂ تصریح نہیں رہنے دیا۔ یہ امر کسی ناقد کی ژرف نگاہی کا عکاس ہوتا ہے۔ انہوں نے اس تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی کاوش کے باعث نہ صرف شاعر علی شاعرؔ کے ادبی مقام و مرتبے کو محفوظ کیا ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی دنیائے تحقیق و تنقید میں معتبر حوالے کے طور پر امر کرلیا ہے۔ تحقیق و تنقید کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ شفیق الرحمٰن الہ آبادی کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشے۔ آمین

☆☆☆☆☆

شاعرؔ صدیقی کے حُزنیہ شعری امکانات

حُزن و ملال وہ پر تاثیر جذبہ ہے جو ہر عہد میں تر و تازہ رہتا ہے۔ جس کی پذیرائی کبھی ماند نہیں پڑتی اس کا شمار بنی نوع انسان کے فطری احساسات میں ہوتا ہے طرب و تمکنت کے برعکس اسے دوام حاصل ہے جس سے رفعتِ تخیل کو مہمیز ملتی ہے اور اسے فروغ میسر آتا ہے جس کی مثال دنیائے سخن سے خدائے سخن میر تقی میرؔ بھی ہیں جن کے عہد کو ڈیڑھ سو سال سے زائد کا طویل عرصہ بیت چکا ہے لیکن وہ ابھی تک ایک تازہ کار سخنور کی حیثیت سے زندۂ جاوید ہیں شذرہ ھٰذا میں ہم شاعرؔ صدیقی کے کلام کے حُزنیہ حوالے سے قطراز ہیں ان کا تیسری شعری مجموعہ ''جگر لخت لخت'' ہمارے زیرِ نظر ہے جو ہیتی اعتبار سے قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے واضح رہے قبل ازیں ان کے دو شعری مجموعے ''آنکھوں میں سمندر'' اور ''بجھتے سورج نے کہا'' تھا، اربابِ نقد و نظر سے خراجِ تحسین کی دولت سمیٹ چکے ہیں۔ شاعرؔ صدیقی یکم فروری 1933ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے ان کا خاندانی نام عبدالرزاق ہے تعلیم و تربیت اور عملی زندگی کا آغاز کلکتہ سے ہوا لیکن زندگی کا بیشتر حصہ سابق مشرقی پاکستان میں گزرا پھر کراچی آ گئے رسمی تعلیم ایم اے (اردو ادب) ہے ملازمت بھی کی اور صحافت سے بھی وابستہ رہے خامہ و قرطاس سے ان کا تعلق مضبوط بنیادوں پر استوار رہا' شاعری اور تصنیف کا عمل جاری رہا ان کے مذکورہ شعری مجموعہ کے ثلث اول کے منتخب قطعات بطور اشتہارات شاملِ تجزیہ کرتے ہیں ہیتی اعتبار سے قطعہ نگاری اور رباعی کے بعد دوسرا بڑا مشکل فن ہے قطعہ چار مصرعی نظم ہے جس کے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں میں قافیہ ردیف کا اہتمام ہیتی پابندی کا حصہ ہے بعض اوقات پہلے مصرعے میں بھی قافیہ و ردیف کی پاسداری نظر آتی ہے بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ پہلے

اور تیسرے مصرع کا قافیہ الگ رکھا جاتا جبکہ دوسرے اور چوتھے مصرعے کا قافیہ الگ رکھا جاتا ہے جس سے قطعہ کے فنی حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے رباعی کی طرح مخصوص بحور کی کوئی پابندی نہیں ہے کسی بھی بحر میں قطعہ لکھا جا سکتا ہے عہدِ متقدمین و متوسطین میں چار مصرعوں سے زائد بھی قطعات لکھے گئے ہیں۔

شاعر صدیقی کے کلام میں حزن و ملال کے قوی پہلو پائے جاتے ہیں جس سے قاری غم والم سے مانوس ہوتا چلا جاتا ہے اور اُن کی اپنی شخصیت بھی نکھر کر سامنے آتی ہے غم والم کے حوالے سے اُن کے ہاں ایک راز داری کا فلسفہ بھی ملتا ہے جو ان کی شخصی ذہانت و متانت کی بیّن دلیل ہے بسا اوقات مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی طرح اپنے حزن و ملال کا تمسخر اڑاتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اسی تناظر میں ان کا ایک قطعہ ملاحظہ کریں۔

مسکراہٹ مجھے نصیب کہاں
میں اسیرِ غم زمانہ ہوں
میں اُڑاتا ہوں اپنے غم کی ہنسی
تم سمجھتے ہو مسکراتا ہوں

شاعرِ موصوف کے ہاں حقیقت پسندی کا غالب عنصر نظر آتا ہے کچھ تلخ حقائق کا بیانِ ذیشان ہے ان کے ہاں عندالبیّان مفلوک الحال طبقے کی غمازی ملتی ہے جو ان کی ترقی پسند فکر کی ترجمان ہے ان کی زیست کے تجربات و مشاہدات کا عکسِ جمیل بھی ہے غمِ ہستی کے پہلو بہ پہلو غمِ جاناں کے شواہد بھی بھرپور انداز میں پائے جاتے ہیں جس سے ان کے افکار کا حسن دوچند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں حسرتوں کا سوگ اور دل کا روگ اپنی بہار دکھاتا ہوا نظر آتا ہے مخزنیہ طرزِ فکر میں رومان کی امیزش زبردست اہمیت کی حامل ہے۔

تمناؤں کی دنیا میں سکوتِ مرگ طاری ہے
کوئی جھوٹی تسلی سے کہاں تک دل کو بہلائے؟
ابھی تو چاند بھی نکلا نہیں آکاش پر لیکن
ابھی سے پھیلتے جاتے ہیں تیری یاد کے سائے

اُن کے نزدیک غم باعث تگ و تازِ حیات ہے اور محرکِ کائنات ہے زیست کی چہل پہل اور گہما گہمی اسی کے باعث ہے جب آرزوئیں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتیں تو دروں کی دنیا ناکام آرزوؤں کا جہاں بن جاتا ہے حسرتیں یاس و غم کے قالب میں ڈھل جاتی ہیں خونِ دل اور خونِ ارماں زندگی کے چراغ کو جلنے کی شکتی دیتے ہیں۔

دل میں ناکام آرزو کا جہاں
قالبِ یاس و غم میں ڈھلتا ہے
خونِ دل اور خونِ ارماں سے
زندگی کا چراغ جلتا ہے

شاعر صدیقی کے حُزنیہ عوامل لازوال اور ابدی رنگ میں دکھائی دیتے ہیں مسرت و شادمانی کے تمام امکانات معدوم نظر آتے ہیں اس پر طرۂ یہ بھی ہے کہ عالمِ ہجراں بھی قیامتِ صغریٰ کا مثیل ہے تصورِ یار اتنا راسخ ہو چکا ہے کہ لیل و نہار رتجگوں کی داستان بن گئے ہیں انہوں نے غمِ ذات اور غمِ جاناں کو انتہائی خوبصورتی سے ایک ساتھ نبھایا۔

داغِ دل، داغِ جگر دھو نہ سکوں گا شاید
واقفِ امن و سکوں ہو نہ سکوں گا شاید
پھر تصور میں مرے چاندسی صورت ہے وہی
آج کی رات بھی میں سو نہ سکوں گا شاید

شاعرِ مذکور کا ایک فطری اعجاز یہ بھی ہے کہ ان کا حُزن والم یاسیت امیز نہیں بلکہ ان کے ہاں لطیف احساسات کی بارہ دری بھی ہے جس سے بادِ نو بہاری کے تازہ جھونکے اقلیم قلب و خرد کو معطر و معنبر کرتے ہیں انہوں نے ایک خوشگوار شعری روایت کو پروان چڑھانے کی سعیِ بلیغ کی ہے رنج و ملال کا بیان طربیہ پیرائیہ اظہار میں انتہائی خوش آئیند ہے بقول راقم الحروف۔

غموں نے مجھ کو امر کیا ہے
مرے دروں میں ہیں داغ روشن

انہیں احساسات کا بیان شاعر صدیقی کے ہاں کچھ اس طرح پایا جاتا ہے۔

دل تو ویران ہو چکا کب کا؟
اب بھی روشن ہیں حسرتوں کے داغ
جیسے صحرا میں کھل رہے ہیں گلاب
دشت میں جیسے جل رہے ہوں چراغ

ہماری حیاتِ چند روزہ مصائب و آلام سے مربوط ہے جس کے باعث صبر و تحمل اور استقامت کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے اور ضبط مقتضیاتِ زیست کا حصہ بن چکا ہے جو دنیائے دروں میں کہرام بپا کر دیتا ہے جس کے خارجی تحرکات تو معدوم ہو جاتے ہیں لیکن داخلی اثرات قیامت خیز ہوتے ہیں اسی نسبت سے ان کا ایک قطع پیشِ نظر ہے۔

میں جنہیں پی گیا بظاہر وہ
گرم پانی کے چند قطرے تھے
آگ کیوں لگ رہی ہے سینے میں
مرے آنسو تھے وہ انگارے

مذکورہ استخراجات شاہد ہیں کہ شاعر صدیقی کا سخن ایک گنج رنج ہے جس میں کیف و سرور کی فضا بھی ہے اسلوب سہلِ ممتنع کی ردا اوڑھے ہوئے ہے مفرد و مرکب بحور میں احسن طریقے سے سخن سنجی کی ہے اُن کے کلام کے تحویہ امکانات ان کے ادبی دوام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شاہد خاکوانی.....مزاحمتی رویوں کا شاعر

بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں اور اسے مثالی بہشت کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں ان کا طرزِ فکر انقلابی نوعیت کا حامل ہوتا ہے ان کے مزاج میں سماج کے ناروا رویوں کے خلاف ایک مزاحمت کا عنصر پایا جاتا ہے وہ ترقی پسند سوچ کے آئینہ دار اور علمبردار ہوتے ہیں وہ نظامِ حکومت اور معاشرے کی ہر کج روی کے خلاف سراپا احتجاج ہوتے ہیں وہ معاشرے کی بے حسی کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں ایسی ہی شخصیات تاریخ ساز اور زمانہ ساز کہلاتی ہیں ایسی ہی طرزِ فکر رکھنے والے شعرا ترقی پسند، انقلابی یا مزاحمتی شاعر کہلاتے ہیں۔ جب ہم نے شاہد خاکوانی کے شعری مجموعہ ''ہمیں خوابوں میں رہنے دو'' کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو ان کے کلام میں اسی نوع کے جذبات و تخیلات وفور سے نظر آئے ہیں آج ہم ان کے مذکورہ شعری مجموعہ کے تناظر میں متذکرہ موضوع کی مناسبت سے ان کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار کو برائے تجزیہ زیرِ استشہاد لائیں گے۔

ملک و قوم کی زبوں حالی ہر صاحبِ فکر کے لئے باعثِ کرب بنی ہوئی ہے ہر سو ظلم و دہشت کے سائے مہیب نظر آتے ہیں یاسیت و قنوطیت نے ہماری معاشرت میں اپنی جڑیں پیوست کر لی ہیں بے حسی نے اپنی راجدھانی قائم کر لی ہے اس بھیانک صورت حال میں اربابِ فکر و دانش محوِ غور و فکر ہیں ہر سو نفرتیں اور کدورتیں ہیں اخلاقی اقدار پامال ہو چکی ہیں اس حوالے سے ان کی غزل کے تین اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

امید کی شاخیں ٹوٹ چکیں ہر آنگن میں پت جھڑ ہے
تعبیر نہیں ہے خوابوں کی ہر آنکھ میں حسرت ملتی ہے

اب گلشن میں ویرانی ہے ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے
اب جرم نہیں ہے جرم کوئی ہر جرم میں لذت ملتی ہے
احساس کے زیور سے عاری آزاد زمیں پہ پھرتے ہیں
ہر ہاتھ میں خنجر ملتا ہے ہر سوچ میں شدت ملتی ہے

شاہد خاکوانی نے دوہرے عمرانی رویوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے وہ ہر قسم کی منافقت اور کھوٹ کو ناپسند کرتے ہیں وہ معاشرے کے نام نہاد فرشتہ صفت لوگوں کے خلاف سراپا احتجاج ہیں جن لوگوں کے قول فعل میں تضاد ہے جن کا عمل سے کوئی سروکار نہیں ہے جن کا تعلق محض نعرہ بازی سے ہے انہیں اپنی طنز اور تنقید کا ہدف بناتے ہیں اسی نسبت سے ان کی ایک غزل کے چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

ظلمت کے مینار یہی ہیں اندھے گونگے بہرے لوگ
جھوٹ کے پیروکار یہی ہیں اندھے گونگے بہرے لوگ
الفت کیا ہے چاہت کیا ہے ان کو اس سے مطلب کیا؟
نفرت کا پرچار یہی ہیں اندھے گونگے بہرے لوگ
میرے دیس کے دامن پر یہ بدصورت سا دھبہ ہیں
پھولوں میں گو خار یہی ہیں اندھے گونگے بہرے لوگ

ان کے افکار اور ان کا طرزِ اظہار جداگانہ نوعیت کا حامل ہے وہ سیدھے سادے انداز میں طنز کے نشتر برساتے ہیں جو قاری کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں ان کی ایک چہار شعری غزل بدونِ تبصرہ پیشِ خدمت ہے۔

جفاؤں میں ہی پلنے والے وفا کا پرچار کیا کریں گے؟
جو لوگ ٹھہرے خدا کے منکر دعا کا پرچار کیا کریں گے؟
یہ کیسے لوگوں میں آپھنسا ہوں بتوں میں جو رب کو ڈھونڈتے ہیں؟
سماعتوں سے جو عاری ٹھہرے صدا کا پرچار کیا کریں گے؟

یہ وقت مشکل جو آگیا ہے تو پھر سے کوئی کلیم ڈھونڈو
کہ کافروں سے بھی کیا توقع خدا کا پرچار کیا کریں گے؟
تم اپنے حصے کی روشنی کو اور اپنی منزل کو خود تلاشو
یہ ظلمتوں کے سفیر شاہد ضیا کا پرچار کیا کریں گے ؟

شاہد خاکوانی کے ہاں جہاں رومانوی افکار پائے جاتے ہیں وہاں مزاحمتی رویے بھی اپنی بھرپور بہار دکھاتے نظر آتے ہیں ابھی ان کے شعری سفر کا نقطۂ آغاز ہے بہر حال ان کے کلام میں بہت سے بالیدگی کے شواہد موجود ہیں اگر ان کا شعری سفر فرط تسلسل سے جاری رہا تو مرور ایام کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں مزید نکھار آئے گا۔

☆☆☆☆☆

شاہین زیدی کے ناول

''جدا منزلیں، جدا راہیں'' کا اِنتقادی جائزہ

کسی بھی ناول کی کامیابی اس امر میں مضمر ہے کہ وہ کتنا قرینِ حقیقت ہے کیا وہ ہماری معاشرت کی عملی تصویر پیش کرتا ہے کیا اس کے کردار ہمارے سماج کے آئینہ دار ہیں کیا وہ فطری انداز میں مکالمہ کرتے ہیں کیا انہوں نے اپنی آنکھوں پر تصنع کے چشمے تو نہیں سجائے کیا وہ ہماری تہذیب و ثقافت کا ترجمان ہے کیا اس میں روحِ عصر کی ترجمانی ہوتی ہے جب ہم نے بیگم شاہین زیدی کے ناول '' جدا منزلیں، جدا راہیں'' کا مطالعہ کیا تو ہمیں جملہ امور بدرجہ اتم نظر آئے۔

ناول ھذا ایک فطری پیرائیہ اظہار کا حامل ہے جس کا پلاٹ اس کی فنی عمدگی کا مظہر ہے جذبات و احساسات میں ایک حقیقی انداز پایا جاتا ہے اگرچہ یہ ایک بیانیہ طرز کا ناول ہے مگر اس میں منظر نگاری کا جوہر بھی موجود ہے جس میں معاشرے کے محاسن و معائب کا بیان بھی ہے جس میں چھوٹی چھوٹی کئی ذیلی کہانیاں ہیں ان کے اسلوب میں سلاست و سادگی پائی جاتی ہے جس میں ایک شاندار سسپنس اور کلائمکس بھی ہے جس سے ان کے تکنیکی ادراک کا اندازہ بھی ہوتا ہے، بعد ازیں ان کے متعدد ناول اور دیگر انواع کی کتب بھی منصۂ شہود پر آچکی ہیں اس ناول سے کہانی کا بہترین فن اشکار ہوتا ہے۔

اس کے کردار معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں جو ہماری طرح ہنستے، کھیلتے، روتے، جاگتے اور باتیں کرتے نظر آتے ہیں اس ناول کے مطالعے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ

وہ عمیق عمرانی شعور رکھتی ہے جس سے ان کی سنجیدہ شخصیت کی غمازی ہوتی ہے وہ زیست کے ہر پہلو کو کافی غور وخوص کے ساتھ دیکھتی ہیں ان کے جملوں کے دروبست سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ وہ لسانی اعتبار سے ایک اعلیٰ معیار رکھتی ہیں اس ناول میں مقصدیت کا پہلو بھی کار فرما نظر آتا ہے انہوں نے ناول کی زبان زیادہ ادبی بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا اسلوب عمومی کیفیت رکھتا ہے جو ہر قسم کے تصنع اور آلائش سے مُبرا دماورا ہے ان کے ایک اقتباس میں ان کے سماجی شعور اور پیرائیہ اظہار کا رنگ دیکھتے ہیں۔

''آپ کو اچھی طرح اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ شادی بیاہ میں لوگوں کی شرکت برائے نام ہوتی ہے ان کا اصل مقصد تو اہم سیاسی شخصیات اور اعلیٰ حکام سے اپنے رُکے ہوئے کاموں یا درخواستوں پر سائن کروانا ہوتا ہے بگڑے ہوئے کام بنوانا ہوتے ہیں لوگ تو شادی کے ایسے دعوت ناموں کو حاصل کرنے کے لئے پہلے ہی سے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں کہیں کوئی وفاقی یا صوبائی وزیر شرکت کرے وہاں تو لوگوں کا ہجوم دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور یہاں تو وزیروں اور غیر ملکی باشندوں کے علاوہ خود صدر اور وزیر اعظم تک شریک تھے آپ نے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا کہ دعوت کیسی رہی''؟

قارئین کرام آپ نے دیکھا کہ ان کے ناول میں کس قدر معاشرتی معاملات کا ادراک پایا جاتا ہے ان کے ناول میں معاشرت کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں اور بھرپور طریقے سے روح عصر کی ترجمانی ہے انہوں نے سماج کی ناہمواریوں کی نشاندہی بھی کی ہے جس سے انسانی نفسیات کا عمیق ادراک اشکار ہوتا ہے شاہین زیدی کے اس ناول کی اٹھان یہ خبر دیتی ہے۔

ہزاروں جتاب کرے گی زخمی
جب اس کے خنجر میں آب ہوگی

مسلسل ریاضت سے ان کے فن میں مزید بلوغت کے اثار پیدا ہوں گے۔ بہرحال قوی امید کی جاسکی ہے کہ

اٹھیں گے پردہ ہائے بام و در آہستہ آہستہ

ہمیں یقین ہے کہ ناول کے جریدے کی یہ گائیڈ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناول کی

تکنیک پر پوری گرفت حاصل کرے گی اس کے مکالمات اور زیادہ جاندار ہو جائیں گے اس کی منظر نگاری کچھ اور نکھر جائے گی اس کے پلاٹ میں فزوں سے فزوں تر ربط کی فضا پیدا ہوگی بہر حال اس کی ناول نگاری لائق تحسین اور سراہے جانے کے قابل ہے اور ناول نگاروں کی صف میں اپنا مقام بناتی ہوئی نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

شاہد رضوان کی افسانوی فضا اور عصری رویے

کاروبارِ لوح و قلم حضرتِ انسان کو با اعتبار اور ذی وقار بنا دیتا ہے اسے وسعتِ نظر اور صلابتِ فکر میسر ہوتی ہے وہ شعر ہو یا ادب' ناول ہو یا افسانہ اپنی اپنی خاص فضا اور خصوصی رنگ کا حامل ہوتا ہے نگارش کا منفرد لب و لہجہ اور مخصوص ذائقہ ہوتا ہے جو اپنے لکھاری کے مزاج اور کیفیتِ ہنر کا عکاس ہوتا ہے آج شاہد رضوان کا افسانوی مجموعہ" پہلا آدمی" برائے تبصرہ ہمارے روبرو ہے۔ کتاب کا یہ نام دراصل ان کے دسویں افسانے کا سرنامہ ہے اس سے پہلے کہ ہم ان کے افسانوں کے حوالے سے رقمطراز ہوں مناسب ہوگا کہ ان کی کتاب میں مرقوم مختصر شذرات میں سے مشتے از خروارے ہدیۂ قارئین کرتے چلیں۔ فاضل نقاد ڈاکٹر سید شبیہ الحسن لکھتے ہیں۔

"شاہد رضوان ایک ایسے تخلیق کار ہیں جنہیں نہ تو اپنی ذات سے کوئی غرض ہے اور نہ ناقدین سے کوئی سروکار وہ تو اپنے اردگرد پھیلے ہوئے واقعات و حادثات کو کہانیوں کی شکل عطا کر دیتے ہیں جس طرح ایک کوزہ گر سادہ مٹی کو اپنے دستِ ہنر سے قابلِ توجہ کوزے کا روپ عطا کر دیتا ہے بالکل اسی طرح شاہد رضوان اپنی صناعانہ صلاحیتوں کی بدولت تمام قصے کو خاص کہانی بنا دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر قاضی عابد یوں رقمطراز ہیں:

"یہ شاہد رضوان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے ابھی تک اس کے پہلے مجموعے کے تسلسل میں ہی دیکھا جا سکتا ہے شاید وہ ابھی تک زندگی کے ان سادہ اور سادگی سے سمجھ آنے والی حقیقتوں کا ایسا اسیر ہے کہ وہ اپنی زندگی کی پیشکش کو

فنی الجھاؤں میں خود کو یا اپنی کہانیوں کو الجھانے پر مائل نہیں ہو سکا وہ زندگی کو معصومیت اور تحیر سے دیکھنے اور دکھانے کا قائل ہے۔"

نیلم احمد بشیر نے موصوف کی نسبت سے یوں خیال آرائی کی ہے:

"شاہد رضوان کا دوسرا افسانوی مجموعہ پڑھا تو دل کو ڈھارس ہوگئی کہ فن افسانہ نگاری ابھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ ثابت قدمی سے پاؤں پاؤں چل کر آگے کی طرف رواں دواں ہے اور اس کے سفر کے دوران پیش آنے والی حیرتیں ابھی تک لکھنے والوں کو اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں اور اسے آزاد نہیں ہونے دے رہیں۔"

یہاں ہم طاہرہ اقبال کی رائے سے صرفِ نظر کر کے آگے نہیں بڑھ سکتے ان کے بقول:

"شاہد رضوان جدید عہد کا پر اعتماد قلم کار ہے وہ حالاتِ حاضرہ اور آج کے جدید انسان کی گنجلک نفسیات کا بخوبی ادراک رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے بڑی برجستگی سے موکلفِ مذکور کی افسانہ نگاری پر گفتگو کی ہے۔

"کہانی کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کا کہانی پن ہے اور شاہد رضوان کے پاس کہانی کا فن موجود ہے وہ ابھی اپنے اندر چھپے فنکار کو باہر لا رہا ہے اور آخر وقت آئے گا جب وہ اس شہکار کو سامنے لے آئے گی جو کسی فنکار کی پہچان بن جاتا ہے اس کی کہانی میں دورِ حاضر کے مسائل اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔"

ہم نے شاہد رضوان کے افسانوں مجموعہ "پہلا آدمی" مطبوعہ 2013ء کے ابتدائی چار افسانوں کا تفصیلی مطالعہ کیا دراصل کتابِ ھذا چودہ افسانوں پر مشتمل ہے جن میں چار افسانے مزدور، زندگی، خواب گاہ اور سائیں جی برائے تنقید و تبصرہ زیرِ مطالعہ لائے گئے ہیں ہم نے محسوس کیا ہے کہ یہ چار افسانے زندگی کے بہت قریب ہیں حقیقت کے باعث ایک خاص دلچسپی کے حامل ہیں۔

افسانہ "مزدور" ایک امیر خاندان کی خاتون کی ذہنی کیفیات کا عکاس ہے جس کا شوہر امریکہ گیا ہوا ہے اور رفتہ رفتہ بیوی سے لاتعلق سا ہو گیا ہے البتہ معقول مقدار میں رقم ہر ماہ بھیج

دیتا ہے جس سے دو افراد پر مشتمل گھرانہ بڑے آرام سے چل رہا ہے دوسرا فرد اس خاتون کی بوڑھی ساس ہے جس کی خدمت کے لئے اسے رہنا پڑ رہا ہے وہ سوچتی ہے کہ اس کا شوہر تو گوریوں میں گل چھرے اُڑا رہا ہے جبکہ وہ روکھی پھیکی اور غیر جنسی زندگی گزارنے پر مجبور ہے چنانچہ ایک دن وہ نفس اور شیطان کے اغواء میں آجاتی ہے ساس کو نند کے گھر چھوڑ کر اور مزدور چوک سے ایک ہٹا کٹا مزدور کار پر ساتھ لے آئی اور اسے موقع پر کیاری کو گوڈی کرنے اور پانی دینے کا کام بتاتی ہے مگر جب وہ اس کے گھر آتا ہے تو ایسی کوئی کیاری نظر نہیں آئی وہ حیرت سے استفسار کرتا ہے تو اسے خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ مزدوری دو سو کی بجائے چار سو روپے ملے گی شرط یہ ہے کہ بھرپور طریقے سے گوڈی کی جائے اور پانی دیا جائے کیاری کہاں ہے جواب میں کمرے کے اندر کی طرف اشارہ کر دیتی ہے یوں افسانے کا اختتام ہیجان انگیز بن جاتا ہے اور انسان کافی دیر تک سوچتا رہ جاتا ہے کہ زندگی میں ایسے موڑ بھی آجاتے ہیں اس موقع پر سعادت حسن منٹو کے قابلِ اعتراض افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

دوسرا افسانہ "زندگی" کا ایک آسودہ حال خاندان کی شادی شدہ عورت کا ہے جو ایک متوسط درجے کے گھر میں بیاہی گئی ہے اور اسے شکایت ہے کہ اس کا شوہر ماں، بہنوں کا زیادہ خیال رکھتا ہے اور جو وعدے وعید یونیورسٹی کے زمانے میں شادی سے پہلے کیے گئے تھے وہ سب نظر انداز کر دیئے گئے ہیں وہ اس طرح زندگی برباد نہیں کر سکتی چنانچہ وہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اس سے تو بہتر ہے کہ اپنے میکے گھر جا کر رہا جائے چنانچہ وہ شوہر سے کہتی ہے کہ وہ اسے میکے چھوڑ آئے نہیں تو وہ خود چلی جائے گی کیونکہ اب مزید وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی شوہر سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہتر مستقبل کی بشارت دیتا ہے۔ منت سماجت کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیتا ہے مگر اس ظالم حسینہ کو ترس نہیں آتا اور وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی وہ ماں اور بہنوں کو صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتی ہیں اور طعن و تشنیع سے کام لیتی ہیں وہ بیوی کو خود چھوڑنے روانہ ہو جاتا ہے راستہ میں ایک ورکشاپ آجاتی ہے جس میں گاڑی کا معائنہ کرانے کے لیے کچھ دیر انہیں رکنا پڑتا ہے وہاں قریب ہی زندگی کے چند حقائق وہ خاتون مشاہدہ کرتی ہے مثلاً کوڑے کرکٹ سے کباڑ اکٹھا کرنے والا

بھوکا نوجوان جو کوڑے پر گرنے والی ایک ایسی روٹی جس میں دال پڑا ہوتا ہے خوشی سے کھا جاتا ہے اس طرح ایک بوڑھا جو اس میں پڑے ہوئے بال کی وجہ سے روٹی ادھوری چھوڑ دیتا ہے اور بہو سے برہمی کا اظہار کرتا ہے زندگی کی کٹھنائیوں اور تلخ حقیقتوں کو اتنا قریب سے دیکھ کر اسے اپنے رویے پر ندامت ہوتی ہے اور پھر وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے شوہر کو اپنے گھر واپس جانے کی ہدایت جاری کر دیتی ہے۔

تیسرا افسانہ ''خواب گاہ'' ایک ریٹائرڈ جج کی کہانی ہے جس نے بڑی بے دردی سے قانون اور انصاف کی دھجیاں بکھیریں اور ناجائز کمائی کی انتہا کر دی اسے اچانک ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں دراصل یہ ردِ عمل ہے ان زیادتیوں کا جو نا انصافیوں کی صورت میں پیسے کے لالچ میں اس نے لوگوں کے ساتھ کیں وہ اس صورتِ حال سے نجات پانے کے لئے چلہ کشی کی راہ اختیار کرتا ہے پہلے تو مارے خوف کے اسے چھوڑ بیٹھتا ہے پھر دوست کے ڈھارس بندھانے پر چلہ کاٹتا ہے اور اس میں کامیاب ہونے کے بعد ایک بزرگ کی زیارت ہوتی ہے جو اسے بتاتا ہے کہ میں نے چشمِ بصیرت سے دیکھا ہے کہ تمہاری صورتیں مسلسل بدلتی رہتی ہیں کبھی بلی، کبھی کتا، کبھی بندر، کبھی سانپ اور کبھی بچھو یوں اسے منصف کے لبادے میں کئے جانے والے مظالم کا انجامِ بد کا عکس دکھائی دیتا ہے اس افسانے سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ دنیا مکافاتِ عمل ہے انسان کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا دنیا میں بھی ملتی ہے۔

چوتھا افسانہ ''سائیں جی'' ایک بچے کی غفلت اور نہ بتا کر گھر سے باہر جانے کی صورت میں اس کے والدین کی پریشانی اور پھر والدین کے اولاد کی محبت میں نقلی پیروں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی کی کہانی ہے بچہ تو تیسرے روز واپس آ جاتا ہے لیکن نقلی سائیں جی بستی کی ایک خوبصورت لڑکی سمیت تین لاکھ تاوان کے لے کر فرار ہو جاتا ہے یوں دو گھرانے توہم پرستی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

شاہد رضوان کے ان افسانوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ عمدہ افسانہ لکھنے کا ہنر جانتے ہیں جو زندگی کے بہت قریب ہوتا ہے ان کا افسانہ تلخیِ حیات کا آئینہ دار ہے زیست کی کٹھنائیوں اور نشیب و فراز کا بہ خوبی احاطہ کرتا ہے کردار بڑے جاندار اور جیتے جاگتے ہوئے نظر

آتے ہیں۔ منظر نگاری پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ جزئیات نویسی ان کے فن کا خاصہ ہے مکالمات بڑے دلکش اور چبھتے ہوئے ہوتے ہیں کہانی کا تانا بانا بڑی چابکدستی سے بنتے ہیں بین السطور کہیں خلا کا احساس نہیں ہوتا وہ اپنے افسانوں سے سبق آموزی کا کام بھی لیتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ ان کے افسانے ادب برائے زندگی کے پلڑے میں آتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا انہیں ان کے اس افسانوں مجموعے کی عمدگی پر داد تحسین پیش کرتے ہیں اور ان سے اس سفر کے جاری رکھنے کی امید بھی کرتے ہیں۔

صابر ظفر کے صوفیانہ ادراکات

خالقِ موجودات و معدومات کی خلاقیت کا اعجاز و امتیاز یہ ہے کہ اس کے دستِ قدرت و ندرت نے اپنی ہر تخلیق کو نادر النظیر خلق فرمایا اور گوناں گوں ہیئتیں اور صورتیں ودیعت فرمائیں اپنے ہر ذی روح کو مختلف طباع سے نوازا جس سے مشیت کی نیرنگیٔ فکر کی غمازی ہوتی ہے جس طبع کو اس حی و یا قیوم ذات نے اپنے زیادہ قریب تر کرنا چاہا اسے صوفیانہ طرزِ فکر و عمل سے آشنا کر دیا انہیں صوفیانہ طباع میں ایک نام صابر ظفر کا بھی ہے جس کا سخن صوفیانہ ادراکات سے منور و مزین اور معطر و معنبر ہے اس وقت ہمارے پیشِ نظر ان کی طویل ترین غزل کا مجموعہ 'سرِ بازار می رقصم'' مطبوعہ مارچ 2013ء ہے جس سے ان کی عمیق صوفیانہ اور سماجی شعور کی غمازی ہوتی ہے ان کا تصوف اپنے اندر ایک وجد و حال کی کیفیت رکھتا ہے انھیں مذکورہ غزل اور کتاب کی تحریک شیخ عثمان مروندی المعروف شہباز قلندر کی فارسی غزل سے ملی کتاب ھذا کا سرنامہ جو اس غزل کی ردیف بھی ہے شیخ عثمان مروندی کی فارسی غزل سے منسوب ہے جہاں تک شاعرِ ممدوح کے ادبی تعارف کا تعلق ہے تو ابھی تک ان کے تین شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں علاوہ ازیں چھ شعری انتخاب بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں اتنا کثیر ادبی سرمایہ قارئینِ شعر و ادب کو بہم پہنچانا بھی کارِ فرہاد سے کم نہیں جہاں تک ان کے سوانحی کوائف کا معاملہ ہے تو اس حوالے سے کتاب ھذا کے اوراق خالی ہیں ہم ان کے متذکرہ شعری مجموعہ سے چند منتخب اشعار برائے صراحت و تجزیہ شاملِ شذرہ کرتے ہیں ویسے تو ان کی یہ بسیط غزل سراپا انتخاب ہے۔

وہ بزمِ جہاں کو نگاہِ عشق و تحیر سے دیکھتے ہیں اور مظاہرِ فطرت کو بھی ہمنوا پاتے ہیں جن

میں زمین و فلک اور سیارگان بھی شامل ہیں ان کے نقطۂ نگاہ کا کمال یہ ہے کہ وہ سنسار کی ہر شئے کو چشمِ تصوف سے دیکھتے ہیں جس کے باعث آنہیں کائنات محوِ رقص اور وجد و حال کے عالم میں دکھائی دیتی ہے وہ تصوف کو ہی مقصدِ حیات گردانتے ہیں ان کے نزدیک ایک سالک ہی اپنے معبود کا عبدِ حقیقی ہے انہیں افکار کی پاسداری میں ان کی غزل کے تین اوّلین اشعار ملاحظہ ہوں ۔

سرِ بزمِ تحیّر رو بروئے یاری رقصم
دفورِ عشق سے امشب ستارہ واری رقصم
زمیں ہے اور میں رقصاں برنگِ گردش کوزہ
فلک ہے اور مثالِ گردشِ سیاری رقصم
مری قیمت وصولی جارہی ہے مجھ کو نچوا کر
نہیں جب تک بکھرتے میرے تن کے تاری رقصم

اُن کی قوتِ متخیلہ کا کلیدی حوالہ رقص ہے جو بیک وقت وجدانی اور جنونی کیفیت کا حامل ہے جس میں عرفان و آگہی بھی ہے اور کیف و سرمستی بھی ہے وہ صوفیانہ نظریہ ہمہ ازاوست کے شدت وحدت سے قائل ہیں اس لئے انہیں تمام تخلیقات میں خالقِ حقیقی کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے چاہے وہ گل و گلزار ہوں یا خزاں کے آثار ہوں ان کا تعلق اس ذاتِ کبریا سے مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار رہتا ہے ان کے ہاں عمرانی زندگی کا شعور بھی تصوف کے پیرائے میں ملتا ہے ۔

دوبارہ شاخِ دل پر درد کے پتے نکل آئے
بُھلا دیتا ہوں یہ رنگ خزاں آثار می رقصم
کبھی چھت سے کبھی زینے سے مجھ کو جھپ کے تکتا ہے
وہ جس کے عشق میں پہروں پسِ دیوار می رقصم
جب اس سے انگ لاگا ہے تو مجھ کو رنگ لاگا ہے
وہ میرے سنگ جاگا ہے جو خوشبودار می رقصم

شگوفے پھوٹتے دوشیزگی کے جب نظر آئیں
میں ہو جاتا ہوں اک وحشت سے تازہ کاری رقصم

انہوں نے اپنی طویل ترین غزل جوان کی عمیق شعری ریاضت کا ثمر بھی ہے جہاں غزل سے والہانہ محبت کا اظہار ہے وہاں حقیقی زندگی کی عملی تصویر تصوف آمیز نقطۂ نظر سے پیش کی ہے اگر چہ یہ بھی ایک بین حقیقت ہے مُلائیت سے ان کی دور دراز کی نسبت نہیں ہے انہوں نے بین السطور تفہیم کے عمل کو سہل تر بنانے کے لئے انتہائی عمدگی سے شعری تمثیلات بھی بیان کی ہیں تصوف کے قلزم بیکراں کی غواصی میں مصروف و منہمک نظر آتے ہیں وہ فطری معجزات کو بھی عندالبیان لاتے ہیں۔

کسی خطبے سے ہرگز واسطہ میرا نہیں کوئی
سر منبر برنگِ شعلۂ بیداری رقصم
پیالے کی طرح اُس کا بدن ہے میرے ہاتھوں میں
بہت مخمور می رقصم کہ بوسہ داری می رقصم
پہنچ کر سلسبیل و کوثر و تسنیم کے رُخ پر
نوختی تشنگی سے برسر پیکاری رقصم
دوبارہ زندگی ملنے پہ دیکھو سرخوشی میری
میں اپنے قتل پر تو صورتِ اغیاری رقصم

وہ اپنی بے خودی اور سرشاری کو اپنے محبوب حقیقی سے منسوب کرتے ہیں اور اسے اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب تر پاتے ہیں ان کے تخیلات میں افکار کے جاودانی و امکانی پہلو مثلِ مشعلِ فروزاں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنے مرشد کا نابینا مجاور قرار دیتے ہیں جو درشن کی سوغات سے یکسر محروم ہے۔

سبب جن کی ہے سرشاری انھی کے سامنے رقصاں
مثالِ بوئے گل، پیشِ گل و گلزاری رقصم

میں ایسا ہوں کہ وہ مجھ سے کبھی غافل نہیں رہتا
تو کیسا ہے؟ وہ جب کرتا ہے استفساری رقصم
کچھ ایسی جاودانہ تازگی اور لہلہاہٹ ہے
بہار گل رُخاں میں صورتِ اشجاری رقصم
سرِ درگاہ نابینا مجاور کی طرح ہوں میں
کہیں ممکن کہ مرشد کا کروں دیداری رقصم

الغرض بحر حزج مثمن سالم میں صابر ظفر کی کہی گئی یہ غزل جو چار سو اشعار پر مشتمل ہے نظریاتی اور فکری اعتبار سے تصوف کا ایک بیش بہا مخزن ہے سالکینِ تصوف کے لئے کتابِ ھذا جادۂ منزل بھی ہے اور ایک سوغات کا درجہ رکھتی ہے جس میں رقص و سرور بھی ہے کیف و مستی بھی ہے اور منازلِ عرفان و آگہی بھی ہیں جس میں حقیقی زندگی پوری آب و تاب سے سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون.....
دوہا نگاری کا سنگِ میل

میں نے جب دوہے کا نام سنا تھا تو ساتھ ہی ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کا اسمِ گرامی بھی سماعت کیا تھا گویا موصوف اور دوہا ایک دوسرے کی پہچان قرار پائے ہیں انھوں نے گلشنِ سخن کی آبیاری میں پچالیس سال کا خطیر عرصہ صرف کیا لیکن دوہا نگاری کی طرح 2001ء کو مائل ہوئے ڈاکٹر طاہر سعید ہارون سے قبل اس صنفِ سخن میں امیر خسرو' بھگت کبیر' گرونانک' عبدالرحیم خان' خاناں' میرا بائی' بہاری داس' متی رام' سید غلام نبی' خواجہ دل محمد' جمیل الدین عالی' عرش صدیقی اور الیاس عشقی وغیرہ حوالے کا درج حاصل کر چکے تھے ڈاکٹر طاہر سید ہارون نے فرطِ تسلسل سے دوہا کی خدمت اور ریاضت کی جدید دوہا نگاری کے تناظر میں ان کا کام اور نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے ان کی دوہا نگاری کے حوالے سے لکھنے کے لئے تو دفتروں کے دفتر درکار ہیں ایک شذرے کے مختصر پیمانے میں جو کچھ لکھا جائے گا وہ ایک مختصر تاثر کہلانے کا استحقاق ہی پائے گا ان کے حوالے سے بہت کچھ کام کیا جاچکا ہے لیکن جتنا کئے جانے کی ضرورت ہے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے اس حوالے سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ثمینہ علیم کی مساعی قابلِ ذکر ہیں اول الذکر نے اپنی کتاب "ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری" مطبوعہ 2006ء جوتی دہلی سے ایم آر آفیسٹ پرنٹرز نے شائع کی میں چالیس سے زائد مقالات آپ کی دوہا نگاری کے حوالے سے ہیں آپ کی فکری وفنی جہتوں کو اجاگر کرنے کی سعی بلیغ کی ہے جس سے آپ کی تخلیقیت کی سطح اُجاگر ہوئی ہے علاوہ ازیں گیارہ معتبر اربابِ نقد و

شبیر ناقد

نظر کے تاثرات بھی مذکورہ کتاب کا حصہ ہیں مقالہ جات سے قبل آپ کے انٹرویو نے اس کتاب کو زینت بخشی گئی ہے ثمینہ علیم کا ایم فل مقالہ بعنوان ''ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری'' مطبوعہ 2002ء ماورا پبلشر لاہور میں بھی ان کی دوہا نگاری کے حوالے سے بنیادی مباحث بیان کئے ہیں جن میں اس صنفِ سخن کے حوالے سے لسانیاتی' عروضی اور ہیتی تناظر میں مواد فراہم کیا گیا ہے اور دوہے کے پس منظر اور ارتقائی سفر کو اجمالی اظہار کا روپ بخشا ہے حالاتِ زندگی کی معیت میں ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے فن کو بحیثیت شاعر اور دوہا نگار پیش کیا گیا ہے خالص تحقیقی انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے محاکمیات اور کتابیات کے شعبہ جات بھی قائم کئے گئے ہیں کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر محمد کامران نے ایک منفرد دوہا نگار کے سرنامے کے تحت لکھا ہے۔

پاکستانی دوہا نگاروں میں جلال مرزا خانقانی افضل پرویز' قتیل شفائی' الطاف پرویز' جمیل عظیم آبادی سید قدرت نقوی' ڈاکٹر وحید قریشی' بشیر منذر' عرش صدیقی' عبدالعزیز خالد' رشید قیصرانی' تاج سعید اور ڈاکٹر طاہر سعید ہارون وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں تادمِ تحریر ان کے دوہوں کی تعداد گیارہ ہزار سے بھی تجاوز کر چکی ہے یہ اعجاز و اعزاز کسی افتخار سے کم نہیں ہے ان کے دوہوں میں سے سات ہزار دوہا چھند اور مزید براں چار ہزار سرسی چند میں ہیں دوہا چھند سے مراد دوہے کی قدیمی بحر ہے جس کے ارکان کی ترتیب و تعدد کچھ یوں ہے جس کا وزن فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فاع ہے اور کل چھ ارکان ہیں جن کا تعددی وزن جسے وزن کا جدید طریقہ گردانا جاتا ہے چوبیس ماترے ہے سرسی چھند جس کا پہلا نام عالی چال ہے جس کی عروضی اعتبار سے ارکان کی ترتیب و تعداد کچھ یوں ہے جس کا وزن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع ہے ارکان کی تعداد سات تعددی وزن کے اعتبار سے ستائیس ماتروں پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے بلحاظ عروض دونوں بحور دوہا چھند اور سرسی چھند میں انتہائی خوش اسلوبی سے دوہا نگاری کی ہے اور اپنی فنی چابکدستی کے جوہر دکھائے ہیں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے دوہا مورثی' لسانی اور ہیتی اعتبار سے خالصتاً ہندی صنفِ سخن ہے اسی ہندی اثر سے آزاد کرانے کا آغاز جمیل الدین عالی کی بابت کافی عرصہ قبل

ہوگیا تھا ڈاکٹر طاہر ہارون سعید نے اپنے دیگر معاصرین میں اسے روایت کی حیثیت بخشی یوں اردو دوہا نگاری کا ارتقا سہل سے سہل تر ہوگیا بندی لفظیات کا بوجھ ہلکا ہوگیا ان کی شعوری اور لاشعوری کاوشوں کے طفیل دوہے میں فارسی اور عربی لفظیات کا چلن بھی نمو پاش ہوا ہے ان کی کشید جاں کی بدولت اب اردو دوہا بصد افتخار سر اٹھا کے جینے کے قابل ہوگیا اور ایک مضبوط روایت کا حامل ہوگیا ہے۔

کسی بھی تخلیق کار کے حوالے سے کسی ناقدِ واحد کی رائے اس کے مقام و مرتبے کے تعین کے حوالے سے مستند و معتبر نہیں ہوتی اس کی قدر و منزلت کے ادراک کے لئے ایک استخراجی اور اجتماعی تاثر کا قائم کرنا انتہائی ناگزیر ہے ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری کے حوالے سے جلیل القدر ناقدین کی آرا حسب ذیل ہیں۔

''طاہر سعید ہارون نے لفظوں کے انتخاب میں منصوبہ بندی نہیں کی بلکہ چناؤ کو وہبی عمل کے تابع کیا ہے جس سے ان کی زبان میں تازگی اور تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے دوہے کی ہر لائن میں ''بسرام'' کا اہتمام کرے مگر اس خوبصورتی کے ساتھ لائن کی **دو لختگی** کا احساس تک نہ ہو۔ طاہر سعید ہارون اس معاملے میں بے حد کامیاب ہیں کہ ان کے دوہوں میں ایک انوکھا صوتی بہاؤ ہے جو قاری کو بہالے جاتا ہے۔''

(وزیر آغا بحوالہ کتاب طاہر سعد ہارون کی دوہا نگاری ڈاکٹر عاشق ہرگانوی)

''طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری میں مجھے تخلیقی کیفیت کی مسحور کن روانی نظر آئی ہے وہ جذبے کی رواں لہر میں ہمہ تن شرابور نظر آتے ہیں تو ان کے دوہے کیف مسلسل کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔''

(انور سدید بحوالہ کتاب طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

''ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے دوہے کی صنف کو اتنی سنجیدگی اور اتنے فنی ریاض کے ساتھ اپنایا ہے کہ جدید دور میں ان کے بغیر دوہے کا تصور محال ہے۔''

(ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بحوالہ کتاب از ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

''بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں وہ سب کچھ ہے جو آج کا قاری پرکھنا چاہتا ہے اس میں حیات و ممات کے مسائل بھی ہیں اردگرد کا ماحول بھی اور اخلاقیات کا درس بھی مجھے

قوی یقین ہے کہ دوہے کی صنف میں ڈاکٹر صاحب کا نام ایک اہم نام کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

(ڈاکٹر انعام الحق جاوید بحوالہ کتاب ڈاکٹر عاشق ہرگانوی)

"آپ نے پر اثر دوہے کہے ہیں اور اس روایت میں سنجیدگی سے کوشش کی ہے اور اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔"

(ڈاکٹر جمیل جالبی بحوالہ کتاب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

"ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے دوہوں میں اپنے عہد کے مزاج کو برقرار رکھا اور ہندی شعروں کی کوملتا اور مٹھاس سے اپنے قاری کو متعارف کروایا ہے لیکن انہوں نے ہندی تہذیب وتمدن کو اپنے دوہوں پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ ثقالت اور غرابت کے عیب سے مبرا ان کے دوہے ہندی کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی تہذیب کو ہمراہ لئے چلتے ہیں۔"

(ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری از ثمینہ علیم مطبوعہ 2012)

مذکورہ ناقدین نے اپنے احاطۂ ادراک کے مطابق ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری کے فکر وفن کے حوالے سے مختلف النوع آرا پیش کی ہیں جس سے ان کے فکری وفنی کینوس کا یقین آسان سے آسان تر ہو گیا ہے تادم تحریر دوہا نگاری کے حوالے سے ان کے گیارہ مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں اور ارباب نقد و دانش سے خراج داد و تحسین پانے میں بھرپور انداز میں کامیاب ہو چکے ہیں جنہیں قارئین شعر و سخن نے بے حد سراہا ہے جس کی وجہ سے ان کا حلقۂ قارئین بن چکا ہے اس سے بڑھ کر کامیابی کی اور کیا نوید و سعید ہو سکتی ہے۔

ابتداء میں دوہا صرف بحر دوہا چھند میں ہی لکھا گیا بعد میں جمیل الدین عالی کی اختراع کی بدولت عروضی تغیر رونما ہوا انہوں نے اس کا ایک اور وزن متعارف کرایا جسے عالی چال اور بعد ازیں اس بحر کو سری چھند کا نام دیا گیا ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے دونوں اوزان میں بطریق احسن سخن سنجی کی اور لسانیاتی و تہذیبی اعتبار سے اسے صرف ہندی کے زیر اثر نہیں رہنے دیا جس کی وجہ سے دوہے کے فکری وفنی کینوس میں بے بہا اضافہ ہوا روایتی دوہا جو بحر دوہا چھند میں لکھا گیا کافی عرصہ تک لکھا جاتا رہا اب بھی پاک بھارت میں دوہا نگاروں کی کثیر تعداد اسی انداز

میں طبع آزمائی کر رہی ہے اولاً دوہے بلا عنوان لکھے گئے باضابطہ طور پر کسی سرنامے کے تحت لکھے جانے کا آغاز بہت بعد میں ہوا دوہے کے تمام قدماء نے اس کے ساتھ کسی موضوع کا باضابطہ اہتمام نہیں کیا جس کے باعث دوہے کے موضوعاتی ارتقا کو فروغ میسر نہیں ہو سکا لیکن ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے دوہے کو باقاعدہ عنوانات کے تحت لکھا اور یوں دوہے کا نفسیاتی روپ سامنے آیا اللہ کے فضل و کرم سے اب دوہا بحیثیت نظم زندہ رہنے کی پوری استعداد رکھتا ہے ڈاکٹر صاحب کے تمام مجموعوں میں دوہا عنوانات کی معیت میں اپنی پوری آن بان سے تاباں و فروزاں ہے دوہے کی یہ فرخندہ نصیبی بھی آپ کی مرہون منت ہے اب دوہا اپنے آپ کو نفسیاتی ہیت کے طور پر منوانے کی بھرپور اہلیت رکھتا ہے جس سے مجموعی طور پر دوہے اور ڈاکٹر صاحب کے موضوعاتی کینوس کا مشاہدہ اور تجزیہ انتہائی آسان ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے دوہوں کے مجموعوں کے مذکور کے بغیر ان کی دوہا نگاری کے حوالے سے بات کوئی جامع حیثیت نہیں رکھتی ان کے دوہوں کے مجموعوں کے نام بمع سن طباعت حسب ذیل ہیں۔

1۔	من موج	2001ء
2۔	نیلا چندر ماں	2003ء
3۔	پریت ساگر	2004ء
4۔	من مانی	2005ء
5۔	میگھ ملہار	2007ء
6۔	بھنور نگر	2008ء
7۔	پریم رس	2009ء
8۔	کوک	2010ء
9۔	من دیپک	2011ء
10۔	نیناں درپن	2011ء
11۔	روپ کرن	2012ء

محققین کے مطابق دوہے نے ہندی تہذیب کی آغوش میں آنکھ کھولی اس لئے یہ اسی تہذیب رچاؤ کا حامل بھی ہے جسے ڈاکٹر سعید ہارون کے اسلوبیاتی اظہار اور زبان و بیان سے بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا جو ان کی فکری اُپج اور ذہنی کینوس کا غماز بھی ہے اس لئے ان کے ہاں ہندی لفظیات کا چلن عام ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے شاعر ممدوح کسی لسانی تعصب کا شکار ہیں عربی و فارسی کے الفاظ کی قرینہ کاری بھی دیدنی ہے لیکن لسانیاتی اعتبار سے ہندی بھاشا کی کو ملتا اور سندرتا نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے اس لئے ان کے مجموعوں کے تمام نام ہندی نوعیت کے ہیں جس کے باعث ان کے شبدوں کی اثر افرینی دو چند ہوئی ہے اور قاری ایک سحر خیز کیفیت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری کے حوالے سے تجزیہ و محاکمہ اور استخرابی نتائج کے حصول کے لئے انتہائی ناگزیر ہے کہ ان کے منتخب دوہوں کو تجزیات و تصریحات سے پیش کیا جائے ان کی فکری وفنی حیثیت کو اجاگر کیا جائے اس لئے ضروری سمجھتے ہوئے ان کے آخری مجموعہ ''روپ کرن'' کے نصف اول کے منتخب دوہے شامل شذرہ ہیں۔

حمد کے زیر عنوان دیئے گئے ان کے چار دوہے طالب توجہ ہیں۔

مولا تیرے نور سے روشن ہے سنسار
جلوہ تیرا دیکھتا سمٹا ہے ہے اندھیار

سب دنیا حیران ہے کر دیکھی تحقیق
اک قطرہ سے تو کرے جیون کی تخلیق

اللہ تیرے ہاتھ ہے میری جیون ڈور
جب تو چاہے کھینچ لے مجھ کو اپنی اور

اس کو منزل مل گئی جس کا تو آدھار
اتم تیری رحمتیں اتم تیرا پیار

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے تخیلاتی کینوس میں عارفانہ شواہد بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں سنسار کے ذرے ذرے میں انہیں فطرت ضوفشانی کرتی نظر آتی ہے اور تیرگی کی بساط لپٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس کے باعث عالم محوِ تحیر ہے حیرت و استعجاب کی ایک فضا ہے جو چاروں اور سایہ فگن ہے معجزاتِ قدرت کا بیان ان کے تخلیقی وفور کا حصہ ہے افرینشِ بنی نوع انسان بھی ورطۂ حیرت سے ہم کنار کرنے والا معجزہ ہے حیات و ممات کے سب فیصلے بھی دست قدرت میں ہیں اور وہی سب کا معتبر و دائمی سہارا ہے بقول راقم الحروف

سہارے یہ سب عارضی سے ہیں ناقد
سہارا ہے اک ان سہاروں سے آگے

اس کی رحمت کاملہ بے مثل و باکمال ہے اس کا پیار لابدی ہے ممتا کی محبت سے بھی ستر گنا بڑھ کر ہے اس کی چاہت اور الفت بسیط ہے۔

ان کے تین نعتیہ دوہے جو عرفانِ نبی ختمی المرتبت سے سرشار ہیں نذرِ قارئین ہیں۔

لات و عزیٰ سرنگوں دوئی ہوئی بے نام
جگ کو بخشا آپ نے وحدت کا پیغام

جب سے میرے سائیاں دل میں تو آباد
بدلی میری زندگی رہتا ہوں دل شاد

چرچا ہے آکاس پر جگ میں تو محمود
اک نعت سے کم نہیں آقا ترا درود

دوہا اوّل میں انقلابِ اسلام کی مکمل داستاں سمودی ہے فیضانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثرات و معجزات کا دستاویزی نوعیت کا اظہار ہے دوہا دوم حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکات و فیوض کا بیانِ عالی شان ہے مسرت و تمکنت اور شادمانی کا بھرپور حوالہ ہے تیسرے دوہے میں کائناتی حوالے سے مدحت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذکور ہے۔

مذہبی حوالے سے ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے

مختلف آیاتِ قرآنی کے مفاہیم و مطالب کو اپنے دوہوں کے روپ میں پیش کیا ہے سورۂ الانفطار کی آیات 1 تا 5 دوہا کے رنگ میں ملاحظہ کریں۔

پھٹ جائے گا آسماں تارے بکھریں دور
ساگر جب بہہ جائیں گے کھولیں راز قبور
اس لمحے ہر آدمی جانے اپنا حال
پہلے اس نے کیا کیا پیچھے کیے اعمال

سورۂ العلق کی آیات 1 تا 4 دیکھیے

پڑھیے رب کے نام سے پیدا جو فرمائے
وہ جو جمتے خوں سے آدم ذات بنائے
پڑھیے رب کے نام سے جو ہے بڑا کریم
خامہ سے انسان کو دیتا ہے تعلیم

قران مجید و فرقانِ حمید کی ایات کریمہ کو منظوم کرنا خاصا دقت طلب کام ہے اور عمیق احتیاط کا متقاضی ہے کیونکہ یہ بہت بڑا نازک معاملہ ہوتا ہے تھوڑی سی لغزش سے شاعر کی دنیا و عقبیٰ اکارت ہوسکتی ہے یہ انتہائی فنی چابکدستی کا معاملہ ہوتا ہے جسے ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے کمال فن سے پیش کیا ہے اور کہیں بھی اصل متن سے نہ ہٹنے کی نوبت آئی نہ کسی قسم کا اضافہ روا ہوا ہے ہر قسم کی افراط و تفریط سے اپنا دامن بخوبی بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں جس کی مثال بہت ہی کم سخنوران کے ہاں ملتی ہے۔

شاعرِ موصوف کا مزاج خالصتاً مذہبی رنگ ڈھنگ میں ڈھلا ہوا ہے اسلام کے الطاف و اکرام کی ضو پاشیاں ان کی نظم ''اسلام کی دین'' کے چار دوہوں میں دیدنی ہیں۔

بھائی چارے کا سبق دیتا ہے اسلام
سارے ایک قطار میں آقا اور غلام
بن دیپک ایمان کا روں روں اجلا نور
نیناں نیناں چاندی سندرتا کے بھور

منزل کی پہچان دی راہیں کی آسان
سیدھا راستہ پا گیا گم گشتہ انسان

ٹوٹے رشتے جوڑنا رحمت کا پیغام
انسانوں سے پیار کا داعی ہے اسلام

مذہب وملت کی محبت کے ساتھ ساتھ مادر گیتی سے الفت وموانست بھی ایک پوتر جذبہ ہے ان کے دو ہے اسی احساس کی پاسداری کرتے ہیں

مجھ کو تجھ پر مان ہے تجھ سے میری آن
تو میرا آدھار ہے میرے پاکستان

سندر تیری ناریاں گھبرو ترے جوان
کومل بالے بالیاں میرے پاکستان

تیری دھرتی باجرا گیہوں مکا دھان
کیسی کیسی نعمت میرے پاکستان؟

ان کے احساس کی چاشنی وشیرینی سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک دیش بھگت ہیں اور دیش بھگتی ہونے پر فاخر وناز اں بھی ہیں مذکورہ دوہوں میں پاک دھرتی کا لفظی نقشہ پیش کیا ہے۔ جس کی تصویر صاف وشفاف نظر آتی ہے۔

دیگر سنجیدہ موضوعات کے علاوہ انہوں نے زبردست رومان پروری بھی کی ہے رومانویت کی ایک بھرپور لہر ان کے ہاں مشاہدہ کی جاسکتی ہے ایک پریم ساگر ہے جس میں غواصی کے بعد ایک خوشگوار اور لطیف کیفیت محسوس ہوتی ہے اس حوالے سے ان کی نظم ''پربت'' کے تین دوہے پیش خدمت ہیں۔

روں روں میرے واسنا چاروں اور بہار
ناری تیرے پیار سے جیون ہے سرشار

کب آئے پھر لوٹ کر سپنے جیسی رات؟
مجھ سے کہہ دے سندری اپنے من کی بات

تیری خوشبو چار سو چندن ترا وجود
جاؤں میں جس اور بھی نازی تو موجود

مذکورہ استخراجات ان کی دوہا نگاری کے حوالے سے عکسِ خفیف کا درجہ رکھتی ہیں انہوں نے دوہے کے میدان میں ایک دستاویزی نوعیت کا کام کیا ہے جو قابلِ ستائش اور نا قابلِ فراموش ہے ان کے دوہوں میں ہندی تہذیب کا رچاؤ غالب ہے جس کی جاذبیت واضح طور محسوس کی جاسکتی ہے جس کے باعث مقبولیت و دلپذیری کے اسباب روشن ہوئے ہیں وہ دوہا نگاری میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں ربِ ادب سے استدعا ہے کہ ان کے فکری و فنی کارناموں کو دولتِ دوام سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر طاہرہ سرور.....
ایک معتبر عصری تحقیقی حوالہ

یہ زمانہ ایک معمل ہے اس کارخانے میں کارہائے گوناگوں انجام پاتے رہتے ہیں ان کاموں میں ادبی نوعیت کے اعمال بھی اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں جنہیں ہم دو زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں زمرۂ اوّل میں تخلیقی نوعیت کے افعال آتے ہیں اور زمرہ ثانی میں تالیفی انداز شامل ہے جو تحقیق و تنقید سے بھی متضمن ہے۔

آج ہمارے زیرِ نظر ڈاکٹر طاہرہ سرور کی اسی نوعیت کی نگارشات ہیں جو تالیف و تنقید کی ذیل میں آتی ہیں موصوفہ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی میں بطور چیئرمین شعبۂ اُردو خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور اس حوالے سے عمیق تجربہ رکھتی ہیں انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 2005ء سے کیا تادمِ تحریر پانچ وقیع کتب شائع کر چکی ہیں، پہلی کتاب ''تدوین کلام کسریٰ منہاس'' ہے دوسری کتاب ''اولیائے کرام (حیات و تعلیمات)'' تیسری کتاب عزیز احمد کے ناول آگ کا تجزیاتی مطالعہ ہے چوتھی کتاب کا نام ''تجزیات'' ہے اور پانچویں کتاب ''عساکر پاکستان کی ادبی خدمات اردو نثر میں'' ہے شذرہ ھذا میں موخر الذکر کتاب کے حوالے سے رقمطراز ہیں ''عساکر پاکستان کی ادبی خدمت اردو نثر میں'' مطبوعہ 2013ء دراصل ڈاکٹر طاہرہ سرور کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جس کی تدوین میں انہوں نے بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے جس کی بدولت نہ صرف انہوں نے عساکر پاکستان کی نثری ادبی خدمات کو تاریخ میں محفوظ کر لیا ہے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو معتبر تحقیقی کے حوالے کے طور پر بھی ثبت کر لیا ہے ادبی تاریخ کے آنے والے کسی بھی عہد میں جب عساکرِ پاکستان کی نثری

ادبی کاوشوں کا ذکر ہوگا تو ڈاکٹر طاہرہ سرور کا نام بھی جلی حروف میں سامنے آئے گا مذکورہ کتاب کے نو ابواب ہیں جن میں پہلا باب افواجِ پاکستان اور اردو ادب ہے جس کے مندرجات میں افواجِ پاکستان کا مختصر تعارف، عساکرِ پاکستان اور شعری ادب، قیامِ پاکستان سے قبل نامور شعرا اور قیامِ پاکستان کے بعد نامور شعرا ہیں اس طرح سے یہ باب ایک ادبی پس منظر کا درجہ رکھتا ہے دوسرے باب کا عنوان بری فوج کی ایجوکیشن کور کے نثر نگار کے زیرِ عنوان ترتیب پایا ہے چوتھا باب بری فوج کی میڈیکل کور کے نثر نگار کے تحت معنون کیا گیا ہے پانچویں باب میں بری فوج کی آرٹلری کور کے نثر نگار شامل کیے گئے ہیں چھٹا باب بری فوج کی سگنل کور کے نثر نگار کے سرنامے سے مزین ہے ساتویں باب میں بری فوج کے شعبہ تعلقاتِ عامہ آئی ایس پی آر کے نثر نگار زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ آٹھویں باب میں پاک بحریہ کے نثر نگار زیرِ نظر لائے گئے ہیں باب نہم میں پاک فضائیہ کے نثر نگار زیرِ جائزہ آئے ہیں اس طرح یہ تبویب مختلف خانوں میں ادبا کی تقسیم کر کے ان کی درجہ بندی میں بازیافت کو آسان بنا دیتی ہے اور اگر قاری تقابلی جائزہ لینا چاہے یا استخراجی نتائج اخذ کرنا چاہے تو اس کے لئے سہل تر بنا دیا گیا ہے مزید برآں تحقیقی کی انداز میں ہر باب کے آخر میں متعلقہ حوالہ جات اور حواشی بھی دیئے گئے ہیں جن میں کتب، مصنفین، پبلشرز و تواریخِ اشاعت کا باضابطہ اہتمام کیا گیا ہے جادۂ تحقیق کے سالکین کے لئے یہ کتاب کافی مفید اور متداول ہے بسلسلہ ھذا پبلشر اکادمیات لاہور کی خدمات قابلِ تحسین ہیں جس کی زیرِ سرکردگی تحقیقی نوعیت کی یہ جامع کتاب جو سات سو تنتالیس صفحات پر مشتمل ہے مجلد اور رنگین گرد پوش کی حامل ہے یہ ادبی سوغات مطبوعہ 2013ء صرف ایک ہزار ثمن میں دستیاب ہے کتاب ھذا میں دیگر تحقیقی کتب کی طرح فہرست کتابیات، اخبارات و جرائد، مخطوطات و مکتوبات اور انٹرویوز کے سلسلے بھی زیبِ تحریر ہیں جدید معاونات مثلاً انگلش بکس اور انٹرنیٹ کے حوالے بھی شاملِ مقالہ ہیں ایسے عمدہ اور تاریخی ادبی مقالہ کی تحقیق و تدوین پر ڈاکٹر طاہرہ سرور اور اس کے راہنما بدیہ تبریک کے مستحق ہیں۔

اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ
کھلتے رہیں اسرارِ نہاں اور زیادہ

☆☆☆☆☆

ظریفؔ احسن کی روایت پسندانہ شاعری

روایت ادب کی اساس ہے اور اثاثہ بھی ادب میں روایت کا کردار روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے جو کام روایت کے توسط سے ہوا ہے اس سے مسابقت کے لئے جدیدیت کو عمرِ خضر درکار ہے گلشنِ ادب میں جدت کی حیثیت نو خیز کلی کی سی ہے جو کارنامے روایت پسندوں نے سرانجام دیئے جدت پسند طبقہ کے لئے ان کا تصور کرنا بھی کارِ محال ہے روایت وہ شاخِ ثمر بار ہے جو ہر عہد میں تر و تازہ اور سدا بہار رہی ہے آج ہم ظریفؔ احسن کی روایت پسندانہ سخن سنجی کے حوالے سے خامہ فرسائی کر رہے ہیں جن کی پیدائش 25 جولائی 1954ء میں مظفر گڑھ میں ہوئی تین سال بعد ان کے والدین نے بہتر معاشی مستقبل کے لئے کراچی میں اقامت اختیار کی تمام تعلیمی مدارج کراچی میں ہی طے کئے اخبارات اور پی ٹی وی میں بھی کام کرنے کا اعزاز انہیں حاصل ہے تادمِ تحریر اکاؤنٹ جنرل سندھ کراچی میں بطور سینئر ایڈیٹر گریڈ سولہ میں کام کر رہے ہیں ان کے شعری مجموعہ ''موسم موسم ملتے تھے'' مطبوعہ 2007ء کے ثلث اول اور دوم کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں برائے تجزیہ و توضیح پیشِ خدمت ہیں

ان کی ایک غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں

اک عمر جن پہ جاں کو نچھاور کئے رہے
ان سے ہمارا حال بھی پوچھا نہیں گیا

کس طرح کر رہے ہیں بسر آپ زندگی؟
ہم سے تو اپنے دکھ کو چھپایا نہیں گیا

کلاسیکی شعرا کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ اپنے عہد، اہلِ زمانہ اور اپنے محبوب سے شاکی و نالاں رہے ہیں پہلے شعر میں محبوب کے حوالے سے شکوہ و شکایت کا پہلو ہے اہل جہاں کی ستم کیشی کی داستاں بھی ہے محبوب کی بے اعتنائی کا تذکور بھی ہے اپنی وفاؤں کی دل سوز بپتا بھی ہے ایک عصری رویہ ہے اور روحِ عصر کی بھرپور ترجمانی ہے ظریف احسن زیست کو دقتِ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے مصائب و مسائل کو عمیق نظری سے مشاہدہ کرتے ہیں محوِ حیرت و استعجاب نظر آتے ہیں اور سراپا سوال ہیں اپنے قاری سے محوِ کلام ہیں یا اپنے محبوب سے استفسار کر رہے ہیں کہ ہم زندگی کا دکھ درد چھپانے سے قاصر رہے ہیں ہم میں ضبط کا یارا نہیں رہا یہ معاملہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آپ حیات کیسے بتا رہے ہیں دوسرا شعر اسی تناظر کا عکاس ہے۔ان کی غزل کا ایک مطلع لائقِ اعتنا ہے

آنکھ میں جب نمی نہ تھی پہلے
زندگی زندگی نہ تھی پہلے

ان کا بیشتر فکری کینوس روایت پسندانہ ہے ہماری روایتی شاعری میں حزن و ملال کے جذبوں کی بے حد وقعت و اہمیت ہے ہمارے شاعر موصوف بھی غم کی عظمت و افادیت کے معترف ہیں وہ غم کو زندگی کا لازمی جزو گردانتے ہیں ان کے نزدیک سوز و الم کے بغیر تعارف ہستی نامکمل ہے۔

ایک اور غزل کا مطلع اور ایک شعر طالبِ التفات ہے۔

یہ مجھ میں کون ہے جو بولتا ہے
فصیلِ ذات کے در کھولتا ہے
یہ دل واقف ہے آدابِ جنوں سے
سنبھل جانے سے پہلے ڈولتا ہے

شاعری ہر عہد میں کتھارسس کا ایک اہم ذریعہ تسلیم کی جاتی رہی ہے اور رہے گی سخن سازی وہ ہنر باکمال ہے جس سے عرفانِ ذات کے باب وا ہوتے ہیں جن کے اسباب و وجوہات کے حوالے سے کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا بہر حال قدرتِ کاملہ کا یہ گراں قدر عطیہ

ہے یہی معاملہ شعرِ اول میں کارفرما ہے شعرِ ثانی میں آدابِ جنوں کا معتبر حوالہ ہے سخنورانِ ہر دور میں جنوں کے شیدا و شیفتہ رہے ہیں اور یہ ان کا مرغوب موضوع رہا ہے ظریف احسن بھی اس حوالے سے کچھ یوں گویا ہیں کہ میرا دل آدابِ جنوں سے پیشگی طور پر واقف ہے میری حساسیت کی انتہا یہ ہے کہ احتیاط کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے میرا دل فرطِ خوف سے سنبھل جانے سے پہلے لرز جاتا ہے مذکورہ بالا اشعار میں شاعر ممدوح نے دو روایتی موضوعات کو بہ حسنِ خوبی بیان کیا ہے ان کا پیرائیہ اظہار بھی روایتی نوعیت کا صاف و شفاف شستہ اور رواں دواں ہے عروضی اعتبار سے انہوں نے مختلف بحور میں طبع آزمائی کی ہے۔

ایک اور غزل کے دو شعر مجبورِ تبصرہ کر رہے ہیں

رد کرے یا قبول' اسی کا کام
مجھ کو مطلب' فقط دعا سے ہے

وہ کسی اور سے کہاں ہو گی
ایک امید جو صبا سے ہے

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ مشیت پر شاکر و قانع رہے حقِ عبدیت بھی یہی ہے کہ انسان اپنی ضروریات و احتیاجات کے سلسلے میں محوِ استدعا رہے قبولیت یا عدم مقبولیت کا دارو مدار مالکِ کل کی صوابدید پر منحصر ہے شعرِ اول میں اسی نوعیت کا خیال جلوہ آرائی کر رہا ہے شعرِ ثانی امید و رجا سے عبارت ہے ظریف احسن کے ہاں یاسیت کی تیرگی نہیں بلکہ رجائیت کی کرنیں ضو پاشیاں کر رہی ہیں جو ایک خوش آئند امر ہے۔

زیاں چار سو ہے کدھر جائیں ہم؟
ادھر جائیں یا پھر ادھر جائیں ہم

یہی ایک خواہش رہی عمر بھر
بکھرنے سے پہلے سنور جائیں ہم

شعرِ اول میں عصری آشوب کی عمیق داستاں ہے آج کا انسان ایک نفسیاتی ہیجان کا

شکار ہے اور معاملہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق ہے اور کچھ سجھائی نہیں دیتا ان کے ہاں ترقی پسند افکار کی جھلک ملتی ہے ان کی روایت پسندی کا یہ عالم ہے کہ ان کے تخیلات روایت کی رداوڑھے ہوئے ہیں شعرِ ثانی میں ایک ترقی پسند سوچ کی غمازی موجود ہے۔

مشمولہ استشہادات شاہد ہیں کہ ظریف احسن کے کلام میں روایت پسندی کے عوامل وفور سے پائے جاتے ہیں بہر حال مزید حوصلہ افزا امکانات کی امید کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر غنی عاصم کا برجستہ اسلوبِ بیاں

مزاج کی بے تکلفی برجستہ گفتار و بیاں کو جنم دیتی ہے جس میں تدبر و تفکر اور فہم و فراست طویل المیعاد نوعیت کا نہیں ہوتا جس کے تحت پیرائیہ اظہار فطری نوعیت کا ہو جاتا ہے جو ہر قسم کے تصنع اور طبع کاری سے مبرا و ماورا ہوتا ہے یہ تخلیق کا وہ وصفِ خاص ہے جو بہت ہی کم تخلیق کاروں کو ودیعت ہوتا ہے جس کے اسباب میں زود رس فکری میلان جو ہر وجدان اور جولانی طبع شامل ہیں فنِ شاعری میں ان اوصاف کے حامل شعراء کو شعوری ریاضت کی جاں سوز عرق ریزیوں سے نہیں گزرنا پڑتا اور قاری تک ترسیلِ تخیل بھی براہِ راست اور مؤثر ہوتی ہے اسی قبیل سے تعلق رکھنے والے شعرا میں ایک نام ڈاکٹر غنی عاصم کا بھی ہے جن کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نسبت شعبۂ چارہ گری سے بھی ہے اور ڈیرہ غازی خان میں اپنا ایک پرائیویٹ کلینک چلاتے ہیں اور دکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہیں انتہائی بامروت اور خلیق انسان ہیں نفیس طبع کے مالک ہیں ان کے شخصی حوالے سے بہتر انداز میں تو کوئی ملاقاتی ہی بتا سکتا ہے ان کے اب تک چھ شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

1۔ لب بستہ
2۔ امامِ شکستگان
3۔ صبا صبا تیرے ہاتھ
4۔ آنکھیں نہ کھولنا
5۔ نکہتِ بادِ بہاری
6۔ پشت آئینہ

اس وقت ان کا چھٹا شعری مجموعہ "پشت آئینہ"

ہمارے زیر نظر ہے جس میں حمد و نعت اور نوحہ کے علاوہ زیادہ تر غزلیات شامل ہیں جس سے ان کے غزل سے فطری لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے کتاب مذکور کے حوالے سے ڈاکٹر محمد ہاشم چشتی، ڈاکٹر محمد اشرف کمال اور شعیب جاذب کے تاثرات شاملِ کتاب ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم چشتی رقمطراز ہیں:

"پشتِ آئینہ" غنی عاصم کی خوبصورت غزلوں پر مشتمل مجموعۂ کلام ہے ان کی ہر غزل تصنع سے پاک ہے ان کی سوچ میں رچا اخلاص بلا تکلف کسی بھی بات کو صاف صاف کہہ دینے میں ان کی معاونت کرتا ہے وہ پہیلیاں نہیں بجھواتے نہایت ہی سادگی ہی سادگی اور آسانی سے ہر مشکل بات بیان کر دیتے ہیں ابہام تو ان کی شاعری میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا ان کا شعر سنتے ہی دل میں اتر جاتا ہے۔"

شعیب جاذب کچھ یوں لکھتے ہیں:

ان کے مجموعہ ہائے کلام میں روایت کا امتزاج تو ہے لیکن ان کا جدید اسلوب ہے جس کی بنیاد پر انہیں رویات کا شاعر نہیں کہا جا سکتا "پشتِ آئینہ کی ترکیب اور نام ہی ان کی جدت طرازی کا کھلا ثبوت ہے۔"

ان کے مؤخر الذکر شعری مجموعہ "پشتِ آئینہ" مطبوعہ دسمبر 2013ء کی غزلیاتِ منتخبہ کے منتخب اشعار ان کے برجستہ اسلوب بیان کے تناظر میں شاملِ شذرہ ہیں۔ ان کی غزل کے تین اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

خوشیاں کم ارمان بہت ہیں
جینے کے سامان بہت ہیں
چاک ہے دامن آنکھیں پر نم
یاروں کے احسان بہت ہیں
ایک ہے دل اور لاکھوں صدمے
گھر چھوٹا مہمان بہت ہیں

شعرِ اوّل حقیقی زندگی کا منظر نامہ پیش کر رہا ہے جوان کی حُزنیہ شعری طبع کی عکاسی کرتا ہے اور ایک بے ساختگی کا پہلو بھی خود میں سموئے ہوئے ہے شعرِ ثانی میں عصری رویّوں کا حوالہ ہے اپنوں کی چیرہ دستیوں کا مذکور ہے بقول راقم الحروف

اگر غیر ہوتے شکایت بھی کرتے
ہمیں دکھ دیئے ہیں سدا دوستوں نے

حزن و ملال کی کیفیت ہے یاروں کے دیئے ہوئے دکھ درد کے لئے احسان کا لفظ لانا بھی خالصتاً طنزیہ انداز ہے شعرِ ثالث وفورِ غم کی غمازی کرتا ہے۔ دل کی تنگیٔ داماں کی شکایت بھی موجود ہے۔ شعرِ ھذا میں صنعتِ لف ونشر مرتب کا اہتمام بھی کیا گیا ہے جوان کی فنی قرینہ کاری کا مظہر ہے جس میں دل کے لئے ''چھوٹا گھر'' اور لاکھوں صدموں کے لئے ''مہمان بہت'' کے الفاظ برتے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تمام غزل برجستہ اسلوبِ بیاں کے زمرے میں آتی ہے اسلوبیاتی حوالے سے بھی غنی عاصم کا مطالعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

غزل کا مطلع جو عمیق حسیات کا مظہر ہے لائق توجہ ہے

مری ہی ذات کو مجھ پر اجاگر کیوں نہیں کرتا
خدا مجھ کو وہ اک لمحہ میسر کیوں نہیں کرتا

تخلیق کار کی دشتِ فکر میں اولین کاوش ادراکِ ذات کا حصول ہوتا ہے اگر مذہبی حوالے سے دیکھا جائے تو قول مشہور ہے جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا بھی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے غزل کے مذکورہ مطلع میں بھی اسی فلسفے کو نمایاں کیا گیا گویا اسلامی افکار بھی ان کے کلام میں خالص فطری پیرائے میں ملتے ہیں مذکورہ شعر کے دونوں مصرعوں میں استفہامیہ انداز بھی زورِ بیان پیدا کر رہا ہے

غزل کا ایک شعر زیبِ قرطاس ہے

سوچوں گا محبت کے بھی عنوان پہ لیکن
پہلے وہ مرے ساتھ عداوت تو نبھائے

شعرِ ھذا میں ایک عمیق فلسفہ کارفرما ہے فکری اعتبار سے محبت اور عداوت اس شعر کے

مرکزی تلازمے ہیں یعنی دو بنیادی ستون ہیں جن پر پورے شعر کی عمارت کھڑی ہے اگر فنی حوالے سے دیکھا جائے تو صنعتِ تضاد کا ایک برجستہ التزام اس شعر کے حسن کو فزوں تر کر رہا ہے علاوہ ازیں تخیل کی طرفگی بھی مشاہدہ کی جاسکتی ہے اصل میں محبت اور عداوت دو ایسے امور ہیں جو ضابطوں کے حامل ہیں شاعر کا عرضِ مدعا یہ ہے جو عداوت نبھانے کے سلیقے سے عاری ہے اسے محبت کا قرینہ کیسے آسکتا ہے۔ ان کے برجستہ اسلوبِ بیاں کے حامل غزل کے تین اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

تھک گئیں آنکھیں روتے روتے
بوجھ غموں کا ڈھوتے ڈھوتے
ہاتھ پہ فصلیں اگ آئی ہیں
بیج وفا کا بوتے بوتے
ہجر نہیں تھا سہل مگر ہم
ہو گئے عادی ہوتے ہوتے

اگر اسلوبیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو فطری بے ساختگی مذکورہ اشعار کا وصفِ خاص ہے اور الفاظ کا تکراری پہلو بھی دلچسپی کا عنصر پیدا کر رہا ہے ہاتھ پہ فصلیں اگ آنا بھی ایک طرح کی کرشمہ کاری ہے اور جدت طرازی کی بین دلیل ہے ان اشعار کے غائرانہ مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر موصوف انسانی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتے ہیں۔ فطری اظہار کا حامل ایک اور شعر دیکھیے۔

کر گیا بدگماں محبت سے
بات کر کے رقیب چھوٹی سی

اس شعر میں جہاں فکری اور اسلوبیاتی برجستگی نمایاں ہے وہاں تجسس کا پہلو بھی کارگر نظر آتا ہے جس نے شعر کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔ ان کا ایک اور مقطع ملاحظہ ہو۔

مجھے عاصم بہت ہی خوبرو دنیا سمجھتی ہے
مگر کم بخت میرا آئینہ کچھ اور کہتا ہے

شعر مذکور میں حقیقت پسندی کا غالب عنصر پایا جاتا ہے جس میں خود تنقیدی، خود آموزی اور خود کلامی کے خصائص پائے جاتے ہیں عمومی تخیل کی بجائے ذاتی ادراک کی بالا دستی دکھائی گئی ہے جس میں تخیل کی نادرہ کاری کارفرما ہے

غزل کے تین اشعار دیدنی ہیں

سوچتا ہوں حسن کی یہ سلطنت
کس طرح اس سے سنبھالی جائے گی؟

جھوٹی قسموں کی اگر ہے ضد اسے
یہ قسم بھی آج کھالی جائے گی

وصل کی شب دستکیں دینے لگی
آج ہر حسرت نکالی جائے گی

شعر اوّل طرفگیٔ تخیل کا غماز ہے ایک حیرت و استعجاب کا عالم ہے شعرِ ثانی میں ایک فرماں برداری کا احساس ریز ہو رہا ہے شعرِ ثالث خود میں ایک عمیق رجائی حوالہ رکھتا ہے تینوں اشعار رومانوی اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

غزل کا مطلع طالبِ التفات ہے

کر تو لیا اس نے کوئی وعدہ دلِ سادہ
میرے لئے یہ بھی ہے زیادہ دلِ سادہ

فکری اعتبار سے مطلع ہذا میں قناعت پسندی کا پہلو پایا جاتا ہے "دلِ سادہ" کی ردیف جہاں اظہار برجستگی ہے وہاں اسلوب کی شیرینی بھی نمایاں ہو رہی ہے اور بہت مزہ پیدا کر رہی ہے۔ ایک اور مطلع آپ کے ذوقِ طبع کی نذر ہے

روایات کی ترجمانی کریں
ادھر آؤ باتیں پرانی کریں

غنی عاصم روایات کے شیدا و شیفتہ ہیں ایک کلاسیکی شعور رکھتے ہیں شعر و ادب میں

روایت کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے کہ اچھے ادب کی بنیاد روایت پر استوار ہوتی ہے۔

مشمولہ استخراجات سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ڈاکٹر غنی عاصم کا اسلوب بیاں برجستگی کا نادر نمونہ ہے مزید شعری ریاضت ان کے اس وصفِ سخن کو فزوں تر جلا بخشے گی اور فکر و فن کے نئے باب وا ہوں گے اور کچھ دیگر فکری و فنی محاسن پیدا ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

فضا اعظمی کی نظم اور فکری وسعت

نظم صنفی اعتبار سے فکری وسعت کی حامل ہوتی ہے اگر کسی شاعری کی قوت متخیلہ کا وسیع فکری تناظر میں جائزہ لینا ہو تو اس کی نظم کو زیر تجزیہ لانا ہوگا کیوں کہ تخیلات کے مکمل زاویے نظم کی بدولت دیکھے جا سکتے ہیں اور تخلیقی جوہر صحیح طور پر کھل کے سامنے آجاتا ہے۔ آج ہم فضا اعظمی کی نظم کے حوالے سے رقم طراز ہیں اگر چہ یہ امر ناقدانِ ادب کے ہاں متنازعہ ہے کہ وہ نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے کیوں کہ انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور ان کا کلام بین الاقوامی معیار کا حامل ہے فکری اعتبار سے ان کا سخن ہمہ گیر اور ہمہ پہلو ہے ہم ان کے شعری مجموعہ ''آئینۂ امروز و فردا'' کے تناظر میں ان کے منتخب منظوم اقتباسات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

فضا اعظمی ایک جہاں دیدہ شخصیت اور شاعر ہیں انہوں نے تہذیبوں کے عروج و زوال کو بنظر غائر دیکھا ہے وہ تاریخِ عالم کا عمیق ادراک رکھتے ہیں قومیں ان کے سامنے بنی اور مٹی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک عالمی تہذیبی شعور ملتا ہے اسی حوالے سے ان کی نظم ''رمزِ عروج و زوال'' کا ایک اقتباس دیکھتے ہیں۔

عروج کیا ہے زوال کیا ہے؟
جو کل یقیں تھا وہ اب گماں ہے
وہ جام جمشید اب کہاں ہے؟
زوالِ آدم کی داستاں ہے
صداقتِ افتخار کیا ہے؟

حقیقت پائدار کیا ہے؟
وہ لمحۂ بے ثبات جو تھا
وہ لمحۂ بازیافت جو ہے
وہ صحِ صادق وہ صحِ کاذب
یقین محکم بھی مسئلہ ہے

یہ امر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جتنا بڑا شاعر ہوگا اس کے اندر اتنا ہی وسیع و عمیق تنقیدی شعور ہوگا ان کے تنقیدی ادراکات کی جھلک ان کی نظم ''شاعری'' کے نصف اول میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

شاعری فلسفہ و فکر کی پروازِ خیال
شاعری عظمتِ گفتار کی معراجِ خیال
شاعری معجزۂ فن کا درخشاں الماس
شاعری بندشِ الفاظ کی بے مثل مثال
فکرِ شاعر جو چھوئے عرشِ معلی کی فصیل
شاعری منصبِ انسان کی اَن مول دلیل
شاعری غالبؔ و اقبالؔ کی میراثِ قدیم
شاعری فردِ خدا ترس کی میراثِ صمیم
شاعری دستِ وفا پیشہ میں شمعِ تنویر
شاعری جلوہ گہِ مرثیۂ مرگِ ضمیر

ان کے کلام میں حزنیہ تاثرات بھرپور انداز میں پائے جاتے ہیں ان کی حزنیہ شعری طبع بڑی بڑی حکمتیں تخلیق کرنے پر قادر ہوتی ہے۔ ان کی نظم ''جبرِ تقدیر'' میں انہوں نے مسئلہ جبر کو بخوبی پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''جبرِ تقدیر'' کا اوّلین اقتباس زیبِ قرطاس ہے۔

روح بے چین ہے غمناک ہے چشمِ شاعر
حافظۂ زخم ہے احساس اُبلتا ناسور

ہوش تندور ہے اور سیخ پہ ہے مرغِ خیال
شوخیٔ فکر ہے آوارۂ دشتِ لعنت
فہم و ادراک کی بستی جو خزاں دیدہ تھی
دھنس گئی زیرِ زمیں زلزلۂ قہر کے بعد

فضا اعظمی کے ہاں بلحاظ اصناف و موضوعات تنوع پایا جاتا ہے جو ان کی تلون مزاجی کی دلیل ہے ان کے ہاں صرف حزن و ملال، یاسیت و قنوطیت ہی نہیں بلکہ طربیہ رنگوں کی ایک قوس قزح بھی پائی جاتی ہے ان کی فکر اتنی وسیع و عریض ہے جس سے ان کی جزئیات نگاری کا فن آشکار ہوتا ہے۔ طربیہ تناظر میں ان کی نظم ''خوشی'' نذرِ قارئین ہے۔

خوشی ڈھلتے ہوئے سورج کا وہ بڑھتا ہوا سایہ
پسِ دیوار محرومی جو ہولے سے اترتا ہے
غموں کی مستقل موجودیت کا درس دیتا ہے
خوشی وہ لمحۂ نایاب جو مشکل سے ملتا ہے
جو دل کو چند لمحوں کے لیے مسرور کرتا ہے
وہ سرمایہ جو آخر سانس تک بھی کم نہیں ہوتا
جو قیدِ زندگی کی سب سے تابندہ حقیقت ہے
امڈتے بادلوں کے سیل میں جو ڈوب جاتا ہے
خوشی بس ایک ساعت ایک لمحہ اک دقیقہ ایک پل اک چھن
جو محرومی کے آنگن میں گھڑی بھر کو چھلکتا ہے
خدایا مجھ کو احساسِ مسرت کا ہنر دے دے
مجھے یک گونہ سرشاری کا فیضِ معتبر دے دے

فضا اعظمی کی قوتِ متخیلہ ایک بحرِ بیکراں ہے جس کا پہلا کنارہ تو دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس کا دوسرا کنارہ بعید از بصارت و بصیرت ہے ان کا فکری کینوس بے پناہ وسعت کا حامل ہے ان کے تخیلات قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں ان کے افکار میں گہرائی و گیرائی پائی جاتی

ہے ان کے جذبات و احساسات میں بلا کی روانی اور جولانی موجود ہے انہوں نے طوالت کے اعتبار مختصر، درمیانے اور طویل درجے کی نظمیں کہی ہیں لیکن طویل یک موضوعی نظموں میں ان کی فکر زیادہ کھل کر سامنے آئی ہے ان کے ہاں محاکات نگاری اور منظر نگاری بھی ہے کہیں کہیں ان کا کلام تجریدی آرٹ کا بہترین شاہکار نظر آتا ہے۔

ان کا فنی جوہر غزل اور نظم دونوں میں کھل کر سامنے آیا ہے اس لیے انہوں نے طویل غزلیں اور نظمیں کہی ہیں اگر عروضی اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے مفرد و مرکب بحور میں سخن سنجی کی ہے اور زحافات کا استعمال بھی انتہائی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ زبان و بیان سے ان کی لسانی تبحر علمی آشکار ہوتی ہے۔ ان کی تمام تر نظم سراپا انتخاب ہے قاری کی ذہنی نزاکتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے صرف چند منظومات کے اقتباسات بطور استشہاد پیش کیے ہیں فکری و فنی اعتبار سے ان کی نظم عالمی معیار کی حامل ہے ان کی جزئیات نگاری ان کے افکار کی وسعت کی غمازی کرتی ہے۔ ان کی نظم میں فکری و فنی اور لسانی خصائص ان کی فن پر دسترس کے مظہر ہیں شعر و سخن کی تاریخ میں جب بھی نظم نگاری کا تذکرہ ہوگا تو ان کا نام نظم نگاروں کی فہرست میں نمایاں حیثیت سے شامل ہوگا۔

☆☆☆☆☆

فہیم شناسؔ کاظمی کی دل کش منظومات

میدانِ نظم بہت بسیط و عمیق ہے اس کے موضوعات کی وسعت ایک بحرِ ناپیدا کنار کی مثیل ہے نظم کے دامن کو رنگا رنگ افکار سے مسجع کرنا' تخیل میں مضمون آفرینی کا فن برجستہ و فطری انداز میں لانا' اسلوب کو جاذبیت سے لبریز کرنا اور قاری کو اپنے احساسات سے مسحور کرنا یہ نظم نگار کے وہ خصائص ہیں جو اسے دولتِ دوام سے ہمکنار کرتے ہیں عام مشاہدے کی بات ہے کہ کثرت سے غزل کہنے والے شعرا بہت ہی کم نظم کہہ پاتے ہیں جس کا اصل سبب یہ ہے کہ غزل ایجاز و اختصار اور جامعیت کی حامل ہوتی ہے غزل گو بحرِ کلیات کا شناور ہوتا ہے جب کہ نظم نگار جزئیات نگاری میں یہ طولی رکھتا ہے ان امور کا تعلق غزل اور نظم کے صنفی مزاج کی تفریق کے باعث ہوتا ہے جذبات و احساسات کے رچاؤ اور تنوع کی معیت میں دلکش اسلوبیاتی پیرائیہ اظہار میں بھرپور انداز میں کثرت سے نظم کہنا فطری ابلاغ کی بین دلیل ہے جو مشیت سے ہر کہ دمہ کو ودیعت نہیں کیا جاتا فطرت کی طرف سے یہ سعادت کسی فرخندہ نصیب کو ہی میسر آتی ہے بقول کسے ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آج ہمارا موضوعِ شذرہ فہیم شناسؔ کاظمی کی دلکش منظومات ہیں اور یہ دلکشی فکر و فن دونوں پر محیط ہے ان کی نظم کے من حیث المجموع شعبہ جات چاہے ان میں زبان و بیان' اسلوب' احساسات' ہیت اور دیگر فنی تلازمات سراہے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں جزئیات نگاری' محاکات نگاری' منظر نگاری اور مکالمہ نگاری ان کی نظم کے فن کے کلیدی تلازمے ہیں قبل ازیں

کہ ہم ان کی منتخب نظمیں زیر تجزیہ لائیں ان کے سوانحی کوائف پر عائرانہ نظر ڈالنا بھی از حد ضروری ہے موصوف کا اصل نام سید فہیم شناس کاظمی ہے 11 مئی 1956ء میں نوابشاہ میں سید ناظم حسین شاہ کاظمی کے گھر پیدا ہوئے 1982ء سے ادبی و صحافتی خدمات میں مصروف و منہمک ہیں روزنامہ جسارت کے ادبی کالم نگار بھی ہیں آرٹس کونسل آف کراچی پاکستان کے ممبر بھی ہیں' سہ ماہی اجرا'' کراچی کے نائب مدیر بھی ہیں نواب شاہ کی معروف ادبی تنظیم ارباب قلم کے بانی و جنرل سیکریٹری بھی ہیں سابق صدر ایوانِ صحافت نواب شاہ ہیں ان کا اوّلین شعری مجموعہ'' سارا جہاں ہے آئینہ'' 1999ء کو منصہ شہود پر آیا ان کا مجموعہ ثانی ''خواب سے باہر'' 2009ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا 2013ء میں ''راہداری میں گونجتی نظم'' نظمیہ مجموعہ منظر عام پر آیا علاوہ ازیں ''سندھ کی آواز (جی ایم سید کے عدالتی بیان کا ترجمہ) 2002ء میں شائع ہوا تالیفی اعتبار سے ان کی پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں ''تیرے عشق نے مالا مال کیا'' (صابر ظفر کی غزلوں اور گیتوں کا انتخاب مطبوعہ 2004)، ''بوئے گل'' جلد اوّل شیخ ایاز 2010''، ''حلقہ مری زنجیر کا''، جلد دوم شیخ ایاز 2010ء ''سارتر کے مضامین'' 2012ء اور ''سارتر کے بے مثال افسانے'' 2012ء شامل ہیں۔ ان کے سوانحی کوائف کے بیان سے یہ غمازی ہوتی ہے کہ وہ بہت سی ادبی وابستگیوں کے حامل ہیں ادبی' صحافتی تصنیفی اور تالیفی اعتبار سے انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔

اُن کی نظموں کا مجموعہ'' راہداری میں گونجتی نظم'' مطبوعہ 2013ء بار اول ہمارے زیر نظر ہے جس کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد' ڈاکٹر ابرار احمد اور رؤف نیازی جیسی معتبر شخصیات کی آرا ثبت ہیں۔ ''میں اور نظم'' سے موسوم شاعر مذکور کا اظہار خیال بھی مشمولات کا حصہ ہے جبکہ فلیپ ڈاکٹر وزیر آغا اور شمیم اقبال کا تحریر شدہ ہے ہم ان کے مذکورہ مجموعہ کے ثلث اول کی منتخب نظمیات کے منتخب اقتباسات شامل تجزیہ کرتے ہیں۔

عرفانِ خالق کائنات اور اس ذات کبریا کی مدح سرائی میں عمومی طور پر حمد گو شعرا تصوف کے دو نظریات ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کو اپنی نظم کا حصہ بناتے ہیں فصاحت و بلاغت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اور موضوع کے تاثر کو اجاگر کرنے کے لیے جزئیات نگاری کی

اہمیت مسلمہ و مصدقہ ہے کسی بھی عقدہ کی کشود کے لیے اور تفہیم کے عمل کو آسان تر بنانے کے لیے جزئیات سے کلیات کا سفر ممد و معاون ہوتا ہے اس طرح سے اس عظیم ذات سے محبت کے تقاضے بھی نبھائے جاتے ہیں اسی پس منظر میں فہیم شناس کاظمی کی حمد ملاحظہ کریں ۔

مہکے اُجلے خوابوں میں
خوشبودار گلابوں میں
سورج چاند ستاروں میں
ست رنگے سیاروں میں
دھول اڑاتی راہوں میں
دلکش سبزہ گاہوں میں
نیلم نیل سمندر میں
ہر منظر پس منظر میں
یا اللہ ہے تو ہی تو

شاعرِ مذکور کی نظمیات میں ایک بھرپور نوعیت کی جولانی اور روانی ہے اور طرزِ اظہار فطری انداز میں ڈھلا ہوا ہے اور فکری تاثر بھی مسحور کن ہے تسلسل ایسا ہے کہ خیالات ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہیں مجموعی طور پر ان کی نظم کی بندش بہت چست اور عمدہ ہوتی ہے انہوں نے زبردست قسم کی کلاسکس نظمیں بھی کہی ہیں جو شعری تحیر اور تخلیقی پراسراریت کی دولت سے مالا مال ہیں اسی تناظر میں ان کی نظم "چادر تہہ کر دی" کا اقتباسِ اولیٰ نذرِ قارئین ہے ۔

کوئی آگ پیئے کہ زہر پیئے
یا سانپ ڈسے کی موت مرے
اب دھوپ کے جل تھل دریا سے
کوئی اپنے منہ سے ریت بھرے
ہم نے تو پیالہ اُلٹ دیا
اور اُلٹ دیا
ہر اک منظر

اُن کی نظمیات اپنے اندر ابلاغ کی بے پناہ قوت رکھتی ہیں وہ لسانی گورکھ دھندوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے اپنے آپ کو مبرا و ماورا رکھتے ہیں قاری کی مزاجی نزاکتوں' لطافتوں اور نفاستوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اُن کی نظم ''خواب کوئی پناہ دیتا نہیں'' کا اقتباس اول زیب قرطاس ہے ۔

ہم کسی راستے پہ چلتے ہوئے
داستاں سے اگر نکل جائیں
پھر ہمیں تم تلاش مت کرنا
داستاں سے نکلنے والوں کو
کوئی رستہ بھی راہ نہیں دیتا
وہ سمندر زمیں ہو یا افلاک
کوئی ان کو پناہ دیتا نہیں

فکری اعتبار سے جہاں ان کے کینوس میں ایک پر تاثیر نوعیت کا تاریخی' تہذیبی و تمدنی شعور آشکار ہوتا ہے وہاں کچھ تلخ حقائق کی آگہی بھی ملتی ہے ان کی نظم ماضی' حال اور مستقبل تینوں کی روداد معلوم ہوتی ہے ماضی کو مدِ نظر رکھیں تو سرگزشت ہے اگر حال کو دیکھا جائے تو کیفیات و واردات ہیں اور اگر مستقبل کے تناظر میں دیکھیں تو پیش گوئی ہے گویا ان کی نظم دیرو زو امروز و فردا کی ردا اوڑھے زمانی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر انسانی شعور کی ترجمانی کر رہی ہے ان کی نظم ''ہم کتنے پاگل ہیں؟'' لائق التفات ہے ۔

ریت کے گھروندوں میں
اپنے خواب رکھ کے ہم
مطمئن کچھ ایسے ہیں
جس طرح سے یہ موجیں
کب انھیں چھو پائیں گی؟
کب انھیں مٹائیں گی؟

ہم بھی کتنے پاگل ہیں؟
اپنے خواب رکھتے ہیں
ساحلِ سمندر پر
ریت کے گھروندوں میں

وہ اپنے موضوع کو انتہائی جامعیت کے ساتھ سمیٹنے کا فن جانتے ہیں اس سلسلے میں استشہاد کے طور پر ان کی ایک کلائمکس نوعیت کی نظم ''ارتقا'' پیش کی جاسکتی ہے۔

وہ پھول چنتے چنتے
کتنی بدل گئی ہے؟
خوشبو میں ڈھل گئی ہے

بہر حال فہیم شناس کاظمی کی نظم بلحاظ فکر و فن اپنے اندر بے پناہ دلکشی سموئے ہوئے ہے انہیں متقدمین و متوسطین و متاخرین کی نظم کے مطالعے کی بے حد ضرورت ہے جس کے باعث اُن کی نظم کی مقبولیت کا گراف مزید اوپر جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

کاوشؔ عمر کی ولولہ آگیں شاعری

شاعر الفاظ کا بازی گر ہوتا ہے وہ نہ صرف الفاظ کے برتنے کا سلیقہ جانتا ہے بلکہ انتخابِ الفاظ بھی اس کی دستگاہ میں ہوتا ہے جس کا وہ اپنی افتادِ طبع کے مطابق استعمال کرتا ہے بعض شعرا کا کلام انتہائی غم انگیز ہوتا ہے اور بعض رومانویت کے علمبردار ہوتے ہیں آج ہم جس اہلِ سخن کا ذکرِ خیر کرنے چلے ہیں وہ استاد الشعرا حضرت کاوشؔ عمر ہیں ان کا اصل نام محمد مشتاق عالم ہے کاوشؔ عمر ان کا قلمی نام ہے ان کے والد محمد عمر فیضی ہوگزرے ہیں کاوشؔ عمر 1939ء میں پیدا ہوئے زندگی کا بڑا حصہ سابق مشرقی پاکستان موجود بنگلہ دیش کے شہر چاٹگام میں گزارا وہاں پیشۂ صحافت سے وابستہ رہے جہاں پیامِ مشرق (چاٹگام) ماہنامہ سیماب (چاٹگام) ماہنامہ روش (چاٹگام) روزنامہ پاسبان (ڈھاکہ) اور روزنامہ شجاعت (چاٹگام) میں کام کرتے رہے بعد ازاں کراچی شاہ ولی اللہ نگر کورنگی ٹاؤن میں منتقل ہوگئے یہاں بھی ایک وسیع حلقۂ احباب اور بہت سے شاگرد انہیں میسر آئے یوں حیاتِ شین شعروادب کی خدمت میں بسر ہوتی رہی۔

کاوشؔ عمر کا کلام خوب مجھا ہوا اور جاندار ہے ان کے سخن میں ولولے نمو پاتے ہیں امنگیں جاگتی ہیں آہنگ پروان چڑھتا ہے آرزوئیں سانس لیتی نظر آتی ہیں اور تمناؤں کو مہمیز ہونے کا موقع ملتا ہے ان کی بحور خاصی طویل مقفع و مسجع اور داخلی قوافی سے سرشار ہیں یوں لگتا ہے جیسے اشعار کا چشمہ ابل پڑا ہو طبیعت میں بلا کی روانی اور جولانی پائی جاتی ہے جس کی مثال شاذ ہی کہیں نظر آتی ہے ان کے وفورِ شعر نے انہیں ممتاز و منفرد بنا دیا ہے شذرہ ھذا میں ہم ان کے شعری مجموعہ "سنگ و سمن" مطبوعہ 2010ء کے ربع اول کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار کا تجزیہ مذکورہ موضوع کے تناظر میں کرتے ہیں ان کے مجموعۂ کلام کا نام بھی ان کے منفرد شعری

مزاج کا غماز ہے۔

فنِ شاعری کا وصفِ کمال یہ ہے کہ موضوعات دولتِ تاثیر سے مالا مال ہوں اور اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ جلوہ گر ہوں سخن ور اپنے تخیل کی اہمیت و افادیت کو باور کرانے کی اہلیت رکھتا ہو اس کے افکار بسیط رجائی اور طربیہ تاثرات کے حامل ہوں تاکہ وہ اپنے عہد کو اُمید افزا امکانات اور طرب خیز عوامل سے ہمکنار کر سکے تاکہ یاسیت و قنوطیت کو پنپنے کے مواقع میسر نہ آسکیں آس اور تمنا کی کرنیں ضو پاشیاں کرتی رہیں افسردگیاں اور بیزاریاں فروکش ہو جائیں خوشگوار احساسات کو فروغ نصیب ہو اس تناظر میں ان کی ایک غزل کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں جو ان کے ولولوں کی داستان کے عکاس اور ان کے شعری تموّج کی غمازی کرتے ہیں ۔

ایک دن دورِ عیش و طرب کی طرح غم کے یہ سلسلے بھی گزر جائیں گے
اشک تھم جائے گا، آہ رک جائے گی، درد مٹ جائے گا، زخم بھر جائیں گے

اے دل اب ہجر کی کشمکش سے گزر ان کے آنے نہ آنے کی پروا نہ کر
ابر چھٹ جائے گا، وقت کٹ جائے گا، رات ڈھل جائے گی، دن گزر جائیں گے

ان کا سخن خارجیت اور داخلیت کا حسین امتزاج ہے اور ایک زبردست قسم کا شعری وفور پایا جاتا ہے عندالبیان قوافی کا استعمال بکثرت ملتا ہے ایک قادر الکلامی ہے جو اپنی بہار دکھاتی نظر آتی ہے داخلی اور خارجی جزئیات کا بیان پہلو بہ پہلو ملتا ہے حزنیہ افکار ہیں جن میں عصری آشوب کی پیوند کاری بھی پائی جاتی ہے نالہ و شیون کے حوالے ہیں کہیں کہیں تعلیاتی شواہد بھی پائے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے شاعرِ موصوف اپنے فکری و فنی ادراکات کا بسیط شعور رکھتے ہیں اس نسبت سے ان کی ایک غزل کے دو اشعار دیدنی ہیں ۔

کینہ پرور زمیں، فتنہ گر آسماں، دل کا دشمن جہاں، دل امنگوں کا گھر
نو بہ نو خواہشیں، ضو بہ ضو حسرتیں، آرزوئیں بہت، زندگی مختصر

یوں تو ہیں انجمن انجمن سینکڑوں خوش بیاں نکتہ داں نغز گو ذی سخن
پر حقیقت ہے کوئی تعلّی نہیں ہے سبھو سے جدا طرزِ کاوشؔ عمر

کاوشؔ عمر کا کمال یہ ہے کہ وہ شعر کے مختصر پیمانے میں بہت سے تلازمات کا اہتمام فنی چابکدستی سے کرتے ہیں مصرعوں کے در و بست میں استادانہ مہارت کا پہلو کارفرما ہے ان کے اشعار میں موضوعات سمٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کی بحور طویل' رواں دواں اور چست نوعیت کی ہیں اسلوب ایسا کہ جیسے مالا میں موتی پروئے گئے ہیں، تسبیح کے دانوں کی طرح الفاظ کے مابین توازن کی ایک دلکش فضا پائی جاتی ہے، مصرع مصرع پکار پکار کر ان کے آموزگارِ فن ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ ان کے تخیلات میں رومانویت کی ایک بھرپور لہر پائی جاتی ہے پریم کے پوتر جذبات شعری دفور کے رنگ میں ملتے ہیں محبت ان کا دین دھرم ہے اخلاص کی پونجی پریم پرم ہے اس لئے وہ چاہت پر دنیا و عقبیٰ قربان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں رومان نگاری کی ذیل میں وہ متقدمین۔ متوسطین و متاخرین سے پیش رفت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اسلوبیاتی اور عروضی اعتبار سے ان کا تمام تر کلام لہر بحر میں ہے۔ ایک موجِ مستی ہے، سوز و گداز ہے، تخیل محوِ پرواز ہے، بے کلی و بے خودی ہے، ایک کیفیتِ جنوں ہے، فزوں عشق کا فسوں ہے، عیاں جس سے رنگِ دروں ہے، ایک کیف و سرور ہے جو بین السطور ہے، انہیں اوصافِ حمیدہ کی جھلک ان کی ایک غزل کے تین اشعار میں ملاحظہ کریں۔

ننگ' ناموس' ایمان' غیرت' شرف' دین دل' زندگی
عشق کے کھیل میں ایک ہی داؤ پر ہنس کے ہار آئے ہیں

عقل' دانش' خرد' فہم' ہوش' آگہی' علم' جودت' خبر
سب لٹا کر تری مستی چشم پر مے گسار آئے ہیں

تمکنت' ناز' غمزہ' نزاکت' بھبن' شان' شوخی حیا
آنے والے اداؤں میں نخرے لیے بے شمار آئے ہیں

فطری طور پر انہوں نے ایک مشکل پسند اور مہم جو طبیعت پائی ہے۔ فکری وفنی اور اسلوبیاتی حوالے سے ان کا کلام مشکل پسندی کی ذیل میں آتا ہے۔ لسانی اعتبار سے ان کے ہاں ہندی اور فارسی لفظیات کا چلن عام ہے اس حوالے سے ان کا نظامِ ترکیبات بھی قابلِ ذکر ہے ان کی بحور میں تنوع ہے اور افکار میں ترفع ہے وہ عشق بھی کرتے ہیں تو اپنی تمام تر جسارتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں کیونکہ وہ مردانہ وار زندگی کرنے کے قائل ہیں وہ اپنی فکری وفنی معاملات کی دقیقہ سنجی سے آشنا ہیں اور یہی امر کامیابی سے باور کراتے ہوئے بھی نظر آئے ہیں۔

انہیں احساسات کا رنگ ان کی ایک غزل کے تین اشعار میں لائق التفات ہے ۔

منزلِ آرزو کا مسافر ہوں میں کب مجھے کوئی سہل ڈگر چاہیے
کوہ، تل، دشت، دریا، سمندر، افق، جھیل وادی دمن پر خطر چاہیے

کیا خبر تجھ کو کیا کیا رہِ عشق میں اے مرے سادہ دل ہم سفر چاہیے
ولولہ، جوش، مستی، جنوں، تمکنت، حوصلہ، عزم، ہمت جگر چاہیے

ہر سخن اہلِ دانش سے پنہاں نہیں، شاعری طرزِ کاوش میں آساں نہیں
درک، احساس، جذبہ، تخیل، عمق، اوج، وسعت، رسائی، ہنر چاہیے

ان کے تخیلات میں عصری آشوب کے تلخ شواہد فرطِ تسلسل سے پائے جاتے ہیں عمرانی تنقیدی رویے ہیں جو افکار کی شدت وحدت کو فزوں تر کر رہے ہیں اگرچہ احساسات روایتی نوعیت کے ہیں مگر پیش کش کا انداز جدید طرز کا حامل ہے۔

ان کی ایک غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں ۔

جام لبریز میں بے زروں کا لہو اہلِ زر میں نمایاں درندوں کی خو
خون پیتا ہے انسان انسان کا، کون کہتا ہے انسان انسان ہے

کس سے تیرہ نصیبی کا شکوہ کریں یہ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی بستیاں
جگمگاتے ہوئے بام و در کی قسم، روشنی صرف معراجِ ایوان ہے

کاوشؔ عمر کا فن کمالِ فن ہے جس میں درسِ انقلاب بھی ہے آشوبِ مغائرت بھی ہے، نادار سے ہمدردی و محبت اور زردار کی خوئے استحصال کی فکرِ استیصال بھی ہے وہ ایک نمایاں قدو قامت کے شاعر ہیں انھیں اپنے استادِ ہنر ہونے کا ادراک ہے معراجِ سخن سے آشنائی ہے جس کے برعکس وہ اپنے مقام و مرتبے سے اچھی طرح روشناس ہیں جس کی شہادت ان کے اشعار میں عموماً اور مقاطع میں خصوصاً پائی جاتی ہے بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ ۔

مدتوں بعد جنم لیتے ہیں وہ دشت نورد
راستے جن کی کفِ پا سے چمک جاتے ہیں

وہ شہرت کے بامِ عروج پر نہیں پہنچ سکے جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے تاہم جن اہلِ نظر قارئین کو ان کا کلام پڑھنے کا موقع ملا وہ ضرور سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کاوشؔ عمر ایک بہت بڑے شاعر ہیں ایک صاحبِ طرز سخن ور ہیں اور اپنا ایک خاص اسلوب رکھنے والے مہان قوی ہیں۔

☆☆☆☆☆

گل زیب عباسی کا افسانہ اور عمومی سماجی رویئے

کسی بھی افسانے کی کامیابی کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ اس میں اس کا عہد جھانکتا ہوا دکھائی دے حقیق زندگی کی حقیقی تصویریں پیش کرے اپنے کرداروں کی بدولت عصری رویوں کی عکاسی کرے افسانے کا پلاٹ اور کرداروں کے مکالمے فطری نوعیت کے ہوں کرداروں نے اپنی آنکھوں پر تصنع کے چشمے نہ سجائے ہوں معاشرے کے نشیب و فراز کا مذکور ہو محاسن کی حوصلہ افزائی ہو تاکہ انہیں فروغ میسر آسکے معائب کی حوصلہ شکنی ہو تاکہ ان کی مذمت کر کے ان کا تدراک کیا جائے یہی انکشافات گل زیب عباسی کے افسانوں مجموعہ ''زہریلے پھول'' کے مطالعہ کے بعد اظہر من الشمس ہوئے مذکورہ مجموعہ کی طباعت مارچ 2013ء میں عمل میں آئی جس میں کل بیس افسانے شامل ہیں ہر افسانے میں کسی سماجی المیے کی بپتا ہے اسلوب فطری نوعیت کا ہے انہوں نے سہل نگاری کی روایت کو فروغ بخشا ہے محاورات کا استعمال فنی چابکدستی سے ہوا ہے ہر محاورہ بر موقع خوب جچ رہا ہے ان کے افسانوں میں عصرِ حاضر کی عمدہ تمثیلات ہیں جن میں زندگی جیتی جاگتی جگمگاتی نظر آتی ہے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری ملتی ہے ان کے افسانوں میں یہ جانکاری ملتی ہے کہ وہ انسانی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتے ہیں منظر نگاری، محاکات نگاری اور تجریدی آرٹ کے شواہد بکثرت ملتے ہیں عمومی سماجی رویوں کا مذکور بھرپور انداز میں ملتا ہے مذکورہ مجموعہ کے خمس اول کے افسانوں کو شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔

''پارو'' مجموعہ ھذا کا پہلا افسانہ ہے جس کے کردار خالص مضافاتی نوعیت کے ہیں افسانے کا پلاٹ فنی وپختگی کا مظہر ہے پارو ایک دیہاتی لڑکی ہے جو کسی صاحبِ ثروت کی حویلی میں کام کرنے کی غرض سے جاتی ہے حویلی کی چکا چوندا سے مرغوب کر دیتی ہے گھر جا کر وہ اپنی

ماں سے حویلی میں لگے پھولوں کی خوبصورتی کا تذکرہ کرتی ہے اس کی ماں جو ایک جہاندیدہ خاتون ہے جواباً اسے کہتی ہے کہ حویلی میں پھول تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن خوشبو سے محروم ہوتے ہیں وہ ماں کے اس تعجب امیز جملے پر چونک جاتی ہے ایک دن جب پارو کو چوہدرانی کہتی ہے کہ آج چوہدری صاحب بہت پریشان ہیں ان کا ایک کام ہے کر دو اگر تو ان کی پریشانی جاتی رہے گی پارو انتہائی معصومیت سے کہتی ہے کہ کام اگر میرے کرنے کا ہوا تو میں ضرور کروں گی اتنے میں چوہدری صاحب کہتے ہیں یہ دوائی ہے جو فلاں ڈاکٹر صاحب کے پاس فلاں جگہ پہنچانی ہے پھر پارو تجسس امیز انداز میں کہتی ہے جو پہلے دوائی لے جاتے تھے وہ کہاں گئے چوہدری برجستہ جواب دیتا ہے ان کی صحت خراب ہوگئی چوہدری منشیات کے پیکٹ دوائی کے طور پر دیتے ہیں کہ انہیں لگھو گھوڑوں کے خوانچے میں رکھ کر لے جائے پارو سخت برہم ہوتی ہے چوہدری کو سخت برا بھلا کہتی ہے وہ نوٹوں کی نتھی اور منشیات کے پیکٹ کو چوہدری کے منہ پر دے مارتی ہے پارو کا کردار ایک مضافاتی اور حب الوطن لڑکی کا کردار ہے بعد میں وہ یہی جملہ دہراتی ہے کہ ماں سچ کہتی ہے کہ بڑے گھروں میں پھول تو بے شمار ہوتے ہیں لیکن خوشبو سے محروم ہوتے ہیں یہ افسانہ حب الوطنی کا شاہکار ہے افسانے کا پلاٹ فنی چابک دستی کا مظہر ہے زبان و بیان کا معیار فطری نوعیت کا ہے۔

''گندے لوگ'' ان کا دوسرا افسانہ ہے یہ عمومی نوعیت کی کہانی ہے زیبی ایک مضافاتی کردار ہے جو زیورات سے لیس اپنے سسر کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہی ہے جو ماموں کے گھر بیاہی گئی ہے ماموں جو رشتے میں ان کے سسر بھی ہیں کے ہمراہ میکے سے پیکے کا سفر کر رہی ہے ٹرین میں لوگ حالات حاضرہ اور ہونے والی وارداتوں کے حوالے سے بحث کر رہے ہیں اور زیبی جس نے اپنا پورا بدن زیورات سے سجایا ہوا ہے خوفزدہ ہو کر سن رہی ہے جب رات کو وہ ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہیں تو انہیں راستے میں ڈاکو پڑ جاتے ہیں جو زیبی کے زیورات چھیننے کی کوشش کرتے ہیں، بالآخر ڈاکوؤں کی آپس کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں ایک ڈاکو مارا جاتا ہے زیبی کے زیورات واپس کیئے جاتے ہیں اور انہیں بحفاظت گھر پہنچا دیا جاتا ہے اس افسانے میں اچھائی اور برائی کی کشمکش دکھائی جاتی ہے بالآخر اچھائی جیت جاتی ہے اس افسانے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا درس دیا گیا ہے۔

"نالائق" ان کا تیسرا افسانہ ہے میاں جی اور صابرہ اس کے کلیدی کردار ہیں جو اپنی نو بیاہی بیٹی ثانیہ کو اپنی عید کی خوشیوں میں شریک کرنے کے لئے اسے سسرال سے لانے جا رہے ہیں بس میں ڈکیتی کی واردات ہو جاتی ہے ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو نے میاں جی کو پہچان لیا کیونکہ وہ ان کا نالائق شاگرد عدیل تھا اس نے لوٹا ہوا سامان میاں جی کے حوالے کر دیا۔ میاں جی کو سلیوٹ کرتے ہوئے چلتا بنا جس کے باعث بلّے بلّے میاں جی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ میاں جی نے انہیں حقیقت سے آشنا کیا اس افسانے میں اساتذہ کا احترام سکھایا گیا ہے یہ ایک فطری نوعیت کا افسانہ ہے۔

"دو آنکھیں" ان کا چوتھا افسانہ ہے اور شہو جس کا مرکزی کردار ہے جو بنیادی طور پر ایک طالب علم ہے عمر کے لاابالی حصے میں ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کا پیچھا کرتا رہتا ہے اس افسانے میں ایک ایسا ہی ماجرا بیان کیا گیا ہے جس میں ایک خوبصورت آنکھوں والی خاتون سے آنکھ مٹکے کے نتیجے میں ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا جب خوبصورت آنکھوں والی نقاب پوش عورت نے نقاب اٹھایا تو وہ عمر رسیدہ خاتون تھیں اور جس کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں پھر وہ اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا یہ افسانہ نسل نو کی بے راہروی کا غماز ہے جو اپنے والدین، سماج، ملک و قوم کی امنگوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جس کا نتیجہ رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گل زیب عباسی کے بیشتر افسانے مضافاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ مضافات میں زندگی اپنی حقیقی صورت میں ملتی ہے جہاں خلوص و مروت اور رواداری کے استعارے ملتے ہیں۔

بقول راقم الحروف۔

خلوص و وفا اور مہر و محبت
یہ سب استعارے مضافات کے ہیں

ان کے افسانوں میں عمومی سماجی رویے وفور سے پائے جاتے ہیں ان کا افسانہ اپنی معاشرت کا ترجمان ہے جس میں دھیمے دھیمے تاثرات ہیں جو متانت و سنجیدگی کی غمازی کرتے ہیں افسانوی اعتبار سے ابھی ان کے سفر کی ابتدا ہے ابھی انہوں نے افسانوی دنیا کے سفت آسمان سر کرنے ہیں اگر ان کی لگن اور محنت جاری رہی تو ان کا افسانہ معیارات کی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آئے گا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر مظہر حامد کے سخن کی رومانی فضا

رومان جذبے شعری تاریخ کے ہر عہد میں روحِ رواں اور اعتبارِ ذوق رہے ہیں جن کے باعث فنِ شعر کی لطافتیں' نفاستیں اور نزاکتیں دو چند ہوئی ہیں اور یہ ہنر مرصع سازی کا مثیل قرار پایا ہے یہی سبب ہے کہ فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں میں شاعری نے نمایاں مقام پایا ہے فکری اعتبار سے شعر میں رومان کی پیوند کاری سے شعر کی فضا زعفران زار ہو جاتی ہے جبکہ اس کے بغیر شعر کا اسلوب بے جان اور سپاٹ ہو جاتا ہے پریم کے پوتر جذبات کو پیرائیہ اظہار میں لانے کے لیے احساسات کی شدت وحدت ناگزیر ہے جس کے لئے بھرپور اور توانا لہجہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ڈاکٹر مظہر حامد کے کلام کی رومانی فضا کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کے سوانحی کوائف کی جھلک کچھ یوں ہے۔

موصوف کے والدِ محترم حضرت حافظ حامد علی خان نے دنیائے ادب میں ادیب فکری کے نام سے شہرت پائی اور 1950ء میں ہندوستان رام پور سے ہجرت کر کے مظفر گڑھ جنوبی پنجاب پاکستان میں مقیم ہوئے ڈاکٹر مظہر حامد کی پیدائش یکم ستمبر 1952ء کو مظفر گڑھ میں ہوئی قرآن مجید کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی 1960ء میں ان کے والدین کراچی میں اقامت پذیر ہوئے 1965ء میں پانچویں کلاس کا امتحان پاس کیا میٹرک کورنگی کے ایریا سکول سے 1971ء میں کیا 1974ء میں نجی طور پر انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا 1988ء میں ایم اے اردو کیا 2005ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی جس کا عنوانِ مقالہ "اردو نظم پر اقبال کے اثرات" تھا ادبی حوالے سے ان کا تعلق پروفیسر منظور حسین شور اور پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال کے حلقۂ تلمذ سے ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ان کے شعری مجموعہ "وقت کی دہلیز پر" مطبوعہ

2013ء کے ثلث اول کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار شاملِ تجزیہ کرتے ہیں مذکورہ مجموعہ میں تمام تر غزلیات شامل ہیں جس سے شاعرِ موصوف کے غزل سے والہانہ پن کا اظہار ہوتا ہے۔

محبت انقلاب افریں صورتِ حال اور جذب وشوق کی کیفیات سے عبارت ہے داخلی اور خارجی احساسات کی مکمل تبدیلی کا نام ہے وجد وحال کا عالم ہے زمین و آسمان اور دل و جاں میں ایک تحیّر کی فضا محسوس ہوتی ہے ڈاکٹر مظہر حامد کے ہاں دیوانگی اور فرزانگی پہلو بہ پہلو چلتی ہیں جس کی تمثیل شاذ ہی کسی سخنور کے ہاں مشاہدہ کی جاسکے گی وہ انسانی نفسیات اور رومانوی معاملات کا عمیق ادراک رکھتے ہیں جس سے ان کے تجربات ومشاہدات کا عکس جمیل عیاں ہوتا ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں ۔

زمیں کچھ اور یا پھر آسماں کچھ اور ہوتا ہے
محبت میں دل و جاں کا سماں کچھ اور ہوتا ہے

جنوں میں باخبر رہنا بھی معراجِ محبت ہے
کہ دیوانے کا اندازِ بیاں کچھ اور ہوتا ہے

کہیں کہیں بین السطور فلسفیانہ افکار کی جھلک بھی ملتی ہے جس سے ان کی بالیدہ فکری کی غمازی ہوتی ہے وہ شعر کے مختصر پیمانے میں بسیط وعمیق موضوع کو انتہائی قرینہ کاری کے انداز میں باندھتے ہیں ان کے تخیل کا تحیراتی پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب بھی محبّ کے روپ میں جلوہ نما نظر آتا ہے ۔

راز دل کا نظر سے کھلتا ہے
یہ معمہ اثر سے کھلتا ہے

جذبۂ عشق پہلے ہم تک تھا
اب درِ دل اُدھر سے کھلتا ہے

معراجِ محبت یہی ہے کہ محبوب اور اس کے متعلقات عزیزِ دل و جاں ٹھہریں جب انسان

کو یہ مقام حاصل ہو جائے تو پھر وہ خالقِ دو جہاں سے اپنے محبوب کے لئے محوِ استدعا ہوتا ہے اسی نسبت سے ان کی ایک غزل کا مطلع لائقِ التفات ہے ۔

جسم سارا جل رہا ہے دل میں ہے تصویرِ یار
میں اسے کیسے بچاؤں اے مرے پروردگار

عالمِ ہجراں عشاق کے لئے ایک بہت بڑی افتاد ہوا کرتی ہے تمام رونقیں اور رعنائیاں ماند ہو جایا کرتی ہیں انجمن ویران ہو جاتی ہے اور فضا سنسان ہو جاتی ہے ایسی حالت میں قرب کے لمحے رہ رہ کر تڑپاتے ہیں۔

وہ کیف و سرور، وہ ساقی و صہبا اور وہ ساغر و مینا جو وصل کے لوازمات ہوتے ہیں وہ سب یاد آتے ہیں اُن کی ایک غزل کا مطلع جو موضوع کے اعتبار سے تو روایتی ہے لیکن اُسے انتہائی خوبصورتی سے نبھایا ہے ۔

اک تیرے نہ ہونے سے یہ ہے بزم کا عالم
وہ خم ہے نہ وہ بادہ نہ وہ مستیٔ پیہم

اُن کے ہاں جذبوں میں ایک اخلاص اور رچاؤ پایا جاتا ہے جس سے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ایک جاذبیت و شیرینی ہے جو قاری کو مائل بہ التفات کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے عندالبیان رومانی تنقیدی رویے بھی پائے جاتے ہیں جو انسانی کج رویوں کے غماز ہیں ان کی ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر دیدنی ہے ۔

چاہت جو غرض کی ہو وہ چاہت نہیں رہتی
جب دل میں ہوس ہو تو محبت نہیں رہتی

دعویٰ تو محبت کا بہت ہی عام ہے لیکن
اخلاص نہ جب تک ہو رفاقت نہیں رہتی

ڈاکٹر مظہر حامد کے ہاں محبت کا ایک عمیق احساس ضو پاشیاں کر رہا ہے بے لوث جذبے ہیں جو سخن کی شان بڑھا رہے ہیں ان کی ایک غزل کا مطلع دردِ دل پر دق الباب کر رہا ہے ۔

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے دل تری محفل میں ہے
ہوں نہ ہوں میں تیرے دل میں تو مرے ہی دل میں ہے

عروضی محاسن کی پاسداری مفرد اور رواں دواں بحور کا انتخاب ان کی سخن سنجی کا خاصہ ہے جو اپنے اندر رومانویت کی ایک فضا سموئے ہوئے ہے اُن کے فکری کینوس میں ایک بوقلمونی ہے ان کے مزاج میں ایک تنوع ہے لیکن رومان کا رنگ سب سے چوکھا ہے ان کا فکر وفن بالیدگی کا مظہر ہے مزید شعری ریاضت سے امکانات کے فزوں تر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محبوب عالم کا نقدِ فن،
نعت نگاری کے تناظر میں

فنِ تنقید خاصہ دقت طلب کام ہے اور بہت سی کٹھنائیوں سے عبارت ہے اگر معاملہ نعت نگاری کی تحقیق وتنقید کا ہو تو اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے تنقیدی ادب میں نقدِ نعت کی صحت مند اور تندرست وتوانا روایت موجود ہے اس حوالے سے کافی کام ہو چکا ہے جسے مزید کرنے کی بھی ضرورت ہے گذشتہ ادوار میں جن ناقدین نے اس سلسلے میں کام کیا ان میں شاکر کنڈان، جاوید احسن، ندیم ایزد دکھوسہ اور ڈاکٹر محبوب عالم کے اسمائے جلیلہ شامل ہیں شذرہ ھذا میں ہم ڈاکٹر محبوب عالم کی تنقیدی وتحقیقی نوعیت کی تصنیف ''ڈیرہ غازی خاں میں نعت نگاری اور تنقیدِ نعت کی روایت'' مطبوعہ 2013ء ہے نعت نگاری کی تاریخ میں کتابِ ھذا ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اجمالاً نعت نگاری کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے خصوصاً ڈیرہ غازی خاں کی نعت نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر محبوب عالم کی یہ کاوش قابلِ تحسین ہے۔ وہ منطقی اور معروضی نوعیت کا استدلالی انداز رکھتے ہیں ان کی 2010ء میں ''سخنورانِ پاکستان'' کے نام سے ایک کتاب قارئین شعر وادب سے داد وتحسین سمیٹ چکی ہے وہ راہِ ادب کے انتھک خادم ہیں۔ ان کے کام سے خلوص اور عمیق مشاہدات وتجربات کی جھلک ملتی ہے اس حوالے سے ان کی اہلیہ رابعہ خالد رانا کا ذکر نہ کرنا بھی ایک ادبی ناانصافی کے مصداق ہے تحقیق وتنقید کے اس دشوار گزار سفر میں انہوں نے ڈاکٹر محبوب عالم کا پورا پورا ساتھ دیا۔

کتابِ ھذا کے حصہ اول میں ایک درجن سے زائد شعرا کا نعتیہ کلام شامل ہے پیش لفظ

ڈاکٹر محبوب عالم کا لکھا ہوا ہے عرضِ معاون سے معنون رابعہ خالد رانا کی آرا اس کتاب کا حصہ ہیں یہ کتاب دراصل چار ابواب پر مشتمل ہے باب اول میں نعت نگاری کی تاریخ کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے حمد و نعت کا اسلامی ادب سے تعلق واضح کرنے کی ایک اچھی کاوش کی گئی ہے نعت نگاری کے حوالے سے تحقیق و تنقید کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے ڈیرہ غازی خان میں نعت نگاری اور تنقیدِ نعت کی روایت کو آغاز تا 2012ء پیش کیا گیا ہے نعت نگاری کے حوالے سے شاعرات کے کردار کو واضح کیا گیا ہے ادبی تنظیموں، جریدوں اور اخبارات کی اس سلسلے میں کی جانے والی کاوشوں کا بیان بھی شامل ہے۔

باب دوم میں ندیم ایزد کھوسہ کے نعتیہ تذکرہ ''ورفعنا لک ذکرک'' پر ایک بسیط صراحت کی گئی ہے مشمولہ شعرا کے نعتیہ کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے باب سوم میں وہ نعت گویانِ ڈیرہ غازی خان جن کے نعتیہ مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں کا تجزیہ شخصیت و فن کے تناظر میں کیا گیا ہے، باب چہارم میں ان شعرا پر روشنی پڑتی ہے جن کے نعتیہ مجموعے تادمِ تحریر شائع نہیں ہوئے اس کے بعد ایک نعتیہ شعری انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محبوب عالم کی اس کتاب کے ماخذات اور حوالہ جات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی تیاری میں کس قدر عرق ریزی سے کام لیا ہے تحقیق و تنقید سے انہماک رکھنے والوں کے لئے کتاب ھذا ایک مخزنِ شوق ہے مالک ارض و سما سے استدعا ہے کہ ان کے فکر و فن کو دولتِ دوام سے نوازے اور ان کی کاوش دنیا و عقبیٰ کے سفر میں زادِ راہ ٹھہرے۔ آمین

☆☆☆☆☆

نسیم سحر کے فکر مندانہ افکار

فکر مندی دراصل انسانی طبع کی عمیق حساسیت کی غمازی کرتی ہے جس سے افکار میں وسعت کے باب وا ہوتے ہیں تخیل کی اڑان ناحدِ نگاہ سے کہیں آگے بعید از قیاس ہوتی ہے جو سخنور اس وصفِ خاص سے متصف ہوتے ہیں ان کا کلام انتہائی وقیع اور گراں قدر ہوتا ہے جس میں رفعتِ تخیل کے شواہد بھی بھرپور انداز میں پائے جاتے ہیں شذرہ ھٰذا میں ہم نسیم سحر کی سخن سنجی کے حوالے سے قطر از ہیں جن کی شاعری کے باب میں گیارہ شعری کتب منصۂ شہود پر آ چکی ہیں جنہوں نے زیادہ تر غزل میں طبع آزمائی کی ہے علاوہ ازیں انہوں نے حمد و نعت بھی لکھی ہے اور ہائیکو کو بھی مشقِ سخن بنایا ہے 15 فروری 1944ء میں انہوں نے محمد نسیم ملک کے گھر راولپنڈی میں آنکھ کھولی بی اے تک رسمی تعلیم حاصل کی ادب کی مختلف اصناف میں کام کیا صحافت سے بھی ان کی دیرینہ وابستگی ہے پاکستان اور سعودی عرب سے نکلنے والے سہ ماہی جریدے ''سحاب'' کے مدیر بھی ہیں نسیم سحر کے گیارہویں شعری مجموعہ ''خواب سب سے الگ'' کے ربع اول کی غزلیات کے منتخب اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ ہیں۔

ان کی ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر لائقِ توجہ ہے

بے اماں اس نے میرا گھرانہ کیا اور میں چپ رہا
پھر ہوا نے سخن فاتحانہ کیا اور میں چپ رہا
غیر محفوظ مجھ پر ہوئیں شہر کی چار دیواریاں
آندھیوں نے مجھے بے ٹھکانہ کیا اور میں چپ رہا

مذکورہ بالا اشعار اپنے اندر صبر و تحمل کی عمیق داستان سموئے ہوئے ہیں سماج کی بیدادگری

کی پتا بھی ہوسکتی ہے اور مشیت سے شکوہ و شکایت کا پہلو بھی ہے افکار میں فکر مندی کے عوامل کے پہلو بہ پہلو مظاہرِ فطرت کی ستم کیشی کے شواہد بھی مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

ایک اور غزل کے چار اشعار در التفات پر دق الباب کر رہے ہیں۔

آنے والی نسلیں شاید اس پر غور کریں ہم نے
جلتے تلوؤں سے دیکھے انگاروں پر کیا لکھا ہے؟

اخباروں میں اپنی مرضی کی خبریں کیا دیتے ہو؟
یہ تو دیکھو شہر کی سب دیواروں پر کیا لکھا ہے ؟

نیند میں ڈوبے قافلے والے جان بھی سکتے تھے کیسے؟
شب خوں مارنے والوں کی تلواروں پر کیا لکھا ہے؟

کاش نسیم کسی دن میرا چہرہ دیکھ کے سوچے وہ
بہتے اشکوں نے جلتے رخساروں پر کیا لکھا ہے؟

نسیم سحر کے شعری مخزن میں دیروز و فردا کے ادراکات ایک خاص رنگ و آہنگ میں جلو سامانی کر رہے ہیں امروز بھی ان کے ہاں حالاتِ حاظرہ کے تناظر میں موجود ہے یوں ماضی و حال اور مستقبل سے باخبر نظر آتے ہیں ان کے فکری کینوس میں ایک زمانی تثلیث ہے جو ہر عہد سے ہمہ گیر اور ہمہ پہلو ہے عندالبیان ایک مکمل تاریخ کا منظر نامہ موجود ہے جس پر شکوہ و شکایت کا عنصر غالب نظر آتا ہے حالانکہ خوشگوار احساسات بھی قاری میں لطیف جذبات اجاگر کرنے پر قادر ہوتے ہیں جس سے رجائی امکانات جلوہ ریز ہوتے ہیں اور معاشرہ مثبت اثرات قبول کرتا ہے بہتر نظری و عملی نتائج برآمد ہوتے ہیں انہوں نے عصری آشوب زدگی کو شدومد سے پیش کیا ہے کرب ذات کے مظاہر بھی پوری شدت وحدت سے موجود ہیں۔

غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جن میں فکر مندی کا پہلو زیادہ نمایاں ہوا ہے۔

کسی کا جب کبھی پیمان ٹوٹ جاتا ہے
تو اس کے ساتھ وہ انسان ٹوٹ جاتا ہے
عجیب حلقۂ احباب ہے مقدر میں
قدم قدم پہ مرا مان ٹوٹ جاتا ہے

سماجی اقدار کی زبوں حالی درد کی آنچ کو شدید کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس سے وہ بالواسطہ طور پر مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں آموزگاری کا یہ غیر محسوس انداز ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرِ موصوف انسانی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتے ہیں عمرانی کج روی کو بھی انہوں نے موضوع بحث بنایا ہے جس سے عصری رویوں کی عمدہ غمازی ہوتی ہے جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ شاعرِ موصوف انسانی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتے ہیں اور یہ انکشاف حدِ تیقن کو پہنچتا ہے کہ بسیط حساسیت نے ان کے کلام کو فکری بالیدگی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ایک اور غزل کا مطلع اولیٰ اور مطلع ثانی شاملِ شذرہ ہے۔

جتنے ہیں میری ذات کے پیکر سمیٹ لوں
یہ کائنات اپنے ہی اندر سمیٹ لوں
بکھرے ہوئے یہ قیمتی گوہر سمیٹ لوں
پھینکے ہیں دوستوں نے جو پتھر سمیٹ لوں

وہ اپنی ذات کی وسعتوں سے آشنا ہیں اور اپنے کمالات کی جانکاری بخوبی رکھتے ہیں انہیں حیات و کائنات کی وسعتیں ایک بحرِ بیکراں کی مانند نظر آتی ہیں شعر کے مختصر پیمانے میں افکار کے پھیلاؤ کو فنی چابکدستی سے سمیٹنے کا فن جانتے ہیں جو ان کی کمالِ فن کاری کا مظہر ہے ناروا رویوں کی مذمت کا کوئی پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے یوں وہ منفی افکار و معاملات کی انسداد میں پیش پیش ہیں۔

سلسلہ ھذا کی آخری کڑی کے طور پر غزل کا مطلع اور ایک شعر پیشِ نظر ہے۔

یہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی، سچ بولتی ہے
جھوٹ کے دور میں بھی شاعری سچ بولتی ہے
تبصرہ شہر کے حالات پہ یہ ہے میرا
لفظ جھوٹے ہیں مگر خامشی سچ بولتی ہے

وہ اپنے غیر معمولی تخیلات کی پیشکش میں معمولی خیالات کو بھی بروئے کار لاتے ہیں پیرائیہ اظہار کے اعتبار سے ان کے ہاں ایک تنوع کا سماں ملتا ہے ان کا طرز اظہار قابلِ غور اور منطقی نوعیت کا حامل ہے وہ عام بات کو خاص انداز میں پیش کرنے کی بھی قدرت کرتے ہیں جس سے قاری کی توجہ کا حصول آسان تر ہو جاتا ہے اور بھر پور قسم کے تنقیدی زاویے بھی سامنے آتے ہیں۔

نسیم سحر کے کلام کے سیر حاصل مطالعہ کے بعد اس احساس کو تقویت ملتی ہے کہ وہ فنِ شعر پر دسترس رکھتے ہیں اور یہ اعزاز ان کے مسلسل ریاضِ شعر کا ثمر ہے ہر حساس آدمی کی طرح ان کے ہاں بھی فکر مندی کے عوامل بکثرت پائے جاتے ہیں مزید کاوشیں ان کے ہنر کو فزوں تر جلا بخشیں گی۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

نوید سروشؔ کا حسرت آمیز کلام

مشیتِ ایزدی نے کارزارِ کائنات کا انصرام وانتظام کے لئے پیکرِ خاکی کی آفرینش کو تلازمہ قرار دیا اور حضرتِ انسان میں اس حوالے سے کچھ خواص رکھ دیئے جو انسانی تگ و تاز اور جدوجہد کے روپ میں ہویدا ہوئے کیونکہ طبعِ انسانی کچھ ضروریات واحتیاجات' امنگوں اور خواہشوں سے عبارت ہے جن کے باعث انسان ہمہ وقت مصروفِ عمل نظر آتا ہے۔ان مقتضیات کی لاحاصلی لامحالہ طور پر حسرتوں کے وجود کو جواز بخشتی ہے۔ چنانچہ ہر سخنور میں اس نوع کے احساسات موجزن ہوتے ہیں۔ آج ہمارا موضوعِ بیان نوید سروشؔ کا کلامِ بلاغت نظام ہے جس میں حسرت آمیزی کے خصائص بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، جن کا اصل نام نوید الاسلام ہے اور ادبی حلقوں میں نوید سروشؔ کے نام سے معروف ہیں۔ سرکاری ذرائع کے مطابق 6/نومبر 1968ء میں فہیم الدین کے گھر میر پور خاص میں پیدائش ہوئی، ان کی والدہ محترمہ حمیدہ بیگم کے نام سے موسوم ہیں۔ انہوں نے اُردو ادبیات اور تاریخ اسلام میں پوسٹ گریجویٹ کیا۔ شاہ عبداللطیف گورنمنٹ کالج، میر پور خاص میں اسسٹنٹ پروفیسر (شعبۂ اُردو) کے منصب پر فائز ہیں۔ ادبی اعتبار سے معروف العصر اور اُستاذ الشعراء ماہر اجمیری صاحب کے حلقۂ تلمذ سے تعلق رکھتے ہیں۔ عرصۂ بسیار سے شعر وسخن کی سیوا میں مصروف ومنہمک ہیں اور ادبی حلقوں میں اپنی ایک واضح پہچان رکھتے ہیں۔ ملک کے معتبر اخبارات وجرائد اور شعری انتخابات میں اُن کا کلام تواتر سے چھپتا رہتا ہے۔ ادبی حوالے سے ملک گیر رابطوں کے حامل ہیں۔ مارچ 2014ء اُن کا اوّلین شعری مجموعہ ''ہم نشینی'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا جس میں بیشتر غزلیات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں حمد ونعت' پابند وآزاد نظمیات' قطعات ومتفرقات اور فردیات بھی مشمولات کا حصہ ہیں۔ کتابِ مذکورہ کے حوالے سے اربابِ نقد ونظر کی آراء حسبِ ذیل ہیں۔

نقدِ فن

معروف نقاد ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں:

''نوید سروش کی غزل میں رواں وقت نمودار ہوتا ہے۔ پھر ان کی تخلیقی ذات سامنے آتی ہے۔ ان کے اظہار و ابلاغ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ان کی تخلیقی شخصیت زمانے کو نئے تقاضوں کے مطابق تبدیل کرنے میں کوشاں نظر آتی ہے۔ شاید یہ سندھ کی درویش دھرتی کے اثرات ہیں جو غزل کی امیجری میں ظاہر ہوتے ہیں تو دل پر مستقل اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اکیسویں صدی کی غزل کا ایک روپ نوید سروش نئے رنگوں میں ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔ ان کے غرفۂ غزل سے جو کرنیں اُبھر رہی ہیں، وہ نئے احساس کی آئینہ دار ہیں۔ میرا تاثر یہ بھی ہے کہ نوید سروش جب غمِ زمانہ سے دوچار ہوں تو ان پر غزل اُترتی ہے لیکن جب اپنی ذات کی درزوں میں جھانکیں تو ان پر نظم نازل ہوتی ہے۔''

نامور شاعرہ شبنم شکیل کچھ یوں گویا ہیں:

''نوید نے نشاط و غم کے جذبوں کو اپنے اندر سمو کر کچھ ایسی تصویریں بنائی ہیں جو اس کی پہچان بن گئی ہیں۔''

ان کے مذکورہ شعری مجموعہ جو ان کی اوّلین کتابِ شعر ہے، کے نصف اوّل کی منتخب غزلیات کے اشعار منتخبہ موضوعاتی تناظر میں برائے استخراجات شاملِ شذرہ ہیں۔

ابتدائی غزلوں میں سے ایک غزل کے دو اشعار لائقِ التفات ہیں۔

آسماں تک اُڑان کی حسرت
جسم پر جب کہ بال و پر بھی نہیں
وہ مرا اعتبار ہی کرتا
اب میں اس درجہ معتبر بھی نہیں

نوید کا فکری کینوس بے پناہ اظہاری جسارتوں سے مملو ہے جن کے پہلو بہ پہلو حسرتوں کی دل خراش صدائے بازگشت بھی ہے جس میں غم کی آنچ انتہائی گہری ہے جو معرفت و مجاز کے حوالے سے عبارت ہے جس میں ایک شکتی کا آدرش بھی پنہاں ہے اور انقلابی اندازِ فکر بھی ہے۔

کون توڑے گا یہ سکوت سروش
آج بھی تم رہے اگر خاموش

اِن کے ہاں ایک دعوتِ تحرک، غور و خوض اور تفکر و تعقل کے خصائص پائے جاتے ہیں مگر کہیں کہیں بیم و رجا کی گومگوئی کیفیت بھی ہویدا ہوتی ہے جس سے ان کے کلام کی حسیاتی اور فلسفیانہ سطح بلند ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

عجیب ہوتے ہیں دل کے معاملے بھی سروشؔ
وہ مجھ کو پا نہ سکا جس کے میں اثر میں ہوں

سروشؔ کا سخن تنوع و تکون کے خصائص رکھتا ہے جس کی بدولت ان کی شعری رنگا رنگی اور بوقلمونی فزوں تر ہوئی ہے۔ ان کی غزل میں عصری رویوں کے شواہد بھی صاف و شفاف صورت میں مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں۔

غیروں کا کیا ہے اپنے بھی اپنے نہیں رہے
جب اوج پر ہمارا مقدر نہیں رہا

ان کا روایت سے رشتہ مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہے، اس لئے ان کے سخن سے کلاسیکی شعری رویے بھی آشکار ہوتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فنِ شاعری کا تاریخی و تہذیبی شعور رکھتے ہیں لیکن ان کا حزن ملال انہیں رہین یاس نہیں رہنے دیتا۔

بیٹھا ہوں تری راہ میں اب آس لگائے
شاید کہ کہیں سے تو چلا آئے کسی روز

نوید کے گنجِ شعر سے رجا کے چشمے پھوٹتے ہیں جو ان کا زندگی کرنے کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ ان کا کلام "ادب برائے زندگی" کے زمرے کا حامل ہے جس میں امیدوں اور تمناؤں کی چکا چوند قاری کو راغب کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جب سزائے غمِ ہستی سے گزر جاؤں گا
میں اجالوں کی طرح اور نکھر جاؤں گا
میں اکیلا ہی رہِ زیست میں ہوں محوِ سفر
ہم سفر کوئی ملے گا تو ٹھہر جاؤں گا

اِن کا سخن صرف کلبۂ حزن و ملال نہیں ہے۔ نہ صرف وہ مایوسیاں اور افسردگیاں بکھیرتے ہیں بلکہ خوشگوار اور لطیف احساسات کی مینا کاری بھی ملتی ہے۔ وہ غم کے تعمیری پہلوؤں سے

بخوبی آشنا نظر آتے ہیں مگر بسا اوقات ان کے ہاں حزن وطرب کا امتزاج انتہائی دیدنی ہوتا ہے۔

کبھی روتے روتے گزاری ہیں راتیں
کبھی رات بھر خود پہ ہنستا رہا ہوں

وہ صرف غم وملال سے شاکی وناالاں نظر نہیں آتے بلکہ مرزا غالبؔ کی طرف مصائب وآلام پر خندہ زن ہو کر تمسخر اُڑاتے ہیں جو ان کی مضبوط شخصیت کی بین دلیل ہے نیز وہ حزن کی افادیت واہمیت کے قائل بھی ہیں۔

اگر ملی نہ محبت میں ہجر کی منزل
یقین کون کرے گا ترے فسانے کا؟

سروشؔ کی فنی چابکدستی کی عمدہ تمثیل یہ ہے کہ وہ زیست کے پیچیدہ اسرار ورموز کو بہ آسانی بیان کر جاتے ہیں جو ان کی قدرتِ اظہار کی برہانِ قاطع ہے۔

کارِ جہاں میں آج بھی دشوار کچھ نہیں
لیکن رہِ حیات میں ہموار کچھ نہیں

اِن کی قوتِ متخیلہ نہ صرف زیست کے وسیع وعریض فلسفوں کو احاطۂ اظہار میں لاتی ہے بلکہ انہیں تخلیق کرنے پر بھی قادر نظر آتی ہے، اس لئے وہ حسرت وامید کا حسیں امتزاج قاری کے خوانِ شعور پر رکھ جاتے ہیں۔

اک عمر ہوئی کوئی پیغام نہیں آیا
اے کاش صبا لے کر کچھ اس کی خبر آئے

حسرتوں کی دلدوز فضا ان کے سخن کی توانائی و پذیرائی کو فزوں تر کرنے میں مصروف و منہمک ہے جس کے باعث ان کا زورِ بیان وسیع تر ہو رہا ہے۔ اِن کا لہجہ دھیما نہیں بلکہ شدتِ تاثر سے مالا مال ہے اور بلند بانگ نوعیت کا حامل ہے جس میں سے عصری رویوں کی دار ہیں ہم واژگونی وسنگینی بھی نمایاں ہوئی ہے۔

زمیں پہ رہنے کا حق جس نے مجھ سے چھین لیا
وہ کوئی غیر نہیں صرف میرا بھائی ہے

شجر اُداس کھڑا کس کا منتظر ہے بھلا
شجر کی اپنے پرندوں سے کیا لڑائی ہے

شاعرِ موصوف کا شعری مزاج اپنی معاشرت سے ایک خاص جڑت رکھتا ہے۔ وہ تنقیدی رویوں کی بدولت مکارمِ اخلاق کی آموزش میں محو نظر آتے ہیں اس لئے ان کے سخن کا عمرانی مطالعہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اِن کا حیران کن کمالِ فن یہ ہے کہ وہ مظاہرِ فطرت کو بروئے کار لا کر انسانی رویوں کی خوبصورت غمازی کرتے ہیں اور کچھ انقلابی نتائج سے بھی آگاہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شہرتوں کو زوال آئے گا
شخصیت میں کمال آئے گا
دوستوں کو مری وفاؤں کا
اک نہ اک دن خیال آئے گا

وہ مضبوط حواس کے مالک ہیں، اس لئے اِن کے ارادوں میں استحکام مضمر نظر آتا ہے کیوں کہ وہ وفاؤں کی پالنا پورے شوق و شغف سے کرنے کو لطفِ حیات گردانتے ہیں۔

نہ غم، نہ دل کو ملال دینا
نئی خوشی کا خیال دینا
جو ہو سکے تو اَنا کو اپنی
تم اپنے دل سے نکال دینا

اِن کے افکار مثالی اور آفاقی نوعیت کے ہیں، لایعنی اَنا کا تصور اِن سے گریز پا نظر آتا ہے، اس لئے وہ فضا میں خوشگواریاں اور لطافتیں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے درد و غم کے باعث ایک جذبۂ ہمدردی کی تخلیق میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔

تجھ سے ملنے کو میں جو آتا ہوں
میں بھی تیری طرح اکیلا ہوں
کاش ہوتا تجھے بھی یہ احساس
کس لئے روز تجھ سے ملتا ہوں

نوید سروش کے بسیط شعری کینوس کے غائرانہ مطالعہ و مشاہدہ سے یہ بات طمانیت خیز انداز میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ فکر و فن پر خاصی دستگاہ رکھنے والے سخن گستر ہیں جن کے موضوعاتی کینوس میں بے پناہ وسعت پائی جاتی ہے۔ ان کا کلام خود میں حسرت آمیز کیفیات و واردات رکھتا ہے جس سے ان کی حزینہ شعری طبع نمایاں ہوئی ہے۔ لسانی حوالے سے ایک تجربہ اور قادر الکلامی مترشح ہوتی ہے۔ اگر ان کا شعری ارتقا اسی سرعت سے جاری و ساری رہا تو نئی منزلوں کا سراغ لگانا ان سے کچھ بعید نہ ہوگا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر وقار مسعود کی مزاح نگاری

معاشرے کی خوشی کے لئے وجود پانے والے فنون لطیفہ میں سے ایک فن مزاح نگاری بھی ہے جو اداسی و سوگواری پریشانی اور فکرمندی جیسے عوارض کا ایک دلچسپ علاج ہے روتے لوگوں کو ہنسانا، بسورتے چہروں پر تازگی لانا ایک دلکش فن کا درجہ رکھتا ہے اور ایسی شگفتہ و شوخ تحریریں کاغذ پر منتقل کرنا یقیناً کسی کمال سے کم نہیں ہے۔

قدرت نے اردو کو کئی مزاح نگاروں سے نوازا ہے ان میں سے ایک نام ڈاکٹر وقار مسعود کا بھی ہے جو اپنے قلم کی فیاضیوں سے دامن فطرت میں گل کاریاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کی تحریر سے ایک گدگدی سی بطن سنجیدگی پہ ہوتی ہے موصوف نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 2001ء میں کیا ان کی کتاب ''دال میں کچھ کالا ہے'' میرے زیر نظر ہے اگرچہ یہ ان کی پہلی کتاب ہے لیکن معیار کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے ان کی تحریروں میں برجستگی، شستگی، بے ساختگی، نفاست و ذکاوت و ظرافت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

میں ہدایت خود فطرتاً سنجیدہ طبع کا حامل ہوں لیکن ان کی کتاب کے مطالعے کے دوران ان کے ہر مضمون نے میرے ہونٹوں پر تبسم کی لہریں بکھیر دیں طنز و مزاح کے ساتھ ان کے ہاں سنجیدگی کا بھی ایک غالب عنصر پایا جاتا ہے ان مضامین کے عنوانات حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے حقیقی زندگی کی ترجمانی کی ایک کامیاب کوشش کی ہے ان کے مضامین کی درجہ بندی کرنا قدرے مشکل کام ہے کیونکہ ہر مضمون اعلیٰ ادبی معیار کا حامل ہے اپنے مضمون ''پبلک ٹرانسپورٹ'' میں ڈرائیور کی تعریف و عکاسی کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔

''یہ کسی بھی گاڑی کا وہ ڈھیٹ مسافر ہوتا ہے جو صبح سے شام تک نہایت ڈھٹائی سے ایک ہی سیٹ پر قبضہ جمائے بیٹھا رہتا ہے اس کے فرائض میں نہ صرف لوگوں کی نازک کمروں کو جھٹکے لگوانا شامل ہے بلکہ وقفے وقفے سے شیشے سے پیچھے بیٹھے مرد وزن پر نگاہ ڈال کر اطمینان قلب حاصل کرنا بھی اس کا ایک فریضہ ہے۔''

موصوف کا ہر جملہ ہر پیراگراف اور ہر مضمون کے حوالے کے طور پر دیئے جانے کے قابل ہے لیکن خوف طوالت سے ایسا نہیں کیا جاسکتا۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مطالعے کے دوران قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے تمام خیالات زنجیر کے کڑوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف حقیقی زندگی کا عمیق مشاہدہ رکھتا ہے ادب برائے زندگی کا قائل ہے امور حیات کا گہرا شعور بھی ان کی سب سے بڑی اور نمایاں خوبی ہے ان کا سب سے عمدہ اور اعلیٰ وصف یہ بھی ہے کہ انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ جابجا ان کے ہاں فطری خیالات اور اسلوب کا ایک خاص رچاؤ ملتا ہے جو قاری کا دل موہ لیتا ہے رضی الدین رضی اپنے تاثرات میں حق بجانب ہیں کہ ان کی رواں دواں شگفتہ تحریریں پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

انہوں نے اپنی نگارشات کی بدولت معاشرے کی ناہمواریوں کو بے نقاب کیا ہے ان کی تحریریں صرف وقتی چسکے کی چیز نہیں بلکہ سبق آموز ہیں وہ معاشرے کے ایک سلجھے ہوئے نقاد کی طرح اپنا کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں قاری ان کی تحریروں سے نہ صرف مزاح کا حظ اٹھاتا ہے بلکہ اسے زندگی کا گہرا شعور بھی ملتا ہے اگرچہ ان کا ادبی سفر بہت کم ہے لیکن انہوں نے بہت ہی تھوڑے عرصے میں اپنے آدرش میں وسعت پیدا کی بڑے یقین اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آنے والا دور ڈاکٹر وقار مسعود کا ہوگا اور امید کی جاتی ہے کہ موصوف اپنے پورے جوش و جذبے کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں گے۔

☆☆☆☆☆

یعقوب خاورؔ کی نادرہ کاریاں

معروف شاعر یعقوب خاور کا مجموعۂ کلام ''حرفِ دلآرام'' مطبوعہ 2010ء اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے خوبصورت نام والی یہ کتاب بہت سے خوبصورت اشعار کی امین ہے کتاب ھذا میں شاعر نے ترتیبِ ابجد کے لحاظ سے اہتمامِ ردیف کیا ہے اور پھر اسے ردیف وار مرتب کیا ہے اگر پوری کتاب کا حاصلِ مطالعہ ہدیۂ قارئین کیا جائے تو طولِ بیان کا اہتمام لازم آتا ہے مشتے از خروارے کے بمصداق ہم یہاں کتاب کا سُدس اول زیرِ نگاہ لا رہے ہیں جو ردیف الف پر مشتمل ہے کل ستائیس غزلیں ردیف الف کے حوالے سے شاملِ کتاب کی گئی ہیں جن میں شاعر نے جدتِ بیان اور منفرد اسلوب کی نسبت سے خیال آفرینی کی ہے دورانِ مطالعہ کچھ اشعار نے دامنِ دل کھینچ لیا اور ان کی دلکشی نے ہمیں مجبورِ تبصرہ کر دیا کم و بیش ایک درجن منتخب اشعار ہم اردو ادب کے متوالوں کی نذر کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

امیرِ شہر کو خاورؔ نہ جانے کیا سوجھی؟
جو بے قصور تھے سب کو معاف کر ڈالا

ہر چند کے محالات میں سے ہے کہ امیرِ شہر تمام قصوروں کو معاف کر دے تاہم ایسا ہو گیا خدا جانے اس کا محرک کیا تھا اس شعر میں جہاں امیرِ شہر کی متلوّن مزاجی پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بات بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ صاحب نے بہت سے بے قصوروں کو قید کیا ہوا تھا بہر حال انت بھلے کا بھلا۔

ایک اور غزل کا شعر دیکھیے:

کبھی کہا نہ کسی سے وہ حرفِ دل آرا
جس ایک حرف نے مجھ کو کتاب کر ڈالا

ایک خوبصورت حرف ہماری دسترس میں تھا جو راز کا درجہ رکھتا تھا چنانچہ کبھی کسی سے بیان نہ کیا لیکن وہ حرف اندر ہی اندر یوں نمو پاتا رہا اس نے خود ہمیں ہی کتاب بنا ڈالا اور اب ہم ایک کھلی کتاب کی صورت اہلِ جہاں کے سامنے ہیں۔

اب ان کی ایک غزل کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے۔

ایک نگہ چھوڑ گئی مجھ کو دریدہ کر کے
اور اک حسنِ نظر نے مجھے تعمیر کیا

شعرِ ھذا میں سخنور نگاہوں کا فرق بیان کر رہا ہے جن سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوا ایک نظر تو وہ تھی جو دل و جاں کو چاک کر گئی اور دوسری نگاہ وہ نگاہِ مشفقانہ جس نے تعمیرِ ذات کے تقاضے پورے کر دیئے گویا شاعر اس نظر کا بھی شکار ہوا جو ستم گرِ جاں ہے اور اس نگاہ سے بھی ہمکنار ہوا جو کرم گستر ہے پہلی نظر شگافِ ذات کا باعث بنی جب کہ دوسری نگاہِ حیات ساز ثابت ہوئی۔

یعقوب خاورؔ کا ایک اور دلکش شعر درد دل کھنکھنا رہا ہے۔

زمینِ شعر کا وارث ہے کاشتکارِ خیال
یہ فیصلہ مری تحریر سے طلوع ہوا

شاعر اپنے آپ کو کاشتکارِ خیال ثابت ٹھہرا رہا ہے اور یوں زمینِ شعر پر اپنی وراثت ثابت کر رہا ہے اور ساتھ ہی اس پر مہرِ ثبوت بھی ثبت کر رہا ہے کہ یہ سب کچھ ہنگامی طور پر نہیں ہوا بلکہ قدرت نے ابتدا سے ہی اس کا اہل ٹھہرا دیا تھا کہ رفعتِ خیال اور موزونیٔ طبع کو بروئے کار لاتے ہوئے زمینِ ادب میں دلنشیں اشعار کاشت کروں۔

خاورؔ جی کا یہ مقطع بھی بڑا عجیب ہے

حضورِ حسن حالِ دل بیان کب ہو سکا خاورؔ؟
خموشی کا محل تھا اور سنانا بھی ضروری تھا

ہم اپنے محبوب کے حضور دل کا حال بیان نہیں کر سکے ہر چند خاموشی تھی لیکن ہو سکتا ہے

جبری خاموشی ہو اور بقول اقبال "دستور زباں بندی" ٹھہرا ہو حالانکہ حال دل سنانا بھی ضروری تھا مگر ایسا کچھ نہیں ہو سکا عالم جبر ہمیشہ عشاق پر روا رہا ہے ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا مشہور شعر ہے۔

دل مصر ہے چیخئے اور وہ مصر ہیں چپ رہو
اے خدا کس امتحاں میں آج ہم ڈالے گئے؟

یا یہ مشہور شعر

اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے
مجبور ہیں اف اللہ کچھ کہ بھی نہیں سکتے

ایک اور شعر موصوف کا سماعت ہو۔

بے توازن رہا یوں عمر کا منظر نامہ
زیست سرعت سے ہوئی شوق فراغت سے ہوا

خدا معلوم شاعر کیا کہنا چاہتا ہے جہاں تک ہم سمجھ پا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی ہمیشہ بے توازن سی رہی کبھی ادھر جھکا ہو گیا کبھی ادھر جھکا ہو گیا ہماری حیات بڑی تیزی سے گزرتی چلی گئی اور جتنی تیزی سے زندگی گزری شوق بھی اسی قدر وافر ہوتا چلا گیا مگر اپنا حال یہ رہا کہ باایں ہمہ فارغ رہنے کا فرصت سے وقت گزارنے کا شوق بڑھتا چلا گیا گویا ہم نے دو متضاد راہوں پر قدم رکھ لیئے۔

اسی نوعیت کا ایک اور شعر دعوت تبصرہ دے رہا ہے۔

میں خاک زاد ابھی تک زمیں پہ رہتا ہوں
فلک نشیں کبھی موقع ملے تو آ جانا

صنعتِ تضاد کا حامل یہ شعر اپنے عجز اور محبوب کے افتخار کا مذکور ہے مصرع اول کی ساخت و پرداخت شاعر کے جذبۂ وفا کی غمازی کر رہی ہے کہ میں نے مٹی سے اپنا ناطہ نہیں توڑا اے میرے محبوب اگر تجھے موقع ملے یا طبیعت چاہے تو کچھ دیر آسمان سے میرے پاس زمین تک آ جانا چونکہ میں تو آسمان پر پہنچنے سے رہا۔

ندرتِ بیان کا حامل ایک اور شعر زیرِ نظر لاتے ہیں۔

گواہ رہنا ستم گر کہ تیرے عہد میں ہم
یہ جان ہار گئے حوصلہ نہیں ہارا

ہمت و مردانگی کا حامل یہ شعر بے حد حوصلہ افزا ہے۔ شاعر خود اپنے محبوب ستمگر کو شاہد ٹھہرا رہا ہے کہ جملہ اسباب جبر و جور کے باعث ہم جان تو ہار گئے کیونکہ یہ ہمارے بس میں نہیں تھی لیکن تادمِ آخر ہم نے ہمت نہیں ہاری ہم مایوس نہیں ہوئے مبتلائے بیم نہیں ہوئے۔

جناب خاورؔ کا یہ شعر بھی نرالا پن خود میں سموئے ہوئے ہے۔

ہم اہلِ دل کا مقدر بھی خوب ہے خاورؔ
کہ جس کو چاہیں وہی عمر بھر نہیں ملتا

انوکھے انداز میں اپنی نیرنگیٔ قسمت کا گلہ کر رہے ہیں حالانکہ معاملہ کھٹائی کا ہے کیونکہ ہم جسے چاہتے ہیں ہماری چاہت کے علی الرغم وہ ساری زندگی ہمیں مل نہیں پاتا کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

محبت رنگ دے جاتی ہے دل جب دل سے ملتا ہے
مگر مشکل بڑی یہ ہے کہ دل مشکل سے ملتا ہے

یا یہ شعر دیکھئے

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا

شاعر مذکور کا یہ شعر بھی دامن دل کھینچ رہا ہے

کھلا ہوا ہے درِ دل کسی کی چاہت میں
نہ وہ ملا نہ کوئی دوسرا پسند کیا

سہلِ ممتنع ہے ایک سادہ سے خیال کو خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے محبت میں قصرِ دل کا دروازہ کھلا رکھا ہے امکان یہی تھا کہ وہ دلبرِ ہوش ربا آئے گا مگر وائے افسوس وہ نہیں آیا ادھر المیہ یہ ہے کہ ہم کسی اور کو بھی پسند کرنے سے قاصر رہے ورنہ آسامی خالی نہ رہتی اور خلا پر کر دیا جاتا۔

اہلِ دل نے دل کی تکرار کا حامل ایک شعر لکھا ہے جو دل کو چھو رہا ہے لیجئے آپ بھی محفوظ ہوئیے۔

مستقل رکھتا ہے کیفیتِ دل پر بھی نگاہ
دل کسی اور پر دلبر نہیں جانے دیتا

یعنی ہمارا محبوب ہی بہت ہوشیار ہے ہر بات پر اسی کی نگاہ ہے خصوصاً دل کی حالت پر تو وہ گہری نظر رکھتا ہے جب سمجھتا ہے کہ دل کھٹا ہو رہا ہے تو تھوڑی سی خلوص کی شیرینی شاملِ ادا کر لیتا ہے دل عاشق پھر محبوب خوش ادا سے جڑ جاتا ہے اور پھر اسی شدومد سے وظیفۂ الفت ادا کرنے لگتا ہے گویا وہ ستاتا بھی ہے اور پھر مجبور ہوتے دیکھ کر کرم فرمائیاں بھی کرنے لگتا ہے تاکہ دلِ وحشی کسی اور طرف راغب نہ ہو۔

ان کا یہ شعر بھی ذرا نوٹ کیجئے۔

جیسے میں جھنجھلا کے جاتا تھا سمندر کی طرف
کوئی بادل سا مرے گھر کی طرف آنے لگا

شاعر نے کسی کے آنے کو اپنے جانے سے مشابہ کرتے ہوئے عجیب بات کی ہے کہ جس طرح تنہائی اور گرمی کی شدت سے گھبرا کر جھنجھلاتے ہوئے صحرا کی راہ لیتا تھا آج کوئی بادل اسی ادا سے میرے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آج کوئی میری جستجو میں بھی ہے وقت نے کیا خوب پلٹا کھایا کہ طالب کو مطلوب بنا دیا اور شارب کو مشروب بنا دیا۔

مندرجہ بالا اشعار کے استشہاد سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے کہ یعقوب خاورؔ ایک صاحب طرز شاعر ہے ان کی نگارشات میں ندرت کا رنگ چوکھا پایا جاتا ہے ان کے اشعار دفعتاً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور قاری کو سرسری گزر جانے کی اجازت نہیں دیتے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی جہانِ استعجاب پڑھنے والے کو ورطۂ حیرت میں گم کر دینے کے لیئے ضروری موجود ہوتا ہے جیسے ایک تیر اک اچانک گرداب کی زد میں آجاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

شبیر ناقدؔ کے سوانحی وفنی کوائف پر طائرانہ نظر

شاعر علی شاعرؔ (کراچی)

اصل نام غلام شبیر اور ادبی نام شبیر ناقدؔ ہے یکم فروری 1976ء کو جنوبی پنجاب کے مردم خیز خطے ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل تونسہ شریف کے گاؤں ہیرو شرقی میں پیدائش ہوئی عہدِ طفولیت میں ہی فطری طور پر طبیعت لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوئی گویا علم وادب کا ذوق مشیت سے ودیعت ہوا عام بچوں کی طرح کھیل کود کے مشاغل میں ان کی دلچسپی انتہائی کم رہی لیل ونہار کا بیشتر حصہ حصولِ علم میں صرف ہوا میٹرک کا امتحان 1992ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول ہیرو شرقی سے امتیازی نمبروں میں پاس کیا 1994ء میں گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ تونسہ شریف سے ڈی کام کیا زمانہ طالب علمی میں اپنے اساتذہ کے منظورِ نظر رہے شاعری کا باضابطہ آغاز تو نویں جماعت سے ہی ہوگیا تھا اولاً انگریزی، اردو، سرائیکی اور پنجابی زبان میں طبع آزمائی کی۔ Beauty، ٹیپو سلطان اور حریت اس دور کی معرکتہ الآراء نظمیں ہیں لیکن سخن سازی کا باضابطہ آغاز 1996ء میں کیا اور ادبی فیض استاذ الشعرا ابو البیان ظہور احمد فاتح سے پایا شبیر ناقدؔ کا شمار پروفیسر ظہور احمد فاتح کے ان تلامذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے آموزگار ادب سے سب سے زیادہ اکتساب فیض کیا ہے اس لیے انہیں ممتاز ومنفرد مقام حاصل ہے ان کی بسیار گوئی بھی اپنے استادِ محترم سے کچھ نہ کچھ حد تک مماثلت رکھتی ہے ان کی پُر گوئی کا یہ عالم ہے کہ ان کے ابھی تک تین مجموعہ ہائے کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں لیکن ان کے غیر مطبوعہ کلام سے ایک درجن شعری مجموعے با آسانی ترتیب پا سکتے ہیں زبان و ادب کی خدمت کو احساس سود وزیاں سے بالاتر ہو کر روح کی ریاضت گردانتے ہیں اس لیے

بلا امتیاز شام و سحر گلشن شعر و ادب کی آبیاری میں منہمک رہتے ہیں ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے ان کے معمولات ادبی خدمات سے عبارت ہیں ادبی اعتبار سے ملک گیر رابطوں کے حامل ہیں اگر کوئی تلمیذ ادب راہ نمائی کا خواستار ہو تو بصد خلوص اس کی حاجت کشائی کرتے ہیں ان کے شب و روز ان کی ادب سے وابستگی کے جنون کی حد تک غماز ہیں گویا شبیر ناقد راہِ ادب کے ان تھک راہی ہیں جو خلوص اور ریاضت پر یقین رکھتے ہیں اس سلسلے میں وہ اپنے آرام اور صحت کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

جولائی 1999ء میں انہوں نے پاک آرمی میں شمولیت اختیار کی تادمِ تحریر خدمات سر انجام دے رہے ہیں ان کی شخصیت کی متنوع خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ صاحبِ سیف بھی ہیں اور اہلِ قلم بھی۔ یہ اعجاز و افتخار شاذ ہی کسی کے حصے میں آتا ہے 2001ء کو بی اے کا امتحان بہاوالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے نجی طور پر پاس کیا 2003ء کو جامعہ ھذا سے اردو ادبیات میں ایم اے کیا اور 2007ء کو مذکورہ یونیورسٹی سے پنجابی ادبیات میں ایم اے کیا۔

دسمبر 2007ء میں ان کا اولین شعری مجموعہ ''صلیبِ شعور'' جو غزلیات و نظمیات پر مشتمل تھا منصۂ شہود پر آیا کتابِ ھذا کا وصفِ خاص یہ ہے کہ اس میں اردو ادب کی طویل ترین غزل جسے ''غزلنامہ'' سے موسوم کیا گیا ہے بھی شامل ہے لفظ ''غزلنامہ'' بھی ان کی ذاتی اختراع ہے۔ یہ غزل ایک سو انتیس اشعار پر مشتمل ہے جس میں قوافی کا تکراری پہلو معدوم ہے اور فکری اعتبار سے کثیر الموضوعات بھی ہے حیات و کائنات سے متعلق اکثر و بیشتر موضوعات اس میں شامل ہیں اپریل 2010ء میں ان کا سرائیکی مجموعۂ کلام ''من دی مسجد'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا جس میں غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات اور دوہڑے شامل تھے اپریل 2011ء میں ان کا دوسرا اردو مجموعۂ کلام اور مجموعی طور تیسری کتاب ''آہنگِ خاطر'' منظرِ عام پر آئی جس میں نظم کی بیشتر ہیئتوں اور غزلوں پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ نظم کے پہلو بہ پہلو نثر میں بھی ریاضت تواتر سے جاری و ساری ہے ان کی شعری و نثری تخلیقات ملک بھر کے ادبی جرائد اور اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ تصنیفی اعتبار سے شبیر ناقد کے لیے 2013ء کا سال بھرپور ثابت ہوا جس میں ان کی چار تنقیدی نوعیت کی تصانیف منصۂ شہود پر آئیں کتابِ ھذا کی

طباعت کے عمل کا آغاز بھی 2013ء کے اواخر میں ہوا جون 2013ء میں نثری اور تنقیدی نوعیت کی تصنیف ''ابو البیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل'' سے موسوم زیورِ طباعت سے ہم آغوش ہوئی جس میں انہوں نے اپنے استادِ گرامی پروفیسر ظہور احمد فاتح کی شخصیت اور ان کے دس شعری مجموعوں کی مشمولہ غزلیات کا انتہائی منطقی اور استدلالی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے جس میں ان کے نقد فن کا جوہر کھل کر سامنے آیا ہے اور تخلیقیت کی سطح بھی اجاگر ہوئی ہے جون 2013ء میں ہی ''شاعرات ارض پاک'' حصہ اول سے معنون تنقیدی مضامین و منتخب کلام مجموعہ شائع ہوا جس میں دو درجن شاعرات کے حوالے سے تنقیدی شذرات شامل ہیں جس میں نقادِ عصر شبیر ناقد نے اپنی تنقیدات کے جوہر دکھائے ہیں اکتوبر 2013ء میں شاعرات ارض پاک کے تاریخی ادبی سلسلے کی دوسری کڑی کے طور پر شاعرات ارض پاک حصہ دوم منظر عام پر آئی جبکہ نومبر 2013ء میں مذکورہ سلسلہ کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ان کی من حیث المجموع تصانیف کو علمی و ادبی حلقوں میں نگاہِ استحسان سے دیکھا جاتا ہے انہیں بہت ہی قلیل عرصے میں بے پناہ مقبولیت و پذیرائی میسر آئی جو ان کی شبانہ روز محنت شاقہ کا ثمر ہے نیٹ کے قارئین ''اردو سخن ڈاٹ کام'' پر ان کی تصانیف سے استفادہ اور اکتساب فیض کر سکتے ہیں۔

آج کل شبیر ناقد پاکستان کی شاعرات پر تنقیدی و تحقیقی نوعیت کا کام کر رہے ہیں اس سلسلے میں ''شاعرات عرض پاک'' کے تین ایڈیشن چھپ کر قارئین شعر و ادب سے خراج تحسین کی دولت سمیٹ چکے ہیں ان کے مضامین میں تحقیق کی نسبت تنقید کا عنصر غالب رہتا ہے گویا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ شبیر ناقد اسم با مسمّٰی ہیں وہ ایک روکھے پھیکے ناقد نہیں بلکہ فطری نقاد ہیں مشیت نے انہیں طبیعت ہی تنقیدی نوعیت کی ودیعت کی ہے حتیٰ کہ ان کے کلام اور گفتگو میں بھی ناقدانہ افکار وفور سے ملتے ہیں کتاب ھذا پچاس سے زائد تنقیدی شذرات کا مخزن ہے جس میں ادب کی مختلف اصناف سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی تصانیف کے حوالے سے معروضی، منطقی اور استدلالی انداز میں خامہ فرسائی کی گئی ہے جسے شبیر ناقد کی مخصوص ناقدانہ حاشیہ آرائی نے چار چاند لگا دیئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد قارئین اور ارباب دانش مصنف موصوف کی عرق ریزی کا اندازہ بہ خوبی لگا پائیں گے انہوں نے اپنے ہر شذرے کے

آغاز میں کسی فنی یا سماجی مسئلے کو موضوعِ بحث بنایا ہے جس سے ان کی فکر وفن سے فطری وابستگی کی عکاسی ہوتی ہے فطری اعتبار سے وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں لیکن ادب برائے ادب کی شمعیں بھی فروزاں نظر آتی ہیں ان کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ تخلیق کار اپنی تخلیقات میں روح عصر کی بھرپور غمازی کریں سماجی مسائل اور عمرانی خباثت کا مداوا تلاش کریں جو ایک حقیقی تخلیق کار کا اولین فرضِ منصبی ہے اور وہ اس سے عہدہ برا بھی ہوسکتا ہے ان کی تنقیدی حوالے سے درج ذیل کتب زیرِ طبع ہیں:

۱۔ شاعرات ارض پاک (حصہ چہارم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام
۲۔ شاعرات ارض پاک (جامع ایڈیشن حصہ اول)
100 شاعرات کے حوالے سے شذرات اور منتخب کلام
۳۔ میزانِ تنقید (تنقیدی مضامین)
۴۔ تجزیات (تنقیدی مضامین)
۵۔ توضیحات (تنقیدی مضامین)
۶۔ زاویے (تنقیدی مضامین)
۷۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منثور نظم (نظمیاتی تجزیہ)
۸۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح فکر وفن کے آئینے میں (غزلیات ومنظومات کا تجزیہ)
۹۔ تنقیدات (تنقیدی مضامین)

علاوہ ازیں بچوں کے لیے شاعری بھی کرتے ہیں ان کا کلام ملک بھر کے بچوں کے جرائد کی زینت بھی بنتا رہتا ہے شبیر ناقد نے بہت ہی کم عرصے میں اپنے آورش میں بے پناہ وسعت پیدا کی ہے تخلیق وتنقید دونوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے طبعاً سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں مگر بے تکلفی انہیں بہت مرغوب ہے۔ انہیں یہ اعزاز وافتخار حاصل ہے کہ اُن کی حیات پُرسعی علمی وادبی اور عسکری خدمات میں صرف ہو رہی ہے۔

الغرض شبیر ناقد راہِ ادب کے ایک اَن تھک مسافر ہیں جو خلوص، محبت اور لگن کے اصول ثلاثہ پر یقین رکھتے ہیں ریاضت جس کا کلیدی تلازمہ ہے رب ادب سے استدعا ہے کہ اُن کے فکر وفن کو دولتِ دوام سے نوازے۔ آمین

شبیر ناقد کی دیگر تصانیف

شاعری

۱۔ صلیبِ شعور (غزلیات و نظمیات)

۲۔ من دی مسجد (سرائیکی شاعری)
(غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات، دوہڑے، سرائیکو)

۳۔ آہنگِ خاطر (غزلیات، نظمیات، گیت، قطعات، ہائیکو)

۴۔ جادۂ فکر (غزلیات و نظمیات) زیرِ طبع

۵۔ صبحِ کاوش (غزلیات و نظمیات) زیرِ طبع

۶۔ دل سے دور نہیں ہو تم (غزلیات و نظمیات) زیرِ طبع

۷۔ کتابِ وفا (غزلیات و نظمیات) زیرِ طبع

۸۔ روح دی روہی (سرائیکی شاعری)
(غزلیں، نظمیں، قطعے، دوہڑے) سرائیکو زیرِ طبع

تنقید

۱۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل
(سوانحی و فنی مطالعہ اور غزل کا انتقادی جائزہ)

۲۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ اول) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۳۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ دوم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۴۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۵۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) زیرِ طبع

۶۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ پنجم) زیرِ طبع

۷۔ شاعراتِ ارضِ پاک (جامع ایڈیشن، حصہ اول) زیرِ طبع

100 شاعرات کے حوالے سے شذرات و منتخب کلام

۸۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منثور نظم
(ظہور احمد فاتح کی نظم کا تنقیدی جائزہ) زیرِ طبع

۹۔ میزان تنقید (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۱۰۔ تنقیدات (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۱۱۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح فکر و فن کے آئینے میں زیرِ طبع
(غزلیات و منظومات کا تجزیہ)

۱۲۔ توضیحات (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۱۳۔ زاویے (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۱۴۔ تجزیات (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

☆☆☆☆☆

maablib.org

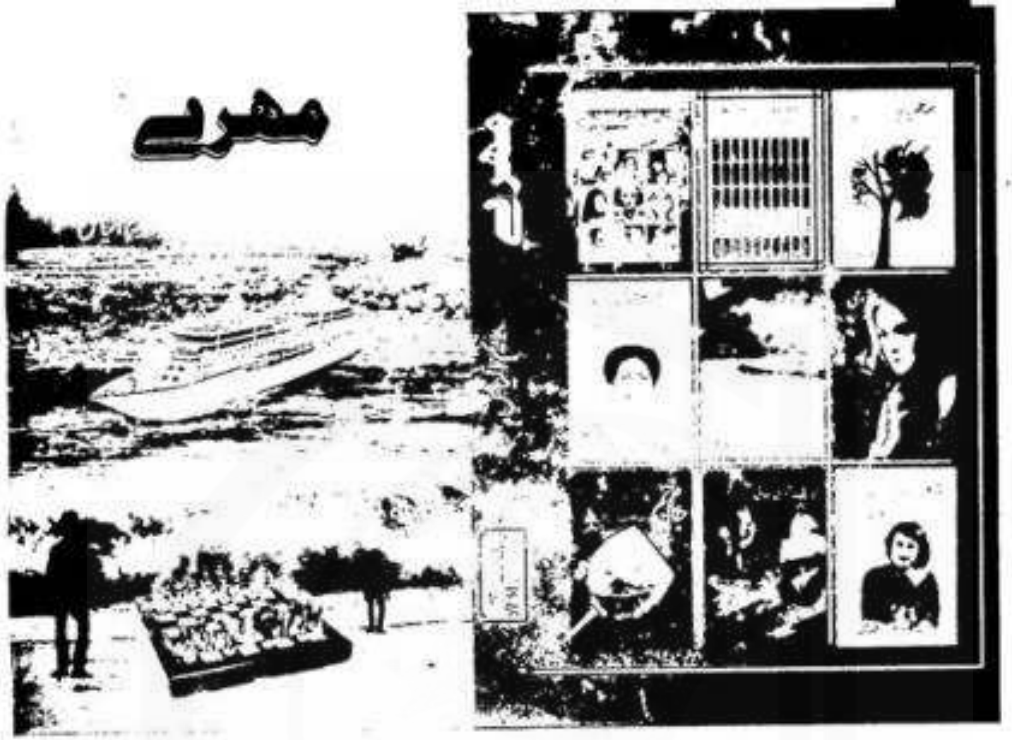
مہرے

رقص مے

جدید افسانے

مذہب عشق

محمد حسن عسکری

آہنگ